اسلام
ایک زندہ حقیقت
اسلامک بک پبلشرز

اسلام

ایک زندہ حقیقت

مؤلّف

ڈاکٹر حمودہ عبد العاطی

مترجم

رضا بدخشانی

اسلامک بُک پبلشرز

۱۴/۲ ۔ فضل الٰہی مارکیٹ ۔ اُردو بازار ۔ لاہور ۔ پاکستان

اوّل ایڈیشن ـــــــ ایک ہزار
ناشر ـــــــ کرامت اللہ شیخ
کتابت ـــــــ عقیل احمد
مطبع ـــــــ نعیم پرنٹنگ پریس، فیروز پور روڈ، لاہور

اِسلامک بُک پبلشرز

۱۴/۲ فضل الٰہی مارکیٹ ۔ اُردو بازار ۔ لاہور

کچھ مصنّف کے بارے میں!

ڈاکٹر حمودہ عبدالعاطی مرحوم الازہر یونیورسٹی مصر سے فارغ التحصیل تھے۔ آپ نے میکگل یونیورسٹی سے علومِ اسلامیہ میں ایم اے اور پرنسٹن یونیورسٹی سے عمرانیات میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۵۸ء میں شعبۂ ثقافتِ اسلامیہ الازہر سے منسلک ہوئے۔ ۱۹۶۰ء میں کینیڈین اسلامک سنٹر آف ایڈمنٹن (البارٹا) کے پہلے کُل وقتی ڈائریکٹر تعینات ہوئے۔ ۱۹۶۷ء میں عبدالعاطی نے پوٹیکا کالج آف سائراکس یونیورسٹی میں سوشیالوجی کے ایسوسی ایٹ پروفیسر کا منصب سنبھالا اور ستمبر ۱۹۷۶ء میں اپنی وفات تک اسی عہدے پر خدمات سرانجام دیتے رہے۔

ڈاکٹر عبدالعاطی شمالی امریکہ کے مسلمانوں اور دوسرے انٹرکلچرل گروپس اور اُن کے حلقوں سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے۔ آپ نے کئی سال اسلام کے موضوع پر لیکچر دیے، اسلامی کنونشنوں میں شرکت کی، عربی اور انگریزی میں مقالات لکھے اور سوالات کے شافی جواب دیے۔ آپ ایک متبحر عالم تھے اور اسلام اور اسلامی ثقافت کے بہت سے طالبانِ علم اپنی تشفی کے لیے آپ سے رجوع کرتے تھے۔

ڈاکٹر عبدالعاطی 'اسلام ان فوکس' (ISLAM IN FOCUS) کے علاوہ امریکن ٹرسٹ پبلیکیشنز کی شائع کردہ کتب 'اسلام میں خاندان کی تشکیل' (THE FAMILY STRUCTURE IN ISLAM) اور 'مطالعہ عمرانیات تاریخ و ثقافت کی روشنی میں' (EXPLORATIONS IN HISTORICULTURAL SOCIOLOGY) کے مصنّف بھی ہیں۔

عرضِ مُترجم

خاکسار کے لیے "اسلام ان فوکس" (ISLAM IN FOCUS) کے ترجمے کی ذمہ داری قبول کرنا ایک گُونہ مسرت کا باعث ہونے کے علاوہ ایک چیلنج کا درجہ بھی رکھتا تھا۔ ہر زبان کا اپنا ایک منفرد مزاج ہوتا ہے اور جو خیال ابتداءً یا بے ساختہ طور پر کسی ایک زبان میں وارد ہوا ہے تمام پہلوؤں کے ساتھ ہو بہو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا آسان نہیں ہوتا اور جب موضوع کی اہمیت اور نزاکت ایک خاص احتیاط اور مہارت کی مقتضی ہو تو ترجمہ کرتے وقت نفسِ مضمون سے انصاف کرنا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس عظیم اور اہم کام کے دوران ایک غیر مرئی طاقت برابر میری ہمت، حوصلے اور اعتماد میں اضافہ کرتی رہی۔ بے شک یہ اللہ تعالیٰ کی مدد تھی جو میرے شاملِ حال رہی اور جس کی وجہ سے یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

ترجمے کے دوران خاکسار کی ہر ممکن یہ کوشش رہی ہے کہ نہ صرف فاضل مصنف کے نقطۂ نظر کی ممکنہ حد تک صحیح ترجمانی ہو بلکہ اُن کا شگفتہ پیرایۂ بیان، زندہ اسلوب اور آسان و سادہ طرزِ استدلال بھی اُردو زبان میں بدستور قائم رہے۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ کتاب میں جا بجا قرآنِ حکیم کی آیاتِ کریمہ کا جو ترجمہ دیا گیا ہے وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے "ترجمۂ قرآن مجید" شائع کردہ "ادارہ ترجمان القرآن لاہور" سے من و عن نقل کیا گیا ہے جسے فی زمانہ قریباً تمام مسلم حلقوں میں قرآنِ مجید کا بامحاورہ اور معیاری ترجمہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

بعض مقامات پر راقم الحروف نے * کا نشان دے کر فٹ نوٹ میں اپنی طرف سے کچھ حواشی تحریر کیے ہیں جس کا مقصد پاکستان کے مخصوص حالات کے پس منظر میں کسی نکتے

کی مزید وضاحت کرنا، قارئین کو الجھاؤ سے بچانا یا کسی ممکنہ غلط فہمی کا ازالہ کرنا ہے۔

خاکسار اپنی ذمہ داری نباہنے میں کس حد تک کامیاب رہا اس کا فیصلہ قارئین کے ہاتھ میں ہے۔ وَمَا توفیقی اِلّا بِاللّٰہ۔

رضا بدخشانی

انتساب

(منظوم ترجمہ: رضا بدخشانی)

○
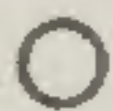
یا رب! مرے لیے ہے تشکّر کا یہ مقام
اس کارِ خیر کا ہوا بالخیر اختتام

○

ادیانِ دہر میں فقط اسلام ہے وہ دین
نوعِ بشر کو جس کی ضرورت رہی مدام

○
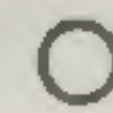
ہوتی اگر نہ تیری اعانت مجھے نصیب
رہتا کتابِ شوق کا ہر باب ناتمام

○
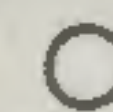
شامل ہے اس میں تیری محبت کی چاشنی
ورنہ میں کیا ہوں اور بھلا کیا مرا کلام

○
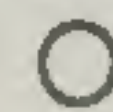
ربِ کریم تو اسے حُسنِ قبول بخش
یہ کاوشِ حقیر مُعَنْوَن ہے تیرے نام

حمودہ عبد العاطی

فہرست مضامین

باب سوم

روزہ (صوم)

زکوٰۃ

حج

باب چہارم

باب پنجم

ضمیمہ اوّل

ضمیمہ دوم

ضمیمہ سوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

اس تصنیف کا مقصد ایک اوسط درجے کے قاری کو اسلام کی بنیادی تعلیمات سے محض متعارف کرانا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی کتاب میں اسلام کی وسعت اور گہرائی پیش کرنے کی گنجائش نہیں ہوگی اور نہ یہ ہمارا ارادہ ہے۔ تاہم مقصود یہ ہے کہ ایک عام پڑھا لکھا شخص اس کے مطالعہ سے موضوع کے بارے میں صحیح بصیرت حاصل کر سکے اور دینِ اسلام کے بنیادی اصولوں کو سمجھنے کے قابل ہو سکے۔ جب موضوع سے اُس کی ابتدائی دلچسپی قائم ہو جائے گی تو وہ اپنے طور پر علم کی گہرائی میں اُترنے کے لیے جد و جہد کر سکے گا۔

مغربی نصف کرۂ ارض کے مسلمان خصوصاً ان میں سے وہ نوجوان جو دُور دراز علاقوں میں مقیم ہیں، پیچیدہ نوعیت کے مسائل سے دوچار ہیں۔ اُن کے اردگرد کے حالات اسلام سے موافقت نہیں رکھتے۔ ریڈیو پر نشر ہونے والے تبصرے، ٹیلی ویژن پر دکھائے جانیوالے پروگرام، خبریں، جرائد و رسائل میں شائع ہونے والے مضامین، متحرک تصویریں حتّٰی کہ سکولوں کی درسی کتابیں وغیرہ یہ سب ذرائع اسلام کو غلط انداز میں پیش کرتے ہیں اور وہ ایسا کرنے میں ہمیشہ بے قصور بھی نہیں ہوتے۔ علاوہ ازیں بہت سے پُرجوش حلقے ان مسلمانوں کی حالت سے غلط فائدہ اُٹھانے کی تاک میں رہتے ہیں اس امید میں کہ وہ اسلام ترک کر کے کوئی دوسرا مذہب یا فرقہ اختیار کر لیں گے۔ دوسری طرف ان مسلمانوں کی توجہ اور دلچسپی کو دین کے سیدھے

راستے سے ہٹانے کے لئے ترغیب و تحریص کے بہت سے سامان موجود ہیں ۔ یہ بات نوجوان مسلمانوں کیلئے اور خاص طور پر دینِ اسلام کے لیے بہت ہی نقصان دہ ہے کیونکہ دنیا کے اس حصے میں اسلام کو صحیح طور سے سمجھا نہیں گیا ۔ یہ درست ہے کہ بعض مسلمان والدین اپنے بچوں کو دینی رہنمائی اور ہدایت مہیا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ لیکن ان محدود سی کوششوں سے بھلا کیا ہوتا ہے اور یہ ایسے ماحول میں کیونکر کامیاب ہو سکتی ہیں جو مذہب دشمن قوتوں کی یلغار کی زد میں ہو ۔

پھر ہوتا کیا ہے ؟ اس مشکل صورتِ حال کا نتیجہ کیا نکلتا ہے ؟ پوری دیانت داری سے تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ صورتِ حال تاریک دکھائی دیتی ہے لیکن مایوس کُن نہیں ۔ بعض مسلمان جو بھولپن میں جبر کے اس ماحول کا شکار ہو جاتے ہیں ، مذہب سے بے تعلق اور اپنی ذات میں مقید ہو کر رہ جاتے ہیں ۔ وہ اپنے اردگرد کے حالات سے شرم اور خوف محسوس کرتے ہیں اور ماحول کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ۔ نتیجتہً نہ وہ اپنے معاشرے کے لئے ممکنہ حد تک قابلِ قدر خدمات انجام دے سکتے ہیں اور نہ خود اس سے کوئی خاص فائدہ حاصل کر سکتے ہیں ۔ بعض مسلمان دوسروں جیسا نظر آنے اور خود کو اُس معاشرے کے پسندیدہ افراد باور کرانے کے لیے موجودہ معاشرتی رجحانات کے دھارے میں بہہ نکلتے ہیں ۔ یہ لوگ بھی جس معاشرے میں رہتے ہیں اُسے نہ کچھ دے سکتے ہیں نہ اس سے کوئی فائدہ حاصل کر سکتے ہیں ۔ ایسے مسلمان تخریب اور رسوائی کا باعث بنتے ہیں کیونکہ اُن کا رشتہ مذہب کے عطا کردہ مؤثر اخلاقی اصولوں سے منقطع ہو چکا ہوتا ہے ۔

ان بے تعلق ، کھنچے کھنچے اور مذہبی طور پر آزاد مسلمانوں کے علاوہ کچھ ایسے افراد بھی ہیں جو مذکورہ بالا افراد سے کسی لحاظ سے بھی بہتر نہیں ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غالباً بعض مذہبی حلقوں کی کسی مستعد تنظیم سے یا بعض لادینی حلقوں کی وسیع سماجی سرگرمیوں سے مسحور ہو کر ان میں شامل ہو جاتے ہیں ۔ یہ افراد کبھی ان تنظیموں کا حصہ نہیں بن سکتے ۔ ان تنظیموں سے ان کا تعلق بس برائے نام

ہوتا ہے۔ انہیں "سنسان ہجوم" میں بھٹکی ہوئی روحیں کہا جا سکتا ہے۔ یہی موجودہ معاشرے کی ایک خصوصیت ہے۔ وہ ان تنظیموں میں اس لیے شمولیت اختیار نہیں کرتے کہ وہ ان میں سے کسی خاص گروہ کے عقیدے کو ذہنی طور پر پوری طرح تسلیم کر چکے ہیں نہ اُن کی شمولیت بنی نوع انسان سے بے غرضانہ محبت کا نتیجہ ہوتی ہے بلکہ وہ محض اس لیے ان تنظیموں میں شامل ہو جاتے ہیں کہ اپنے اسلامی ورثے کی صحیح سوجھ بوجھ نہیں رکھتے۔ اس سوجھ بوجھ کے فقدان اور غیر اسلامی ماحول میں رہنے کی وجہ سے وہ ضروری علم اور جرأت حاصل نہیں کر پاتے جس کی بدولت وہ بطورِ مسلمان اپنا تشخص برقرار رکھ سکیں۔ اگر ایسے مسلمانوں میں مذہب کے بارے میں حقیقی دلچسپی پیدا ہو جائے تو وہ اسلام کے راستے سے کبھی منحرف نہیں ہوں گے کیونکہ اسلام ایک ایسا دین ہے جو مذہبی ارتقاء اور انسانی امنگوں کی بلند ترین سطح کی علامت ہے۔ علاوہ ازیں اگر وہ حقیقی معنوں میں انسان کی روحانی اور اخلاقی فلاح کے لیے کوشاں ہوں تو اسلام کے دائرے میں رہتے ہوئے انہیں تسکین و اطمینان کی لازوال دولت نصیب ہو جائے۔ لہذا وہ جب بھی کسی دوسرے حلقے میں شامل ہوتے ہیں تو اس میں محض سرسری قسم کی دلچسپی ظاہر کر سکتے ہیں اور ایک کمتر درجے کا اطمینان اُن کے حصے میں آ سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کا اپنے مسلمان بھائیوں سے روحانی رشتہ منقطع ہو جاتا ہے اور نئے حلقوں سے اُن کی وابستگی سرسری نوعیت کی رہتی ہے۔

اگر مجموعی صورتِ حال کا تجزیہ کیا جائے اور نتائج کو پرکھا جائے تو منکشف ہوگا کہ ان "مسلمانوں" کا کردار اُن تمام حلقوں اور تنظیموں کے لیے افسوسناک اور مضرت رساں ہے جن سے وہ وابستگی اختیار کیے ہوتے ہیں۔ پھر اس صورتِ حال کے نتیجے میں مسلمانوں کی یکجہتی کو پہنچنے والا نقصان باقی تمام قابلِ قدر تنظیموں کے لیے بھی ایک بہت بڑا نقصان ہوگا۔ ایک سچا مسلمان ذمہ دارانہ شہریت، امنِ عالم، باہمی افہام و تفہیم، انسانی بھائی چارے، آزادیٔ ضمیر اور انسانی وقار کی بقا کے لیے نہایت مؤثر کردار ادا کر سکتا ہے کیونکہ یہ تمام اصول اسلام کا لازمی

حصّہ ہیں۔ مسلمانوں کو ان اصولوں کی پاسداری کا حکم دیا گیا ہے اور ہر مسلمان ان کے لیے جوابدہ ہے۔ اگر کوئی مسلمان (جس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان اصولوں پر عمل پیرا ہو) بھٹک جاتا ہے یا اپنے دین سے بے تعلق ہو جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دنیائے انسانیت اس کے مفید کردار سے محروم رہے گی اور یہ کوئی معمولی نقصان نہیں ہوگا۔

مسلمان یہ عقیدہ رکھنے میں حق بجانب ہیں کہ اُن کی کتاب قرآنِ مجید الہام کا شاہکار اور مذہبی صداقت کا معیار ہے۔ وہ اس پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ اسلام ابدی پیغامِ الٰہی کی توثیق کرنے اور ماضی کے مذہبی تنازعات کو ختم کرنے آیا ہے تاکہ انسان ہر شعبۂ زندگی سے متعلق تخلیقی اور تعمیری سرگرمیوں میں از سرِ نو مستعد ہو سکے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمان خود کو باقی بنی نوعِ انسان سے الگ تھلگ یا بالاتر تصوّر کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ وہ دوسروں پر اسلام مسلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ نسلِ انسانی کو اعلیٰ و ادنیٰ درجوں میں تقسیم کرنے میں یقین رکھتے ہیں۔ وہ منظورِ نظر یا راندہ اقوام کا تصور قبول نہیں کرتے۔ وہ نسل کی بنیاد پر کسی مذہبی فرقے کو نہ تو برگزیدہ سمجھتے ہیں نہ خارج از مذہب گردانتے ہیں بلکہ انہیں تو یہ کام سونپا گیا ہے کہ وہ پیغامِ الٰہی کو بنی نوعِ انسان تک پہنچائیں اور انسانیت کی بھلائی کے لیے اپنا ناگزیر کردار ادا کریں۔ دوسرے لفظوں میں مسلمان بے تعلق، الگ تھلگ یا خود پسند نہیں رہ سکتے۔ یہ اُن کا مذہبی فریضہ ہے کہ زندگی کی حقیقتوں کو قبول کرنے کے لیے اپنے ذہن کو کھُلا رکھیں اور تمام لوگوں کی طرف خواہ ان کا تعلق کسی طبقے، عقیدے، نسل یا قومیّت سے ہو گرمجوشی سے اپنے بازو پھیلائیں۔ جو بھلائی وہ لوگوں کے ساتھ کر سکتے ہیں اور جو خدمات وہ دوسروں کے لیے انجام دے سکتے ہیں وہ صرف اسی صورت میں ظہور پذیر ہو سکتی ہیں جب وہ اسلام پر عمل پیرا ہوں اور دوسرے لوگوں کے ساتھ ہمدردی اور کریم النفسی کے اُسی جذبے سے پیش آئیں جو اسلام کا امتیازی وصف ہے۔

ان تمام حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم اسلام کو نئے انداز سے متعارف کرانے کی کوشش

کر رہے ہیں ۔ ہمارا ارادہ قطعاً یہ نہیں کہ مسلمانوں کو متعصب اور تنگ نظر بنائیں کیونکہ اسلام اس بات کی سختی سے مخالفت کرتا ہے ۔ ہمارا مطمح نظر یہ ہے کہ ان مسلمانوں کو جن کا اوپر ذکر ہوا ہے اور ان جیسے دوسرے مسلمانوں کو از سرِ نو اسلام کی سچائی سے روشناس کرائیں تاکہ انہیں انسان اور کائنات کے مابین تعلق کو سمجھنے کے لیے روحانی بصیرت اور دوسرے انسانوں سے پیش آنے کے لیے اخلاقی طرزِ عمل میسّر آسکے ۔ اگر ہم اس کوشش میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو مسلمان جہاں کہیں بھی ہیں اپنے اپنے ملک کے ذمہ دار شہری، نسل انسانی کے قابل تکریم رکن اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انسانی معاشرے کے خدا ترس افراد بن جائیں گے ۔

رقم الحروف نے جو کچھ اوپر بیان کیا ہے کیا اُس سے یہ مطلب اخذ کیا جائے کہ آج کی دنیا میں اسلام کے مستقبل کے بارے میں قنوطیت پسندانہ نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے، جرأت مندی سے مسلمانوں کی مایوسی اور بے چارگی کا اعتراف کیا گیا ہے ؟ یا آج کی نئی دُنیا میں مسلمان جس روحانی جنگ میں شکست خوردگی سے دوچار ہیں کیا مذکورہ بالا سطور میں اُس کے نتائج و عواقب کی ایک جھلک پائی جاتی ہے ؟ یقیناً ایسا نہیں ہے۔ قنوطیت اور مایوسی روحِ اسلام کے خلاف ہے اور بے چارگی خدا پر ایمان لانے کی ضد ہے ـــــ اسلام کا مستقبل عالمِ انسانیت کا مستقبل ہے ۔ اگر انسانیت کا کوئی مستقبل ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یقیناً ہے، تو پھر اسلام کا مستقبل بھی بہت عظیم اور تابناک ہے ۔ آج کے مسلمان جو روحانی جنگ لڑ رہے ہیں وہ اُن کی شکست پر منتج ہونے والی جنگ نہیں ہے، گو اس میدان میں اُن کی پیش رفت بہت سُست دکھائی دیتی ہے ۔ اگر مسلمان کسی بھی وجہ سے اس رُوحانی جنگ میں ہزیمت اُٹھاتے ہیں تو عالم انسانیت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا ۔

اس تمہید کی اہمیت یہ ہے کہ اس صورتِ حال کی حقیقت پسندانہ تصویر پیش کر دی جائے جس کا نئی دنیا کے مسلمانوں کو سامنا ہے اور یہ کہ بزرگ اور نوجوان ہر دو نسل کو اُن خطرات سے متنبہ کر دیا جائے جو ہمارے سروں پر منڈلا رہے ہیں نیز ان نقصانات سے بھی آگاہ کر دیا جائے

جن سے بچنا از حد ضروری ہے۔ مزید برآں اُن تمام افراد کو جو بنی نوع انسان کی روحانی فلاح میں واقعی دلچسپی رکھتے ہیں خبردار کر دیا جائے کہ انہیں اس موجودہ صورتِ حال سے ہوشیار رہنا ہوگا اور انسانیت اور اس کے مسائل کے بارے میں نیا رویہ اختیار کرنا ہوگا۔

ہم اپنے مسلمان بھائیوں کو اللہ کی امان میں دیتے ہیں اور اُس کی ذات پر ہمارا بے پایاں یقین ہے کہ وہ ہماری کوششیں رائیگاں نہیں جانے دے گا۔ "میں تو اصلاح کرنا چاہتا ہوں جہاں تک بھی میرا بس چلے۔ اور یہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں اس کا سارا انحصار اللہ کی توفیق پر ہے، اُسی پر میں نے بھروسہ کیا اور ہر معاملہ میں اُسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔"

(قرآن، سورہ ۱۱، آیت ۸۸)

دیباچہ

(اشاعت دوم)

زیرِ نظر تصنیف کا اصل محرک شمالی امریکہ کے مسلم اور غیر مسلم قارئین ہیں جن کی اہم مطالعاتی ضروریات پوری کرنے کے لیے اسے منظرِ عام پر لایا گیا تھا۔ کتاب کی تیاری کے وقت مختلف نوعیت اور درجے کی مجبوریاں کارفرما رہیں جس کی وجہ سے بنیادی اہمیت کی حامل بہت سی باتیں نظر انداز کرنا پڑیں۔ اس کے باوجود کتاب کو شرفِ قبول حاصل ہوا اور یہ قارئین کے لیے مددگار ثابت ہوئی۔ الحمدُللہ

قارئین کے حوصلہ افزا اور ستائشی تبصروں، بہت سے مسلم حلقوں کی حقیقی دلچسپی، اسلامی مراکز کی بھرپور حمایت اور اس قسم کی خدمت جاری رکھنے کی مسلسل ضرورت نے ہمارے لیے اخلاقی طور پر لازمی ٹھہرا دیا ہے کہ ہم اس کتاب کو سہل الحصول بنانے کے لیے اس کی وسیع اشاعت کا اہتمام کریں۔ لہٰذا اس کے نظرِ ثانی شدہ ایڈیشن کی ضرورت محسوس ہوئی۔

چنانچہ ایک دفعہ پھر اس اخلاقی ضرورت کو پورا کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔ بنیادی طور پر کتاب کی نظرِ ثانی کا مقصد خیالات کی مزید وضاحت کرنا اور اسلوب بیان کو مزید سادہ اور سلیس بنانا ہے۔ پہلے ایڈیشن کے مندرجات اور بنیادی طرزِ فکر کو برقرار رکھا گیا ہے تخفیف و اضافہ کم سے کم کیا گیا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ وقت کی کمی کے سبب ہم مفصل نظرِ ثانی نہیں کر سکے اور نئے تجربات اور مخلص قارئین کی گراں قدر تجاویز سے پورا پورا فائدہ نہیں اُٹھا سکے۔

تاہم ہمارے لیے یہ بات بھی بڑی خوشی کا باعث ہے کہ مسلمانوں اور دوسرے ادیان سے تعلق رکھنے والے جویانِ حقیقت کے لیے اور دینِ اسلام کی خدمت سرانجام دینے کے لیے یہ کتاب گردش میں رہے گی۔

اگر ہماری یہ حقیر سی کاوش کامیاب ہوتی ہے تو اس کا سبب اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم اور اس کی ہدایت کا شاملِ حال ہونا ہوگا۔ لیکن اگر یہ قارئین کی توقعات پر پوری نہیں اُترتی تو ہم صرف دعا کر سکتے ہیں کہ خدائے بزرگ و برتر ہماری ناقص بصیرت سے درگزر فرمائے اور آس لگا سکتے ہیں کہ وہ ہماری کوتاہیوں کو بخش دے۔

رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ أَنَبْنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ

”اے ہمارے رب، تیرے ہی اوپر ہم نے بھروسا کیا اور تیری ہی طرف ہم نے رجوع کر لیا اور تیرے ہی حضور ہمیں پلٹنا ہے۔“

بابِ اوّل

اسلام کی نظریاتی اساس۔ اللہ (خدا)

خدا کے بارے میں علم رکھنا اور اس پر ایمان لانا ہی اسلام کی اساس ہے۔ یہ موضوع اس قدر اہم ہے کہ اس پر مفصل اور غیر مبہم انداز میں بحث و تمحیص کی ضرورت ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں بغرض وضاحت سادہ طرزِ استدلال اختیار کیا گیا ہے اور سیدھی سادی توضیحات پیش کی گئی ہیں۔ یہ اسلوب اُن حضرات کو جو پہلے ہی موضوع سے متعلق کچھ نہ کچھ علم رکھتے ہیں شاید اُکتا دینے والا یا بہت سادہ محسوس ہو۔ ایسے حضرات سے استدعا ہے کہ وہ تحمل و برداشت سے کام لیں اور نفسِ مضمون کی اصل اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

کچھ حضرات سائنس کے نام پر یا فہم و تجربہ کی کمی کے باعث خدا کے تصور کے بارے میں تشکیک کا شکار ہیں۔ یہ لوگ اگرچہ اہلِ علم اور دانشور ہونے کے مدعی ہیں لیکن ان کا رویہ اُن کی ذہنی پراگندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ مجھے اُن کے دعووں سے نہیں بلکہ اس بات سے سروکار

ے خدا کے وجود کا سوال صدیوں تک عظیم شخصیتوں کے ذہان پر چھایا رہا ہے۔ جو لوگ خدا پر یقین رکھتے ہیں وہ اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ انسان کی محدود عقل خدا (جو کہ لامحدود ہے) کا وجود ثابت نہیں کر سکتی۔ عقل تو صرف مثالوں یا دلیلوں سے اُس کے وجود کی توضیح کر کے متجسس انسانی ذہن کو مطمئن کر سکتی ہے۔ جو لوگ خدا کے وجود سے منکر ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ وہ سائنس، فلسفہ یا مخصوص علمی نظریات پر بھروسا کر سکتے ہیں۔ اُن کے دلائل بعض اوقات ناقابلِ اطلاق، بعض اوقات غیر متعلقہ، ہمیشہ پیچیدہ اور اکثر ناقابلِ فہم ہوتے ہیں۔ تاہم

ہے کہ اُن کا اصل نقطۂ نظر کیا ہے اور وہ کس مقام پر کھڑے ہیں۔ اس سے واضح ہو جائے گا کہ کتاب میں بحث کا وافر حصّہ سہل اور سادہ انداز میں کیوں پیش کیا گیا ہے اور ایسا کیوں مترشح ہوتا ہے کہ روئے سخن بڑوں کی طرف نہیں بچوں کی طرف ہے۔ دوسرے اس کتاب کا ایک اہم مقصد نوجوان مسلمانوں کو خدا کا صحیح اسلامی تصور دینا ہے۔ دورانِ بحث یہ بات بھی مدِنظر رکھی گئی ہے کہ بہت سے غیر مسلم افراد جو بزعمِ خود خدا پر یقین رکھتے ہیں اور مذہب کے حامی ہیں اُن کے اذہان میں خدا کا اسلامی تصور مسخ شدہ حالت میں ہے۔

یہی وہ وجوہات ہیں جن کی بنا پر اس کتاب میں کچھ سیدھی سادی بلکہ بالکل ابتدائی توضیحات پیش کی گئی ہیں۔ اس کے باوجود یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بعض توضیحات و دلائل کی سادگی بہت سے بالغ افراد کے ذہنوں میں فکرِ عمیق کی راہیں کھول سکتی ہے۔ اگر یہ مقصد پورا ہو جاتا ہے تو تحریر کی یہ سادگی ایک قابلِ قبول اور تخلیقی سادگی ثابت ہوگی جو اسلام ہی کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔

جب ہم اپنے گردوپیش میں نظر دوڑاتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ہر خاندان کا ایک سربراہ ہر سکول کا ایک پرنسپل، ہر شہر یا قصبے کا ایک میئر، ہر صوبے کا ایک گورنر اور ہر قوم کا ایک حکومتی سربراہ ہوتا ہے۔ مزید برآں ہم بغیر کسی شک و شبہ کے یہ بھی جانتے ہیں کہ ہر صنعتی شے کے

ایک ترقی یافتہ آزاد ذہن خدا تک رسائی حاصل کرنے کا راستہ تلاش کر لیتا ہے۔ اس راستے کی تلاش میں ناکامی کا یہ مطلب نہیں کہ راستہ سرے سے موجود ہی نہیں۔ کسی حقیقت سے انکار اُسے غیر حقیقی نہیں بنا دیتا۔ دلچسپ تقابلی نقطہ ہائے نظر کے لیے دیکھیے: "اپروچز ٹو گاڈ" از جیکوز میریٹین (نیویارک دی میکملن کمپنی ۱۹۵۴ء) (APPROACHES TO GOD by Jacques Maritain (New York; The Macmillan Company, 1954) "اسلام: اِٹس مینِنگ فار ماڈرن مین" از محمد ظفر اللہ خان (نیویارک ہارپر اینڈ رو، ۱۹۶۲ء) ISLAM: ITS MEANING FOR MODERN MAN by Muhammad Zafarullah Khan (New York: Harper and Row, 1962) "دی ایگزسٹنس آف گاڈ" از جان ہک (نیویارک، دی میکملن کمپنی ۱۹۶۴ء) THE EXISTENCE OF GOD by John Hick (New York: The Macmillan Company, 1964)

پیچھے کوئی نہ کوئی صنعت کار ہوتا ہے اور ہر حسین فن پارہ کسی عظیم فنکار کی تخلیق ہوتا ہے ۔ یہ سب باتیں اظہر من الشمس ہیں ۔ لیکن اس سے علم کی تشنگی اور دنیا کی غیر معمولی اشیاء کے بارے میں انسانی تجسس کبھی ختم نہیں ہوتا ۔ فطرت کے حسین مناظر، اس کی دلآویزیاں اور اُعجوبے، آسمان میں ناپیدا کنار آفاق اور ان کی لامنتہا پہنائیاں، دن اور رات کا انتہائی منظم اور غیر اختتام پذیر سلسلہ، سورج، چاند اور بڑے بڑے ستاروں کے مدار، ذی روح اور بے جان مخلوق کی دنیا اور انسان کا نسلاً بعد نسلٍ ارتقائی مراحل طے کرنے کا مسلسل عمل، یہ سب کچھ دیکھ کر انسان ورطۂ حیرت میں آجاتا ہے ۔ انسان اکثر حیران ہوتا ہے کہ یہ سب چیزیں جن کے ساتھ ہم زندگی گزارتے ہیں اور جن سے ہم بے حد لطف اندوز ہوتے ہیں اُن کا خالق اور اُن کا انتظام چلانے والی ہستی کون ہے ۔ ہم قدرتی طور پر اس کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں ۔

کیا ہم اس وسیع و عریض کائنات کے متعلق تفصیلی آگہی حاصل کر سکتے ہیں ؟ کیا عالمِ موجودات کے اسرار کی نقاب کشائی تسلی بخش طور پر ممکن ہے ؟ ہم جانتے ہیں کہ کوئی خاندان کسی ذمہ دار سربراہ کے بغیر صحیح طور پر اپنے فرائض ادا نہیں کر سکتا، کوئی شہر مستحکم انتظامیہ کے بغیر کامیابی سے نظم و نسق برقرار نہیں رکھ سکتا اور کوئی ریاست کسی مقتدرِ اعلیٰ کے بغیر اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتی ۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ کوئی چیز خود بخود وجود میں نہیں آتی ۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ کائنات موجود ہے اور نہایت منظم طریقے سے اپنا کام سرانجام دے رہی ہے ۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ لاکھوں سال سے قائم ہے ۔ تو پھر کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب محض ایک حادثاتی یا اتفاقی امر ہے ۔ کیا ہم انسان کے وجود اور ساری دنیا کو محض اتفاق یا حادثے سے منسوب کر سکتے ہیں ؟

اگر انسان کسی حادثے یا محض اتفاق کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آیا ہوتا تو اس کی ساری زندگی اتفاقات سے عبارت ہوتی اور یوں اُس کا پورا وجود بے معنی ہو کر رہ جاتا ۔ لیکن کوئی بھی باشعور شخص اپنی زندگی کو بے معنی خیال نہیں کرتا اور کوئی ذی عقل اپنے وجود کو تغیر پذیر اتفاقات کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا ۔ ہر سمجھ بوجھ رکھنے والا انسان اپنی زندگی کو جہاں تک ممکن ہو بامعنی

بنانے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے لیے کسی نہ کسی شکل میں مثالی طرزِ عمل کا تعین کرتا ہے۔ افراد، گروہ اور اقوام اپنے لیے کوئی نہ کوئی لائحہ عمل ضرور مرتب کرتی ہیں۔ ہر سوچے سمجھے منصوبے سے کچھ نہ کچھ مطلوبہ نتائج ضرور حاصل ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کسی نہ کسی نوع کی منصوبہ بندی ضرور کرتا ہے اور اچھی منصوبہ بندی کے فوائد سمجھ سکتا ہے۔

اس کے باوجود انسان اس عظیم کائنات کا ایک بہت ہی چھوٹا حصّہ ہے۔ اگر وہ منصوبے وضع کر سکتا ہے تو اس کا اپنا وجود اور کائنات کی بقا بھی لازمی طور پر کسی منظم منصوبے یا حکمتِ عملی کی بنیاد پر ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے مادی وجود کے پیچھے منصوبہ بندی کا عزم ضرور کارفرما ہے اور دنیا پر ایک ایسا منفرد ذہن محیط ہے جو اشیاء کو وجود میں لاتا ہے اور انہیں منظم طور پر حرکت میں رکھتا ہے۔ ہماری دنیا کے اعجوبے اور زندگی کے رموز اتنے غیر معمولی ہیں کہ وہ کسی حادثے یا محض اتّفاق کی پیداوار نہیں ہو سکتے۔

اس پس منظر میں ہمیں یہ بات ماننا پڑے گی کہ کائنات میں ضرور کوئی ایسی عظیم طاقت سرگرمِ عمل ہے جو ہر چیز کو نظم و ترتیب میں رکھتی ہے۔ فطرت کے حُسن کے پیچھے ضرور کوئی عظیم فن کار ہے جو فن کے نہایت دلکش شاہکار تخلیق کرتا ہے اور ہر شئے کو اس طرح ڈھالتا ہے کہ اُس سے زندگی کے کسی خاص مقصد کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہ طاقت دوسری تمام طاقتوں سے برتر اور یہ فنکار دوسرے تمام فنکاروں سے عظیم تر ہے۔ حقیقی معنوں میں اہلِ یقین اور شعور و آگہی رکھنے والے لوگ اس فنکار کو تسلیم کرتے ہیں اور اسے اللّٰہ یا خدا کا نام دیتے ہیں۔ وہ اُسے خدا اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اس دنیا کا خالق اور معمارِ اعلیٰ ہے، زندگی پیدا کرنے والا ہے اور تمام موجودات کا پروردگار ہے۔ وہ انسان نہیں ہے کیونکہ کوئی انسان دوسرے انسان کی تخلیق یا تشکیل نہیں کر سکتا۔ وہ نہ کوئی جانور ہے نہ کوئی پودا، نہ کوئی بت ہے نہ کسی قسم کا کوئی مجسّمہ کیونکہ ان میں سے کوئی بھی چیز نہ تو خود کو اور نہ کسی دوسری چیز کو بنا سکتی ہے۔ وہ مشین بھی نہیں۔ وہ نہ سورج ہے نہ چاند اور نہ کوئی ستارہ۔ کیونکہ یہ تمام

اشیاء کسی عظیم نظام یا ضابطے کی پابند ہیں اور خود انھیں کسی اور نے بنایا ہے۔ وہ ان تمام اشیاء سے مختلف ہے کیونکہ وہ ان سب کا صانع اور محافظ ہے۔ کسی بھی چیز کے بنانے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اُس چیز سے مختلف اور برتر ہو جسے وہ بناتا ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ کوئی چیز خود بخود وجود میں نہیں آتی اور یہ حیرت انگیز دنیا خود بخود تخلیق نہیں ہوئی نہ یہ کسی اتّفاق یا حادثے کا نتیجہ ہے۔ دنیا میں مسلسل رونما ہونے والی تبدیلیاں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسے بنایا گیا ہے اور ہر وہ چیز جو بنائی جاتی ہے اس کا کوئی بنانے والا بھی ضرور ہوتا ہے۔

دنیا کو بنانے والا اور اُس کو قائم رکھنے والا، انسان کا خالق اور اُس کا پروردگار، فطرت میں کارفرما عامل قوت اور موثر طاقت یہ سب ایک ہی ذات ہے اور اس کا نام ہے اللہ یا خدا۔ وہی تمام رازوں کا سرچشمہ ہے اور تمام موجودات میں اعلیٰ و برتر ہے۔ خدا کی سچی کتاب قرآن مجید میں ارشاد ہے[۲]:

> وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو اور دن کو روشن کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔ وہی اللہ (جس نے تمہارے لیے یہ کچھ

---

[۲] اچھے ادب پاروں کا کسی دوسری زبان میں مکمل اور بالکل صحیح ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔ قرآنِ حکیم پر یہ بات اور بھی زیادہ صادق آتی ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں عربی زبان و ادب کے ماہرین کو کھلا چیلنج دیا گیا (یہ چیلنج اب بھی موجود ہے) اور ثابت کیا کہ وہ اس کے کسی مختصر ترین حصے جیسی یا اس سے معمولی سی ملتی جلتی تحریر بھی پیش نہیں کر سکتے۔ لہٰذا قرآن کا مطلب حُسن اور تخیل کسی بھی شکل میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ اس کتاب میں قرآن کے حوالے سے جو کچھ لکھا گیا ہے وہ خالص قرآن یا اُس کا صحیح ترجمہ نہیں، بلکہ یہ ایک مختلف زبان میں انسانی تاویل ہے جس میں وہ زیادہ تاثر یا ہرگز نہیں ہو سکتا جو اللہ کے اصل کلام میں ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر یہاں قرآن کے ترجمے کے طور پر جو کچھ پیش کیا گیا ہے اُسے کسی بندھے ٹکے اصول کے تحت وادین میں پابند نہیں کیا گیا۔

کیا ہے) تمہارا رب ہے ۔ ہر چیز کا خالق ۔ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ۔ پھر تم
کدھر بہکائے جا رہے ہو ۔ اسی طرح وہ سب لوگ بہکائے جاتے رہے ہیں
جو اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے ۔ وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے
زمین کو جائے قرار بنایا اور اوپر آسمان کا گنبد بنا دیا ۔ جس نے تمہاری صورت
بنائی اور بڑی ہی عمدہ بنائی ۔ جس نے تمہیں پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا ۔ وہی اللہ
(جس کے یہ کام ہیں) تمہارا رب ہے ۔ بے حساب برکتوں والا ہے وہ کائنات
کا رب ۔ وہی زندہ ہے ۔ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ۔ اُسی کو تم پکارو اپنے
دین کو اُس کے لیے خالص کر کے ۔ ساری تعریف اللہ رب العالمین ہی کے
لیے ہے ۔ (قرآن: سورہ ۴۰، آیات ۶۱ تا ۶۵)

وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کیا تاکہ اُس کے حکم
سے کشتیاں اُس میں چلیں اور تم اُس کا فضل تلاش کرو اور شکر گزار رہو ۔ اُس
نے زمین اور آسمان کی ساری ہی چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا، سب کچھ
اپنے پاس سے ـــــ اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو
غور و فکر کرنے والے ہیں ۔ (قرآن: سورہ ۴۵، آیات ۱۲ تا ۱۳)

کُل دنیا کا مالک اور ہر چیز کا خالق خدا ہے کیونکہ وہ باقی تمام موجودات سے اس درجہ
بڑا اور مختلف ہے کہ انسان صرف غور و فکر اور استغراق کے عالم میں ہی اُسے جان سکتا ہے ۔
وہ ہر وقت موجود ہے اور اُس کی زبردست طاقت دنیا میں ہر جگہ کارفرما ہے ۔ انسان کو
اس کے وجود پر یقین کرنا پڑتا ہے کیونکہ دنیا کی ہر چیز اُس کی موجودگی ثابت کر رہی ہے ۔
خدا اور اُس کی عظیم طاقت پر ایمان لا کر ہی انسان زندگی کی بہت سی پُراسرار چیزوں کی ممکن
حد تک بہترین وضاحت کر سکتا ہے ۔ یہی ایک محفوظ ترین طریقہ ہے جس کے ذریعے ہم
صحیح علم اور روحانی بصیرت حاصل کر سکتے ہیں، اچھے اخلاق اور مضبوط کردار کا راستہ اختیار

کر سکتے ہیں اور مسرت و کامرانی سے بہرہ یاب ہو سکتے ہیں۔

خدا کے وجود کو تسلیم کر لینے کے بعد انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اُس کی صفات اور اسما سے بھی واقف ہو۔ یوں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر کمال اور خیرِ مطلق کا سرچشمہ اُسی کی ذات ہے اور کوئی کوتاہی یا غلطی اُس سے منسوب نہیں ہو سکتی لیکن خصوصی اصطلاح میں انسان کے لئے مندرجہ ذیل باتوں کا جاننا اور اُن پر ایمان لانا ضروری ہے۔

۱۔ کہو، وہ اللہ ہے، یکتا۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اُس کے محتاج ہیں۔ نہ اُس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے۔

(قرآن : سورہ ۱۱۲، آیات ۱ تا ۵)

۲۔ وہی زبردست اور دانا ہے۔ زمین و آسمان کی سلطنت کا مالک وہی ہے، زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے، اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ وہی اوّل بھی ہے اور آخر بھی، اور ظاہر بھی ہے اور مخفی بھی، اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے... اُس کے علم میں ہے جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اُس میں چڑھتا ہے۔ وہ تمہارے ساتھ ہے، جہاں بھی تُم ہو۔ جو کام بھی تم کرتے ہو اُسے وہ دیکھ رہا ہے۔ وہی زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے اور تمام معاملات فیصلے کے لیے اُسی کی طرف رجوع کیے جاتے ہیں۔ وہی رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور دل میں چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے۔

(قرآن : سورہ ۵۷، آیات ۱ تا ۶)

۳۔ میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے

درگزر فرمائے گا۔ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔

(قرآن : سورہ ۳، آیت ۳۱)

زمین میں چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمّے نہ ہو۔

(قرآن : سورہ ۱۱، آیت ۶)

لوگو، تم ہی اللہ کے محتاج ہو اور اللہ تو غنی و حمید ہے۔

(قرآن : سورہ ۳۵، آیت ۱۵)

جو کوئی اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرے اللہ اُس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا راستہ پیدا کر دے گا اور اُسے ایسے راستے سے رزق دے گا جدھر اُس کا گمان بھی نہ جاتا ہو۔۔۔۔۔۔ اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے۔

(قرآن : سورہ ۶۵، آیات ۲ تا ۳)

اللہ کے ان اسما اور صفات میں سے ہر نام اور صفت کا ذکر قرآن مجید میں مختلف مقامات پر آیا ہے۔ اللہ کی ذات اپنی مخلوق کے ساتھ اس قدر شفیق اور رحیم ہے کہ ہم سب کو اُس کی امان اور رحمت حاصل ہے۔ اگر ہم اُس کی نعمتوں کا جو ہم پر ارزاں ہیں شمار کرنے لگیں تو ہم ایسا نہیں کر سکیں گے کیونکہ وہ ہمارے وہم و گمان سے بھی زیادہ ہیں۔

اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو کر نہیں سکتے۔

(قرآن : سورہ ۱۴، آیت ۳۲ تا ۳۴، سورہ ۱۶، آیت ۱۰ تا ۱۸)

اور اے نبی، میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں، تو انہیں بتا دو کہ میں اُن سے قریب ہی ہوں۔ پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے، میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں لہٰذا انہیں چاہیے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں۔ یہ بات تم انہیں سنا دو، شاید کہ وہ

راہِ راست پالیں۔ (قرآن : سورہ ۲، آیت ۱۸۶!)

ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اُس کے دل میں ابھرنے والے وسوسوں تک کو ہم جانتے ہیں۔ ہم اُس کی رگِ گردن سے بھی زیادہ اُس سے قریب ہیں۔ (قرآن : سورہ ۵۰، آیت ۱۶)

اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ اس کی محبت کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ یہ ہمارے وہم وگمان سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ ہم اُس کی نعمتوں کا اندازہ یا شمار نہیں کر سکتے۔ وہ ہمیں تخلیق کرتا ہے اور ہماری خوب حفاظت کرتا ہے۔ اس کی حفاظت ہماری پیدائش کے بعد ہی نہیں بلکہ اس سے بہت پہلے شروع ہو جاتی ہے۔ وہ ہمیں بہترین نمونے پر تخلیق کرتا ہے اور ہمیں وہ تمام خواص اور صلاحیتیں ودیعت کر دیتا ہے جن کی ہمیں اپنی نشوونما کے لیے ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ہماری اُس وقت مدد کرتا ہے جب ہم خود اپنی مدد نہیں کر سکتے۔ وہ ہمارے لیے اور ہمارے زیرِکفالت لوگوں کے لیے رزق مہیا کرتا ہے۔ وہ انسان کے اندر ایک ذہن بنا دیتا ہے تاکہ ہم سمجھ بوجھ سے کام لے سکیں۔ وہ روح اور ضمیر دیتا ہے تاکہ انسان نیک اور خدا ترس بن سکے۔ وہ ہمیں جذبات اور احساسات بخشتا ہے تاکہ ہم دوسروں کے ساتھ مہربانی اور ہمدردی کا رویہ اختیار کریں۔

یہ اُس کی رحمت ہے کہ ہم صحیح علم حاصل کرتے ہیں اور حقیقی روشنی سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ چونکہ وہ رحیم ہے اس لیے وہ ہمیں بہترین ہیئت میں پیدا کرتا ہے اور ہمیں شمس وقمر، بحر وبر، ارض وسما اور نباتات وحیوانات سے نوازتا ہے۔ وہ ان سب کا اور بہت سی دوسری چیزوں کا خالق ہے جو ہمارے ہی فائدے اور استعمال کے لیے ہیں۔ وہ اُن تمام چیزوں کا خالق ہے جو ہماری اس زندگی میں کام آتی ہیں۔ وہ انسان کو وقار، ذہانت اور عزت وتکریم دیتا ہے کیونکہ انسان اشرف المخلوقات

ہے اور زمین پر خُدا کا نائب ہے ۔ رحمتِ خداوندی سے ہم امید، اطمینان، حوصلہ اور اعتماد حاصل کرتے ہیں ۔ خدا کی رحمت ہمیں اپنے غموں اور دُکھوں کا مداوا کرنے، اپنی مشکلات پر قابو پانے اور مسرت و کامرانی حاصل کرنے کے قابل بناتی ہے ۔ بے شک اللہ کی رحمت مصیبت زدوں کو نجات دلاتی ہے، غمزدوں کو خوشیاں بخشتی ہے، بیماروں کو تسکین دیتی ہے، مایوسوں کی ڈھارس بندھاتی ہے اور حاجت مندوں کو آسودگی عطا کرتی ہے ۔ المختصر رحمتِ خداوندی ہر جگہ، ہر لمحہ اور ہماری زندگی کے ہر پہلو میں اپنا اثر دکھاتی ہے ۔ ہو سکتا ہے بعض لوگ اللہ کی رحمت کو محض اس لیے نہ پہچان سکیں کہ وہ اسے ایک مفروضہ خیال کرتے ہیں لیکن یہ ایک حقیقی شے ہے جسے ہم دل سے محسوس کر سکتے ہیں اور ذہن سے اس کا ادراک کر سکتے ہیں ۔

شفیق و رحیم خدا ہمیں کبھی فراموش نہیں کرتا، ہم سے کبھی منہ نہیں موڑتا، ہماری پُرخلوص دُعائیں کبھی نظرانداز نہیں کرتا ۔ یہ اُس کی رحمت اور شفقت ہے کہ اُس نے ہمیں سیدھا راستہ دکھایا، ہمارے لیے پیغمبر اور ہادی بھیجے، صحیفے اور الہامات نازل کیے ۔ یہ سب کچھ اُس نے ہماری مدد اور رہنمائی کے لیے ہی تو کیا ہے ۔ خدا کے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور خدا کی سب سے زیادہ سچی اور خالص کتاب قرآن ہے جو ہمارے پاس موجود ہے ۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ اور قرآنِ حکیم کی تعلیمات سے ہمیں خدائے غفور الرحیم کے بارے میں علم حاصل ہوتا ہے ۔ اگر کوئی شخص کسی گناہ یا غلطی کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی اور خدا کے خلاف جُرم کا مرتکب ہوتا ہے ۔ دراصل اس طرح وہ اپنے وقار کو مجروح کرتا ہے اور اپنی ہی ذات کے خلاف بدسلوکی کرتا ہے ۔ لیکن اگر وہ مخلص ہے اور نادم ہونا چاہتا ہے، اپنی غلطیوں پر افسوس کرتا ہے اور خدا سے رجوع کرنا چاہتا ہے، خدا سے بخلوص دل معافی کا خواستگار ہوتا ہے اور دیانت داری سے خدا سے رجوع کرتا ہے تو خدا یقیناً اُس کی التجا قبول کر

لے گا اور اُسے معاف کر دے گا۔ حتیٰ کہ ان لوگوں کو بھی جو خدا یا اس کی وحدانیت کو نہیں مانتے بخشش کی یقین دہانی کرائی گئی ہے بشرطیکہ وہ اپنے غلط رویّے کا احساس کرلیں اور خدا کی طرف لوٹنے کا تہیّہ کرلیں۔ اس ضمن میں ارشادِ خداوندی ہے۔

اللہ صرف شرک ہی کو معاف نہیں کرتا، اس کے ماسوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لیے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔ اللہ کے ساتھ جس نے کسی اور کو شریک ٹھیرایا اُس نے تو بہت ہی بڑا جھوٹ تصنیف کیا اور بڑے سخت گناہ کی بات کی۔

(قرآن: سورہ ۴، آیت ۴۸، ۱۱۶)

اے نبی: کہہ دو اے میرے بندو، جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے، وہ تو غفور رحیم ہے۔ پلٹ آؤ اپنے رب کی طرف اور مطیع بن جاؤ اُس کے قبل اس کے کہ تم پر عذاب آجائے اور پھر کہیں سے تمہیں مدد نہ مل سکے اور پیروی اختیار کرلو اپنے رب کی بھیجی ہوئی کتاب کے بہترین پہلو کی، قبل اس کے کہ تم پر اچانک عذاب آئے اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔ (قرآن: سورہ ۳۹، آیات ۳۹ تا ۵۴)

ان عظیم مہربانیوں اور نوازشوں کے عوض خدا ہم سے کچھ نہیں چاہتا کیونکہ وہ بے نیاز اور مختارِ کُل ہے۔ وہ ہم سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا کیونکہ ہم اُسے کوئی بدلہ نہیں دے سکتے نہ ہم اُس کی ان گنت مہربانیوں اور نوازشوں کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ وہ ہمیں صرف اس بات کا حکم دیتا ہے کہ ہم نیک بن جائیں، اُس کے شکر گزار اور قدر دان رہیں، اُس کے احکامات بجا لائیں اور اُس کا قانون نافذ کریں، اس کی خوبیوں اور عظیم الشّان صفات کا صحیح معنوں میں مظہر بن جائیں، روئے زمین پر اُس کے دیانت دار کارکن اور سچے نائب

بنیں۔ وہ ہمیں غلام نہیں بنانا چاہتا کیونکہ وہی تو ہے جو ہمیں عظمت و عزت بخشتا ہے۔ وہ ہمیں محکوم بنانا نہیں چاہتا کیونکہ وہی تو ہے جو ہمیں ہر قسم کے وسوسوں اور توہمات سے نجات دلاتا ہے۔ وہ ہماری تحقیر نہیں چاہتا کیونکہ وہی تو ہے جو ہمیں تخلیق کرتا ہے اور باقی تمام مخلوقات سے اشرف و اعلیٰ بناتا ہے۔ چنانچہ خدائے عزّ و جل جو بھی احکامات اور ہدایات ہمیں دیتا ہے وہ ہمارے اپنے فائدے اور بہتری کے لیے ہیں کیونکہ ان کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہم آپس میں امن، محبت، بھائی چارے اور تعاون کی فضا میں پُر لطف زندگی گزاریں۔ یہی احکامات ہمیں خدائے لم یزل کی بہجت آفریں رفاقت اور ابدی مسرت کی منزل سے ہمکنار کریں گے۔

خدا کا ادراک کرنے کے بہت سے طریقے ہیں۔ بہت سی اشیاء ہیں جو ہمیں اُس کا پتہ دیتی ہیں۔ دُنیا کے عظیم اُعجوبے اور محیّر العقول نمونے کھُلی کتابوں کی مانند ہیں جن میں ہم خدا کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں خدا اپنے انبیاءؑ اور الہامی صحیفوں کے ذریعے جو اُس نے بنی نوع انسان پر نازل کیے خود ہماری مدد کو آتا ہے۔ انبیاءؑ اور الہامات ہمیں خدا سے متعلق وہ بات بتاتے ہیں جو ہم جاننا چاہتے ہیں۔ پس فطرت پر غور کر کے، انبیاءؑ کے ارشادات سُن کر اور مقدس صحیفوں کا مطالعہ کر کے ہم خُدا کے بارے میں نہایت مدلّل علم حاصل کر سکتے ہیں اور خالقِ کائنات تک رسائی حاصل کرنے کا سیدھا راستہ معلوم کر سکتے ہیں۔

بحث کے اس حصے کی تکمیل کے لیے قرآنِ حکیم کی بعض نمایندہ آیات پیش کی جا سکتی ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

> اللہ نے خود شہادت دی ہے کہ اُس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، اور (یہی شہادت) فرشتوں اور سب اہلِ علم نے بھی دی ہے۔ وہ انصاف پر قائم ہے۔ اُس زبردست حکیم کے سوا فی الواقع کوئی خدا نہیں ہے۔

> اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور وہی ہر چیز پر نگہبان ہے۔ زمین اور آسمانوں

کے خزانوں کی کنجیاں اُسی کے پاس ہیں۔

(قرآن : سورہ ۳۹ ، آیت ۶۲ - ۶۳)

اللہ ہی خلق کی ابتدا کرتا ہے، پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا، پھر اُسی کی طرف تم پلٹائے جاؤ گے۔ (قرآن : سورہ ۳۰ ، آیت ۱۱)

آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں اُس کے بندے ہیں۔ سب کے سب اُسی کے تابع فرمان ہیں۔ وہی ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا ہے، پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اُس کے لیے آسان تر ہے۔ آسمانوں اور زمین میں اس کی صفت سب سے برتر ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے۔

(قرآن سورہ ۳۰ ، آیات ۲۶ تا ۲۷)

اسلام کا مفہوم

لفظ "اِسلام" عربی مادہ "سَلَمْ" سے ماخوذ ہے جس کا مطلب بہت سے دیگر مفاہیم کے علاوہ امن، پاکیزگی، تسلیم و رضا اور اطاعت شعاری ہے۔ دینی اصطلاح میں لفظ 'اسلام' سے مراد مشیّتِ الٰہی کو تسلیم کرنا اور اُس کے قانون کی اطاعت کرنا ہے۔ لفظ 'اسلام' کے بنیادی معنوں اور اس کے دینی مفہوم کے مابین ایک اُستوار اور راسخ تعلق پایا جاتا ہے۔ انسان مشیّتِ الٰہی کی اطاعت اور اُس کے قانون کی متابعت سے ہی حقیقی امن سے ہمکنار اور ابدی پاکیزگی سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔

بعض غیر مسلم حضرات ہمارے دینِ اسلام کو 'محمڈن ازم' اور اسلام کے ماننے والوں کو 'محمڈن' کا نام دیتے ہیں۔ مسلمان ان خود ساختہ اصطلاحات کو نہ صرف مسترد کرتے ہیں بلکہ ان کے استعمال کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ ہمارے عقیدے کو محمڈن ازم اور ہمیں محمڈن گردانتے میں بہت سے غلط پہلو مضمر ہیں جو ہمارے لیے واقعی تشویشناک

ہیں۔ ان غلط اصطلاحات کا استعمال یہ تاثر دیتا ہے کہ مذہب کا نام ایک فانی مخلوق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر رکھا گیا ہے اور یوں اسلام بھی یہودیت، ہندومت، مارکسزم وغیرہ کی طرح کا ہی ایک نظریہ یا ازم ہے۔ تسمیہ کی اس غلطی سے ایک اور مغالطہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ غیر مسلم حضرات مسلمانوں کو (جنہیں وہ محمڈن کہتے ہیں) حضرت محمدؐ کے پرستار تصور کر سکتے ہیں یا اُن کے ذہن میں یہ خیال آسکتا ہے کہ مسلمان بھی حضرت محمدؐ کو اسی طرح مانتے ہیں جس طرح (مثال کے طور پر) عیسائی حضرت عیسیٰؑ کو مانتے ہیں۔ تسمیہ کی اس غلطی کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ محمڈن ازم کی اصطلاح غیر مسلموں کو اسلام کے بارے میں گمراہ کر سکتی ہے اور وہ یہ سوچ سکتے ہیں کہ اس دین کے بانی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اسی لیے مذہب کا نام بھی اُن کے نام پر رکھا گیا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں یہ تمام تاثرات بالکل غلط اور گمراہ کن ہیں۔ اسلام دوسرے نظریات یا ازموں کی طرح کا کوئی نظریہ یا ازم نہیں ہے نہ مسلمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پرستش کرتے ہیں یا آپ کو اس نظر سے دیکھتے ہیں جس طرح عیسائی، یہودی، ہندو، مارکسسٹ وغیرہ اپنے اپنے رہبروں کو دیکھتے ہیں۔

مسلمان صرف خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک بشر تھے جنہیں اس دنیا سے رخصت ہونا تھا اور جنہیں خدا نے یہ فریضہ سونپا تھا کہ وہ انسانوں کو خدا کی باتیں بتائیں اور ایسی زندگی گزاریں جو دوسروں کے لیے مثال بن سکے۔ انسانی تاریخ میں آپؐ کی شخصیت ایک متقی اور کامل انسان کا بہترین نمونہ ہے۔ آپؐ کی ذاتِ گرامی انسانی شرف و فضیلت اور خیر کا ایک زندہ ثبوت ہے۔ مزید برآں مسلمانوں کا عقیدہ یہ نہیں ہے کہ اسلام کے بانی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آپ نے مذہبی ارتقاء کے آخری مرحلے میں اسلام کو از سرِ نو بحال کیا۔ اسلام کا حقیقی بانی خود خدائے برتر کی ذات کے سوا اور کوئی نہیں۔ اسلام کی بنیاد بہت پہلے حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے

ہیں رکھ دی گئی تھی۔ اُس وقت سے لے کر اب تک اسلام کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا اور گردشِ وقت کے آخری لمحات تک موجود رہے گا۔

ہمارے دین کا صحیح نام اسلام ہے اور اس پر ایمان لانے والے مسلمان ہیں۔ عام پائی جانے والی غلط فہمیوں کے برعکس اسلام یا مشیت الٰہی کی اطاعت اور قانونِ الٰہی کی متابعت کا مطلب انفرادی آزادی کا نقصان یا خود کو تقدیر کے حوالے کر دینا ہرگز نہیں جو شخص ایسا سوچتا ہے یا یقین رکھتا ہے وہ اسلام کے صحیح مفہوم یا اسلام میں خدا کے تصور کو سمجھنے میں یقیناً ناکام رہا ہے۔ اسلام ہمیں خدا کا جو تصور دیتا ہے اُس کے مطابق خدا کی ذات سب سے زیادہ مہربان اور رحم کرنے والی ہے، سب سے زیادہ مشفق اور انسان کی بھلائی چاہنے والی ہے اور اپنی مخلوقات کے لیے بہترین تدبیر اور نگہداشت کرنے والی ہے۔ چنانچہ اُس کی مشیت فیض رسانی اور خیر کی مشیت ہے، اور جو قانون بھی وہ ہمارے لیے تجویز کرتا ہے وہ لازمی طور پر انسان کے بہترین مفاد میں ہوتا ہے۔

جب مہذب لوگ اپنے ممالک کے قوانین کی پابندی کرتے ہیں تو انہیں اپنے اپنے ملک کے ہوشمند شہری اور معاشرے کے دیانت دار افراد تصور کیا جاتا ہے۔ کوئی ذمہ دار شخص یہ نہیں کہے گا کہ اس قبیل کے لوگ قانون کی پابندی کر کے اپنی آزادی کو مجروح کرتے ہیں۔ کوئی ذی عقل ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچ سکتا کہ قانون کی پابندی کرنیوالے لوگ تقدیر پرست یا مجبورِ محض ہیں۔ اسی طرح جو شخص مشیتِ الٰہی (جو منشائے خیر ہے) کی اطاعت کرتا ہے اور خدا کے قانون (جو ایک بہترین قانون ہے) کا اتباع کرتا ہے وہ یقیناً ایک ہوشمند اور دیانت دار شخص ہے۔ ایسا کر کے وہ اپنے حقوق کا تحفظ کرتا ہے دوسروں کے حقوق کا صحیح احترام کرتا ہے اور ایک اعلیٰ درجے کی ذمہ دارانہ اور تخلیقی آزادی سے متمتع ہوتا ہے۔ چنانچہ مشیتِ الٰہی کی اطاعت انسان کی انفرادی آزادی نہیں چھینتی اور نہ اس میں کوئی تخفیف کرتی ہے۔ اس کے برعکس یہ اطاعت اُسے بڑے پیمانے پر

اعلیٰ درجے کی آزادی عطا کرتی ہے۔ یہ اُس کے ذہن کو توہمات سے آزاد کر کے صد قتوں سے معمور کر دیتی ہے۔ روح کو معصیت اور تقصیرات سے پاک کر کے اسے نیکی اور پاکیزگی سے جِلا بخشتی ہے۔ انسانی ذات کو تکبّر اور حرص سے، حسد اور تناؤ سے اور خوف اور عدمِ تحفظ کے احساس سے نجات دلاتی ہے۔ انسان کو باطل خداؤں اور سفلی خواہشات کی محکومی سے آزاد کرتی ہے اور اُس کے آگے شرف و فضیلت اور نیکی و خیر کے حسین اُفق کھول دیتی ہے۔

مشیّتِ الٰہی کی اطاعت اور قانونِ الٰہی کا اتباع امن اور اتحاد کے فروغ کی بہترین ضمانت ہے۔ یہ اطاعت پذیری ایک طرف انسان اور اُس کے رفقاء کے مابین امن و سلامتی کی فضا سازگار بنانے میں مدد ہوتی ہے تو دوسری طرف انسانی معاشرے اور خدا کے درمیان موافقت و مطابقت کا ذریعہ بنتی ہے اور عناصرِ فطرت میں توازن و ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔

اسلام کے مطابق دنیا کی ہر چیز یا انسان کے سوا ہر مظہرِ فطرت خدا کے بنائے ہوئے قانون کا پابند ہے۔ خدا کی حاکمیت کی یہ خصوصیت ساری مادی دنیا کو لازمی طور پر خدا کا مطیع اور اُس کے قوانین کا تابع بنا دیتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ پوری کائنات حالتِ اسلام میں ہے یا دوسرے لفظوں میں ہم اسے 'مُسلم' کہہ سکتے ہیں۔ مادی دنیا کا اپنا کوئی انتخاب نہیں ہوتا۔ اس کے سامنے کوئی اختیاری راستہ نہیں جس پر وہ اپنی مرضی سے چل سکے۔ بلکہ یہ اپنے خالق کے بنائے ہوئے قانون یا قانون اسلام یا تسلیم و رضا کے تابع ہے۔
انسان ہی ایک واحد مخلوق ہے جسے ذہانت اور انتخاب کی صلاحیت عطا کی گئی ہے۔ چونکہ انسان میں ذہانت اور اختیاری انتخاب کی خصوصیات ودیعت کر دی گئی ہیں اس لیے اُسے مشیّتِ الٰہی کی اطاعت اور قانونِ الٰہی کے اتباع کی دعوت دی جاتی ہے۔ جب وہ قانونِ خداوندی کے اتباع کا راستہ اختیار کر لیتا ہے تو وہ اپنے اور دوسرے تمام عناصرِ فطرت (جو فطری طور پر خدا

کے طاعت گزار ہیں) کے درمیان ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے۔ اس طرح اُس کی سچائی کے ساتھ مطابقت اور کائنات کے تمام عناصر کے ساتھ ایک فطری ہم آہنگی قائم ہو جاتی ہے لیکن اگر وہ نافرمانی کرتا ہے تو وہ صراطِ مستقیم سے بھٹک جاتا ہے اور اُس کی شخصیت عناصر فطرت سے متناقض یا بے جوڑ ہو جاتی ہے اس پر مستزاد یہ کہ وہ اپنے قانون دہندہ کی ناراضی اور سزا کا مستوجب قرار پاتا ہے۔

چونکہ اسلام کا مطلب ہی مشیتِ یزدی کی اطاعت اور اس کے فیض رساں قانون کا اتباع ہے اور چونکہ یہی خدا کے تمام منتخب پیغمبروں کے پیغام کی رُوح رواں ہے، اس لیے مسلمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے تمام پیغمبروں پر ایمان لاتا ہے اور اُن میں کوئی فرق روا نہیں رکھتا۔ یہ بات اُس کے عقیدے میں شامل ہے کہ خدا کے جُملہ پیغمبر اور ان کے وفادار پیروکار مسلمان تھے اور اُن کا مذہب اسلام تھا جو ہر زمانے اور دنیا کے ہر خطے کے لیے خدا کا واحد سچا مذہب ہے۔ (قرآن: سورہ ۲، آیات ۱۲۸ تا ۱۴۰، سورہ ۳، آیات ۸۷ تا ۸۵۔ سورہ ۱۷، آیات ۴۲ تا ۴۴ سورہ ۳۱، آیت ۲۲ سورہ ۴۲، آیت ۱۳)

اس بحث کو سمیٹنے کے لیے راقم الحروف کا ایک بیان نقل کرنا مددگار ثابت ہوگا جو پوٹیکا کے آبزرور ڈسپیچ (او ڈی) کے ۴ دسمبر ۱۹۷۲ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ اس بیان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ زیرِ بحث مسئلے میں کس قدر بگاڑ اور الجھاؤ پیدا ہو چکا ہے۔ میری استدعا ہے کہ اگر بیان میں جزوی تکرار دیکھنے میں آئے تو موضوع کی نزاکت اور اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کے پیشِ نظر اس سے درگزر فرمایا جائے۔

آبزرور ڈسپیچ کی ایک خاص خبر چونکا دینے والی ہے۔ یہ خبر ایسے لوگوں کے لیے ہمدردی کے جذبات اُبھارتی ہے جنہیں صحیح معلومات فراہم نہیں کی گئیں۔ ان لوگوں میں بہت سے اساتذہ اور واعظین بھی آتے ہیں جنہیں غلط معلومات مہیا کیے جانے پر ہم

ہمدردانہ افسوس ہی ظاہر کر سکتے ہیں ـــــ یہ صورت حال ہر خیر خواہ اور باضمیر شخص سے تقاضا کرتی ہے کہ وہ بقدرِ ہمت و استطاعت کے مطابق اپنے اخلاقی فرائض سے عہدہ برآ ہو۔

"اُردن کے مقبوضہ اسرائیلی علاقہ سے مارکوس ایلیاسن نے اور کئی باتوں کے علاوہ یہ اطلاع بھی بھیجی ہے کہ مسلمان ابراہم (جنہیں وہ ابراہیمؑ کا نام دیتے ہیں) کی پرستش کرتے ہیں":

یقین نہیں آتا کہ آج کی سمٹی ہوئی چھوٹی سی دنیا میں کسی تازہ اشاعت میں یہ خبر پڑھنے کو ملے کہ مسلمان حضرت ابراہیم کی پرستش کرتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ یہ خبر ایسے ذرائع سے موصول ہوئی ہے جنہیں کسی طرح بھی حقیقتِ حال سے ناواقف نہیں کہا جا سکتا اور ایسے لوگوں تک پہنچی ہے جو یقیناً باخبر ہیں۔

صدیوں تک بہت سے اہلِ مغرب کا یہ نظریہ رہا ہے اور وہ اس کا پرچار کرتے رہے ہیں کہ مسلمان حضرت محمدؐ کی پرستش کرتے ہیں۔ مغربی دنیا میں اُن کے مذہب کو محمڈن ازم اور اس پر ایمان لانے والوں کو محمڈن کا نام دیا جاتا رہا ہے۔ پھر کسی طرح مغرب والوں پر یہ عیاں ہوا کہ مسلمان اللہ کی پرستش کرتے ہیں جو ایک قسم کا دیوتا ہے۔ اب یہ ایک نیا انکشاف ہوا ہے کہ وہ (مسلمان) ابراہم کو ابراہیمؑ کے نام سے پوجتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے کبھی حضرت محمدؐ یا کسی اور انسان کی پرستش نہیں کی۔ اُن کا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ حضرت محمدؐ بہت سے دوسرے سابقہ انبیاء کی طرح ایک بشر یا انسان تھے اور یہ بات انسانیت کے لیے اعلیٰ ترین خراجِ تحسین ہے کہ کسی انسان کو ہی نبوت کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز کیا گیا۔

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں نہ کہ واحد نبی۔ حضرت محمدؐ نے خدا کے ابدی پیغام کو از سرِ نو زندہ کیا اور اسے لافانی حیثیت

دے کر بنی نوع انسان تک پہنچایا۔ خدا کا یہ پیغام مختلف ادوار میں مختلف قوموں کے انبیاءؑ پر نازل ہوتا رہا جن میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی شامل ہیں۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ مسلمان ان تمام انبیاء پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کے مرتبے میں کوئی فرق روا نہیں رکھتے۔

ایک آفاقی زاویۂ نگاہ رکھنے اور سمت کے تعین میں زمان و مکاں کی قید از شخصیت پرستی سے آزاد ہونے کی وجہ سے مسلمان اپنے لیے محمڈن اور اپنے عقیدے کے لیے محمڈن ازم کے ناموں کو احساسِ افسوس کے ساتھ تسمیہ کی بے محل اور فاش غلطی تصور کرتے ہیں۔

ان اصطلاحات کے معانی میں مسلمانوں کے لیے بہت سے ناگوار پہلو مضمر ہیں۔ ان کے استعمال سے مسلمانوں میں جو ناگواری کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کی معقول وجوہات موجود ہیں۔ مسلمان اپنا تعلق کسی ایسی قوم یا نسلی گروہ سے نہیں جوڑتے جسے بلا شرکتِ غیرے مخصوص حقوق و مراعات حاصل ہوں۔ اُن کے مذہب کا نام کسی شخص یا مقام کے نام پر نہیں رکھا گیا۔ یہ تو ایک ماورائی مذہب ہے جو زمانے کی قید سے آزاد ہے۔

اس مذہب کا صحیح نام اسلام ہے اور اس پر ایمان رکھنے والوں کو مسلمان کہتے ہیں۔ مذہبی اصطلاح میں لفظ "اسلام" کا مطلب مشیتِ الٰہی کی اطاعت اور قانونِ الٰہی کی متابعت ہے۔ قرآن میں کی گئی تعریف کے مطابق مشیتِ الٰہی سراپا خیر و رأفت ہے اور اُس کا قانون فیض رسانی اور عدل و انصاف کا سرچشمہ ہے۔ کوئی بھی شخص جو اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اُس کے قانون کے تابع ہو جاتا ہے حالتِ اسلام میں ہے۔ انہی معنوں میں قرآن، حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے تمام مصدقہ انبیاءؑ کو مسلمان قرار دیتا ہے اور اُن کے مذاہب کو ایک ہی نام یعنی اسلام سے معنون کرتا ہے۔ پس مسلمان صرف حضرت محمدؐ ہی کا پیروکار نہیں بلکہ وہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور

اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے باقی تمام انبیاءؑ کی پیروی بھی کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ اسلام میں لفظ 'اللہ' کا مطلب سیدھی سادی زبان میں خدا ہی ہے لیکن اسلام اللہ کی وحدانیت اور اُسکے غیر فانی ہونے پر خاص زور دیتا ہے۔ وہی کائنات کا خالق، وہی تمام آقاؤں کا آقا اور وہی تمام بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ اسلام میں ناقابلِ معافی گناہ صرف ایک ہے اور وہ ہے خدا کے سوا کسی اور پر اعتقاد رکھنا یا اُس کے ساتھ کسی اور کو شریک ٹھہرانا۔ مسلمانوں کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی دعا جو ہر روز کئی بار دہرائی جاتی ہے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہے۔ یعنی (شروع کرتا ہوں) اللہ کے نام سے جو بڑا رحم کرنے والا اور مہربان ہے۔

اسلام میں ایمان کے بنیادی اجزا

ایک سچا اور صاحبِ ایمان مسلمان اسلام کے حسب ذیل اہم اور بنیادی عقائد پر یقین رکھتا ہے۔

۱۔ وہ ایک خدا کو مانتا ہے جو برتر و اعلیٰ ہے، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والا ہے، لامحدود ہے اور قوت والا ہے، رحیم اور مہربان ہے، پیدا کرنے والا اور پالنے والا ہے۔ یہ عقیدہ اسی صورت میں موثر ہو سکتا ہے جب خدا پر مکمل اعتماد اور بھروسا ہو، اس کی مشیئت کی اطاعت کی جائے اور اُس کی مدد کی امید رکھی جائے۔ یہ عقیدہ انسانی وقار کی حفاظت کرتا ہے، اُسے ہراس و یاس سے بچاتا ہے اور جرم اور تذبذب سے محفوظ رکھتا ہے۔ ہم قارئین سے گزارش کریں گے کہ سطورِ بالا میں اسلام کے مفہوم کی جو وضاحت کی گئی ہے اُسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔

۲۔ ایک سچا مسلمان خدا کے تمام پیغمبروں پر ایمان لاتا ہے اور اُن میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کی طرف اپنا پیغمبر یا نبی بھیجا۔ یہ پیغمبر نیکی کا راستہ دکھانے

والے اور حق و صداقت کے علمبردار تھے۔ انہیں خدا نے اس لیے منتخب کیا تھا کہ بنی نوع انسان تک اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچائیں اور اُس کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی تلقین کریں۔ انہیں تاریخ کے مختلف ادوار میں بھیجا گیا اور ہر معروف قوم کے پاس ایک یا زیادہ پیغمبر آئے۔ بعض مخصوص زمانوں میں اللہ تعالیٰ نے ایک ہی قوم کی طرف بیک وقت دو یا زیادہ پیغمبر بھی بھیجے۔ قرآن کریم میں ان میں سے پچیس پیغمبروں کا نام مذکور ہے۔ مسلمانوں کا ان سب پر ایمان ہے اور وہ انہیں خدا کے برحق پیغمبر مانتے ہیں ماسوائے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے تمام پیغمبروں کی حیثیت قومی یا مقامی تھی یعنی اُن کا پیغام کسی قوم یا خاص مقام کے باشندوں ہی کے لیے تھا۔ لیکن ان سب کا پیغام اور مذہب بنیادی طور پر ایک ہی تھا اور وہ تھا اسلام۔ کیونکہ ان سب کا منبع و سرچشمہ خدائے واحد کی ذات تھی اور ان سب کا مقصد بھی ایک ہی تھا اور وہ تھا اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے سیدھے راستے کی طرف بنی نوع انسان کی رہنمائی کرنا۔ یہ تمام کے تمام پیغمبر فانی تھے، انسان تھے، اُن پر اللہ تعالیٰ کی وحی نازل ہوتی تھی اور انہیں خدا نے کچھ مخصوص کاموں کی انجام دہی کے لیے مقرر کیا تھا۔ ان میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم سب سے آخری نبی اور سلسلہ نبوت کی عظیم الشان تکمیل ہیں۔ یہ کوئی خود ساختہ نظریہ نہیں اور نہ یہ عقیدہ کسی سہولت یا آسانی کی خاطر وضع کیا گیا ہے بلکہ دوسرے تمام اسلامی عقائد کی طرح یہ بھی ایک مستند اور منطقی سچائی ہے۔ مزید برآں یہاں بعض عظیم پیغمبروں کے اسماء مثلاً حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسمٰعیلؑ حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ اِن سب پر اللہ تعالیٰ کی سلامتی ہو اور اُس کی رحمتیں نازل ہوں۔ اللہ تعالیٰ قرآنِ پاک میں مسلمانوں کو حکم دیتا ہے:

مسلمانو! کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اُس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ کی طرف نازل ہوئی تھی اور جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دوسرے تمام پیغمبروں کو اُن کے رب کی طرف سے دی گئی تھی۔ ہم ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے مسلم ہیں۔

(سورہ ۲: آیت ۱۳۶، سورہ ۳: آیت ۸۴، سورہ ۴: آیات ۱۶۳ تا ۱۶۵، سورہ ۶ آیات ۸۴ تا ۸۷)

۳۔ اسلام کی دوسری بنیادی شق، جس کا اوپر ذکر ہوا ہے، کے نتیجے میں ایک سچا مسلمان اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ تمام آسمانی صحیفوں اور الہامات پر یقین رکھتا ہے۔ یہ الہامات اور صحیفے نورِ ہدایت تھے جو پیغمبروں پر نازل ہوئے تاکہ وہ اپنی اپنی اُمتوں کو اللہ تعالیٰ کا بتایا ہوا سیدھا راستہ دکھا سکیں۔ قرآنِ پاک میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت داؤدؑ اور حضرت عیسیٰؑ پر نازل کیے گئے صحیفوں کا بطورِ خاص ذکر آیا ہے۔ لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ قرآن ہونے سے بہت پہلے ان میں سے بیشتر صحیفے اور الہامات ضائع یا مسخ ہو چکے تھے۔ بعض کو فراموش یا نظر انداز کر دیا گیا تھا اور بعض کو غائب کر دیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی واحد مستند اور مکمل کتاب جو آج موجود ہے صرف قرآن ہی ہے۔ اصولی طور پر ایک مسلمان تمام سابقہ صحیفوں اور الہامات پر ایمان رکھتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ مکمل اور اصل شکل میں ہیں کہاں؟ ہو سکتا ہے وہ بحیرۂ مردار کی تہہ میں کہیں پڑے ہوں یا الہامی صحیفوں کے مزید طومار ابھی دریافت کرنا باقی ہوں۔ شاید ان کے بارے میں مزید معلومات اس وقت دستیاب ہو سکیں جب عیسائی اور یہودی ماہرینِ آثار سرزمینِ مقدس کی مسلسل کھدائی سے مکمل اور اصل دریافتوں کا انکشاف کریں گے۔

لیکن ایک مسلمان کو کسی قسم کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہے کیونکہ قرآن اپنی اصل اور مکمل شکل میں اُس کے ہاتھ میں موجود ہے۔ اس کا کوئی حصہ غائب نہیں اور مزید کسی حصے کے انکشاف کی توقع نہیں۔ اس کا استناد ہر شک و شبہ سے بالا ہے اور کسی سنجیدہ عالم یا مفکر نے اس کی اصلیت کا مسئلہ اُٹھانے کی جرأت یا ضرورت محسوس نہیں کی۔ خدا نے قرآن کو اس کی موجودہ شکل میں وضع کیا اور نازل کیا اور اسے ہر قسم کے بگاڑ اور حشو و زواید سے محفوظ رکھنا اپنے اوپر لازم کر لیا۔ یوں اسے مسلمانوں کو اس حالت میں دیا گیا کہ یہ دوسری کتابوں کو پرکھنے کے لیے ایک معیار یا اصول بن گیا۔ پس جو بات قرآن سے مطابقت رکھتی ہے اُسے ایک آسمانی صداقت کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور جو قرآن سے اختلاف رکھتی ہے اُسے یا تو مسترد کر دیا جاتا ہے یا معطل تصور کیا جاتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

واقعی ہم نے قرآن نازل کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں اور یقیناً ہم اس کی حفاظت کریں گے۔

(سورہ ۱۵ : آیت ۹، سورہ ۲ : آیات ۷۵ تا ۷۹، سورہ ۵ : آیات ۱۳، ۱۴، ۴۱، ۴۵، ۴۷، سورہ ۶ : آیت ۹۱، سورہ ۴۱ : آیت ۴۲)

۴- ایک سچا مسلمان اللہ تعالیٰ کے فرشتوں پر ایمان لاتا ہے۔ فرشتے خالصتہً روحانی اور عظیم الشان مخلوق ہیں اور اُن کی فطرت میں جسمانی خصوصیات مثلاً کھانے پینے سونے کو دخل نہیں۔ وہ جسدی خواہشات یا مادی ضروریات سے بالکل مبرا ہیں۔ وہ اپنے شب و روز اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزارتے ہیں۔ فرشتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور اُن میں سے ہر ایک کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک خاص فریضہ سونپا گیا ہے۔ اگر ہم انہیں ظاہری آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے تو اس سے اُن کے وجود کی لازمی طور پر نفی نہیں ہوتی۔ دنیا میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کو ہماری آنکھ

نہیں دیکھ سکتی یا جن تک ہمارے حواس کی رسائی ممکن نہیں۔ اس کے باوجود ہم اُن کی موجودگی پر یقین رکھتے ہیں۔ بہت سے مقامات ہیں جن کو ہم نے کبھی نہیں دیکھا اور بہت سی اشیاء ہیں مثلاً گیس، ایتھر وغیرہ جن کو ہم اپنی ظاہری آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے نہ ہم انہیں چھُو سکتے ہیں نہ چکھ سکتے ہیں نہ سُن سکتے ہیں۔ پھر بھی ہم اُن کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں۔ فرشتوں پر ایمان کا سبب یہ اسلامی اصول ہے کہ علم اور سچائی مکمل طور پر صرف حسی علم یا حسی ادراک تک محدود نہیں۔

(دیکھیے سورہ ۱۶، آیات ۴۹ تا ۵۰، سورہ ۲۱ آیات ۱۹ تا ۲۰، اس کے علاوہ اس باب کی شق ۲ میں دیے گئے حوالہ جات بھی ملاحظہ کیجیے)

۵۔ ایک سچّا مسلمان یومِ قیامت پر ایمان رکھتا ہے جب ہر شخص کو اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ یہ دنیا ایک دن اپنے اختتام کو پہنچے گی اور مُردے اپنی آخری اور منصفانہ آزمائش سے گزرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اس دنیا میں ہر وہ کام جو ہم کرتے ہیں، ہر نیت جو ہم رکھتے ہیں، ہر حرکت جو ہم سے سرزد ہوتی ہے، ہر خیال جو ہم اپنے ذہن میں لاتے ہیں، ہر لفظ جو ہم بولتے ہیں، ان سب کا شمار ہوتا ہے اور ہمارے اعمال نامے میں ان کا صحیح ریکارڈ محفوظ رہتا ہے۔ یومِ حساب یہ ریکارڈ ہمارے سامنے لایا جائے گا۔ جن لوگوں کے اعمال اچھے ہوں گے انہیں فیاضانہ طور پر انعام واکرام سے نوازا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی جنّت میں داخل کیا جائے گا اور جن کے اعمال بُرے ہوں گے انہیں سزا ملے گی اور جہنّم میں دھکیل دیا جائے گا۔ جنت اور دوزخ کی اصل نوعیت اور اُن کا صحیح احوال صرف خدا کو معلوم ہے۔ قرآنِ حکیم میں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں جنت اور دوزخ کا حال ملتا ہے لیکن اس کے لفظی معنوں پر نہیں جانا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جنت میں ایسی چیزیں ہیں جنہیں

کبھی کسی آنکھ نے نہیں دیکھا، کبھی کسی کان نے نہیں سنا اور کبھی کسی ذہن نے اُن کا تصور نہیں کیا۔ تاہم سچے مسلمان کا ایمان ہے کہ انسان کو نیک اعمال کے بدلے یقیناً صلہ دیا جائے گا اور انعام واکرام سے نوازا جائے گا اور بُرے اعمال کے بدلے سزا ملے گی۔ وہ دن انصاف کا دن ہوگا جب تمام حسابات قطعی طور پر چکائے جائیں گے۔

اگر کچھ لوگ خود کو بہت ہوشیار چالاک سمجھتے ہیں اور اُن کا خیال ہے کہ وہ اپنے غلط اعمال کے باوجود سزا سے بچ جائیں گے جس طرح وہ بعض اوقات دنیاوی قوانین کی سزا سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو وہ یقیناً غلطی پر ہیں۔ روزِ حساب وہ ایسا ہرگز نہیں کرسکیں گے۔ انہیں موقع پر ہی پکڑ لیا جائے گا اور وہ اپنا دفاع نہیں کرسکیں گے اور نہ کوئی وکیل یا حمایتی اُن کا ساتھ دے سکے گا۔ اُن کے تمام اعمال کو اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے اور اُس کے کارکن (فرشتے) اُن کے اعمال کا حساب رکھتے ہیں۔ اگر بعض لوگ خدا کی خوشنودی کے لیے نیک عمل کرتے ہیں اور اس عارضی دنیا میں انہیں اس کا بظاہر کوئی صلہ نہیں ملتا یا اُن کے کاموں کو تسلیم نہیں کیا جاتا تو بالآخر قیامت کے روز انہیں پورا پورا صلہ ملے گا اور اُن کے نیک کاموں کو تسلیم کیا جائے گا۔ روزِ حساب سب کے ساتھ پورا انصاف ہوگا۔

روزِ حساب پر یقین ہی ہماری دنیا کے بہت سے پیچیدہ مسائل کا حتمی اور تسلی بخش جواب ہے۔ بعض لوگ گناہ کرتے ہیں، خدا کو نظرانداز کر دیتے ہیں اور غیر اخلاقی سرگرمیوں میں ملوث ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ بظاہر اپنے کاروبار میں کامیاب نظر آتے ہیں اور خوشحال زندگی بسر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے برعکس بعض لوگ بہت نیک اور خدا ترس ہوتے ہیں لیکن انہیں ان کی مخلصانہ جدوجہد کا بظاہر بہت کم صلہ ملتا ہے اور اس دنیا میں انہیں بڑے

دکھ جھیلنے پڑتے ہیں۔ یہ مشاہدہ بہت پریشان کُن ہے اور بظاہر اللہ تعالیٰ کے انصاف سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اگر مجرم لوگ دنیاوی قانون کی زد سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور پھر اس کے نتیجے میں وہ زیادہ خوشحال ہو جاتے ہیں تو نیک لوگوں کیلئے کیا باقی رہ گیا؟ ان حالات میں اخلاق اور نیکی کو فروغ کس طرح ملے گا؟ نیکی کو صلہ دینے اور بُرائی کو پکڑنے کا کوئی تو طریقہ ہونا چاہیے۔ اگر اس زمین پر ایسا نہیں ہوتا، اور ہم جانتے ہیں کہ ہمیشہ یا فوری طور پر نہیں ہوتا، تو بالآخر کسی دن تو ایسا ہونا ہوگا۔ اُسی دن کا نام روزِ قیامت یا روزِ حساب ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس دنیا میں ظالموں اور غلط کاروں کو معاف کر دیا جاتے یا محرومُوں اور مظلوموں کو محض تسلی دینے پر اکتفا کیا جائے اور زیادتی کرنے والوں کو پھولنے پھلنے کا موقع دیا جائے بلکہ انعقادِ قیامت کے اعلان کا مقصد ہی صراطِ مستقیم سے انحراف کرنے والوں کو تنبیہ کرنا اور انہیں خبردار کرنا ہے کہ زود یا بدیر خدا کا انصاف قائم ہو کر رہے گا۔

۶۔ ایک سچے مسلمان کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کا علم زمانے کی قید سے ماورئی ہے۔ یعنی وہ ازل سے ابد تک ہر بات سے باخبر ہے۔ وہ منصوبہ بندی کرنے اور اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کی پوری قدرت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس دنیا سے بے تعلق نہیں ہے اور نہ غیر جانب دار ہے۔ اللہ کا علم اور اس کی طاقت ایسی صفات ہیں جو اُس کی وسیع و عریض سلطنت کو نظم و ضبط میں رکھنے کے لیے ہر وقت مستعد رہتی ہیں۔ اُسے اپنی تخلیق پر پورا پورا اختیار ہے۔ وہ حکمت والا اور مہربان ہے اور جو کچھ بھی وہ کرتا ہے اُس کے پیچھے ایک بامعنی مقصد کارفرما ہوتا ہے۔ اگر یہ نکتہ ہمارے ذہن نشین ہو جائے تو پھر جو کچھ بھی وہ کرتا ہے ہمیں خوشدلی سے قبول کر لینا چاہیے خواہ ہم اُس کے عمل کو کماحقہٗ سمجھنے میں ناکام رہے

ہوں یا اُسے اپنی سوچ کے مطابق غلط خیال کرتے ہوں۔ اس کی ذات پر ہمارا ایمان راسخ ہونا چاہیے اور جو کچھ بھی وہ کرتا ہے، ہمیں قبول کر لینا چاہیے کیونکہ ہمارا علم محدود ہے اور ہماری سوچ انفرادی یا شخصی میلانات پر مبنی ہوتی ہے جبکہ اُس کا علم لامحدود ہے اور وہ کائناتی بنیاد پر منصوبہ بندی کرتا ہے۔

یہ عقیدہ انسان کو تقدیر پرست یا مجبور محض نہیں بناتا بلکہ اس سے اللہ تعالیٰ کے معاملات اور انسان کی ذمہ داری کے درمیان ایک حدِ فاصل قائم ہو جاتی ہے۔ چونکہ ہم فطری طور پر محدود اور وابستۂ قیود ہیں اس لیے ہماری طاقت اور آزادی بھی محدود اور ایک خاص انتہا تک ہے۔ ہم ہر کام نہیں کر سکتے۔ یہ اُس کی نوازش اور مہربانی ہے کہ وہ ہمیں صرف انہی کاموں کے لیے ذمہ دار ٹھہراتا ہے جو ہم کرتے ہیں۔ وہ کام جو ہم نہیں کر سکتے یا وہ کام جو صرف اللہ تعالیٰ کرتا ہے ہماری ذمہ داری کے دائرے میں نہیں آتے۔ وہ منصف و عادل ہے اس لیے اُس نے ہمیں صرف محدود قوت عطا کی ہے جو ہماری معینہ فطرت اور محدود ذمہ داری سے مطابقت رکھتی ہے۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ کا بے پایاں علم جو وقت کی قید سے ماورا ہے اور اُس کی بے پناہ قوت جس سے وہ عظیم منصوبے بناتا ہے اور انہیں عملی جامہ پہناتا ہے ہمارے ان منصوبوں کے راستے میں ہرگز حائل نہیں جو ہم اپنے محدود دائرہ قوت میں رہتے ہوئے بنانے اور اُن پر عمل کرتے ہیں۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ ہمیں سوچنے، منصوبہ بندی کرنے اور بہترین راستہ اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے لیکن اگر نتائج ہماری خواہش کے مطابق برآمد نہیں ہوتے یا ہماری منصوبہ بندی کے مقاصد کی تکمیل نہیں ہوتی تو ہمیں اپنے عقیدے کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے نہ ہمیں ذہنی صدمے یا حوصلہ شکن پریشانیوں کا شکار ہونا چاہیے۔ ہمیں بار بار کوشش کرنی چاہیے اور اگر پھر بھی

نتائج تسلی بخش نہیں تو ہم جانتے ہی ہیں کہ ہم نے اپنی بہترین کوشش کرلی ہے اس لیے ہم نتائج کے ذمہ دار نہیں ٹھہرائے جا سکتے کیونکہ جو کام ہماری ہمّت اور ذمہ داری سے بالاتر ہے وہ صرف خدا کا معاملہ ہے۔ مسلمان اپنے ایمان کی اس شق کو عقیدۂ قضا و قدر کہتے ہیں جس کا دوسرے لفظوں میں صرف یہ مطلب ہے کہ خدا جس کا لامحدود علم وقت کی قید سے آزاد ہے واقعات کا پہلے سے علم رکھتا ہے اور ہر وقوعہ اللہ تعالیٰ کے علم کے عین مطابق رُونما ہوتا ہے۔

(حوالہ کے لیے دیکھیے قرآن مجید سورہ ۱۸: آیت ۲۹، سورہ ۴۱: آیت ۴۶
سورہ ۵۳: آیات ۳۲ تا ۶۲، سورہ ۵۴: آیت ۴۹، سورہ ۶۵، آیت ۳،
سورہ ۷۶: آیات ۳۰ تا ۳۱)

۷۔ ایک سچا مسلمان اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ خُدا کا تخلیقی عمل بامعنی ہے اور زندگی کا ایک اعلیٰ تر مقصد ہے جو اُس کی جسمانی ضروریات اور مادی سرگرمیوں سے ماورئی ہے۔ زندگی کا مقصد اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیں اپنی تمام تر زندگی مسلسل گوشہ نشینی اور مراقبے میں بسر کر دینی چاہیے۔ خدا کی عبادت سے مراد اُس کی معرفت حاصل کرنا، اُس سے محبت کرنا، اُس کے احکام بجالانا، زندگی کے ہر پہلو میں قانونِ الٰہی نافذ کرنا، نیکی اختیار کر کے اور بدی کو ترک کر کے اُس کی منشا پوری کرنا اور خدا کے ساتھ، اپنے ساتھ اور اپنے رفقار کے ساتھ انصاف کرنا ہے۔ خدا کی عبادت کا مطلب زندگی کو بھرپور طریقے سے گزارنا ہے نہ کہ اس سے فرار حاصل کرنا۔

مختصر یہ کہ خدا کی عبادت کا مطلب اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی اعلیٰ صفات پیدا کرنا ہے۔ یہ کوئی معمولی یا محض رسمی سی بات نہیں ہے نہ اسے مبالغہ آمیز سادگی

سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ اس میں حد درجہ جامعیت اور قطعیت پائی جاتی ہے۔ پس زندگی کا اگر کوئی مقصد ہے اور انسان کو اس مقصد کی تکمیل کے لیے پیدا کیا گیا ہے تو پھر وہ اس ذمہ داری سے گریز نہیں کرسکتا۔ وہ اپنے وجود سے انکار نہیں کرسکتا نہ وہ اپنے اہم کردار کو نظر انداز کرسکتا ہے جو اُسے اپنی زندگی میں ادا کرنا ہے۔ جب خدا اس پر کوئی ذمہ داری عائد کرتا ہے تو وہ اُس کیلیے ہر قسم کی مدد بھی فراہم کرتا ہے جس کی اُسے اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضرورت پڑ سکتی ہے۔ وہ اُسے ذہانت اور صحیح طرزِ عمل کے انتخاب کا اختیار دیتا ہے چنانچہ خدا انسان کو تلقین کرتا ہے کہ وہ اپنے وجود کے مقصد کی تکمیل کے لیے پوری کوشش کرے۔ اگر وہ ایسا کرنے میں ناکام رہتا ہے یا زندگی کا غلط استعمال کرتا ہے یا اپنے فرائض سے پہلوتہی کرتا ہے تو وہ اپنے غلط اعمال کے لیے خدا کے آگے ضرور جواب دہ ہوگا۔

(حوالہ کے لیے دیکھیے سورہ ۲۱ : آیات ۱۷ تا ۱۸ ، سورہ ۵۱ : آیات ۵۶ تا ۵۸ ، سورہ ۷۵ : آیت ۳۷)

۸۔ ایک سچے مسلمان کا ایمان ہے کہ انسان نظامِ فرقِ مراتب میں باقی تمام مخلوقات سے بلند تر مرتبے پر فائز ہے۔ اُسے یہ ممتاز اور فائق مقام اس لیے حاصل ہے کہ صرف وہی ایک ایسی مخلوق ہے جس میں عقلی صلاحیتیں، روحانی کیفیات اور اپنی پسند کے مطابق راہِ عمل منتخب کرنے کے اختیارات ودیعت کر دیے گئے ہیں لیکن جوں جوں اس کا مرتبہ بلند ہوتا جاتا ہے اُس کی ذمہ داری بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ وہ زمین پر نیابتِ الٰہی کے مرتبے پر فائز ہے۔ خدا جس شخص کو اپنے مستعد کارکن کی حیثیت میں مقرر کرتا ہے اُس کے پاس کچھ طاقت اور اختیار کا ہونا بھی لازمی ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ اُسے عزت و سالمیت بھی عطا کی گئی ہو۔

اسلام میں انسان کو اسی منصب سے نوازا گیا ہے۔ وہ ایک ایسی مخلوق ہرگز نہیں جو پیدائش سے موت تک ملامت کی سزاوار ہو بلکہ وہ ایک ایسی باوقار مخلوق ہے جو نیک اور اعلیٰ کارنامے انجام دینے کی صلاحیت سے مالا مال ہے۔ خدا نے اپنے تمام پیغمبر نسلِ انسانی میں سے ہی منتخب کیے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان قابلِ اعتماد ہے، اہل ہے اور نیکی کے لازوال خزانے حاصل کر سکتا ہے۔ (حوالہ کے لیے دیکھیے سورہ ۲: آیات ۳۰ تا ۳۴، سورہ ٦: آیت ١٦٥، سورہ ۷: آیت ۱۱، سورہ ۱۷: آیات ۷۰ تا ۷۲ اور ۹۰ تا ۹۵)

۹۔ ایک سچے مسلمان کا ایمان ہے کہ ہر شخص پیدائشی مسلمان ہے۔ اس سے مراد ہے کہ ہر شخص کی پیدائش مشیتِ الٰہی کے مطابق، اُس کے منصوبوں کی تکمیل میں اور اُس کے احکام کے تحت ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ ہر شخص میں روحانی صلاحیتیں اور ذہنی میلانات ودیعت کیے گئے ہیں جن کی بدولت وہ ایک اچھا مسلمان بن سکتا ہے بشرطیکہ اسلام تک اُس کی صحیح رسائی ہو جائے اور اُسے اپنی اندرونی سرشت کو ترقی دینے کا موقع مل جائے۔ بہت سے لوگ ہیں کہ اگر اُن کے سامنے اسلام کو صحیح طور پر پیش کیا جائے تو وہ اسے بلا تامل قبول کر لیتے ہیں کیونکہ جو لوگ اپنی اخلاقی اور روحانی ضروریات کے ساتھ ساتھ اپنی فطری امنگوں کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں اور زندگی کو، خواہ یہ زندگی انفرادی ہو یا معاشرتی، قومی ہو یا بین الاقوامی، اسے تعمیری، صحیح سالم اور بھرپور انداز میں بسر کرنا چاہتے ہیں، اُن کے لیے اسلام ایک الٰہی دستور کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام ایک کائناتی دین ہے جو اُس خدا کا بنایا ہوا ہے جو انسانی سرشت کو بنانے والا ہے اور وہی جانتا ہے کہ انسانی سرشت کے لیے کون سی چیز بہترین ہو سکتی ہے۔ (دیکھیے قرآن کا سورہ ۳۰: آیت ۳۰، سورہ ٦۴: آیات ۱ تا ۳، سورہ ۸۲:

آیات ۶ تا ۸)

۱۔ صحیح مسلمان کا ایمان ہے کہ ہر شخص گناہ سے پاک پیدا ہوتا ہے۔ اُس کے متعلق یہ دعویٰ بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ نیکیاں اپنے ساتھ وراثت میں لایا ہے۔ اُس کی شخصیت کوری کتاب کی مانند ہوتی ہے۔ جب وہ سُوجھ بُوجھ کی عمر کو پہنچتا ہے تو وہ اپنے اعمال اور نیتوں کے لیے جوابدہ ہوتا ہے بشرطیکہ اُس کی نشوونما نارمل ہوئی ہو اور وہ صحیح العقل ہو۔ انسان نہ صرف اُس وقت تک گناہوں سے پاک ہے جب تک وہ کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا بلکہ وہ اپنی ذمہ داری پر اپنے منصوبوں کے مطابق راہِ عمل اختیار کرنے میں بھی آزاد ہے۔ یہ دوہری آزادی یعنی ایک طرف پیدائشی طور پر ہر طرح کے گناہوں سے بریت اور دوسری طرف فعّال ہونے کی آزادی مسلمان کے ضمیر کو موروثی گناہ کے بھاری بوجھ سے آزاد رکھتی ہے۔ اس طرح اُس کی رُوح اور اس کا ذہن عقیدۂ گناہِ آدم (جس کے مطابق تمام نسل انسانی فطرتی طور پر گنہگار ہے) کی خلش سے محفوظ رہتا ہے۔

آزادی کا یہ اسلامی تصور اس اصول پر مبنی ہے کہ خدا بہترین انصاف کرنے والا ہے اور فرد اپنے اعمال کے لیے براہِ راست خدا کے آگے جوابدہ ہے۔ ہر شخص کو اپنا بوجھ خود اٹھانا ہے اور اپنے اعمال کا حساب خود چکانا ہے کیونکہ کوئی بھی شخص کسی دوسرے کے گناہوں کا کفّارہ ادا نہیں کر سکتا۔ اس لیے مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر حضرت آدمؑ اوّلین گناہ کے مرتکب ہوئے تھے تو اس گناہ کا کفارہ ادا کرنا بھی اُن کی اپنی ذمہ داری تھی۔ یہ مفروضہ قائم کر لینا کہ خدا حضرت آدمؑ کو معاف نہیں کر سکتا تھا اس لیے اُس نے آدمؑ کے گناہ کا کفّارہ کسی اور شخص سے کرایا، یا یہ فرض کرنا کہ حضرت آدمؑ نے بخشش کی دعا نہیں کی یا دعا تو کی لیکن اللہ تعالیٰ نے قبول نہیں کی، یہ سب باتیں رحمتِ خداوندی اور اُس کے انصاف کے برعکس اور

اُس کی معاف کر دینے کی صفت اور اختیارِ مطلق کے صریحاً خلاف ہیں۔ اس بنیاد مفروضے کو درست ماننا انسانی فہم و فراست سے بے باکانہ سرکشی اور خدا کے بنیادی تصور کی برملا خلاف ورزی کے مترادف ہے۔

(دیکھیے شق نمبر۹ میں دیے گئے حوالہ جات، قرآن کا سورہ ۴۱: آیت ۴۶، سورہ ۴۵: آیت ۱۵، سورہ ۵۳: آیات ۳۱ تا ۴۲، سورہ ۷۴: آیت ۳۸۔ گناہ کا تصور جو ذیل کی سطور میں بیان کیا گیا ہے)

عقلی بنیاد پر اور قرآنی استناد کے مطابق مسلمان کا ایمان ہے کہ حضرت آدمؑ نے اپنے کیے کا احساس کر لیا اور خدا سے اپنے گناہ کی مغفرت چاہی جس طرح کوئی دوسرا ہوشمند گنہگار کر سکتا تھا۔ اسی بنیاد پر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ خُدا نے، جو غفور رحیم ہے، حضرت آدمؑ کو بخش دیا۔

(قرآن کا سورہ ۲: آیات ۳۵ تا ۳۷، سورہ ۲۰: آیات ۱۱۷ تا ۱۲۲)

اس لیے مسلمان یہ عقیدہ قبول نہیں کر سکتا کہ حضرت آدمؑ اور بعد میں آنیوالی پوری نسلِ انسانی کو قصوروار ٹھہرایا گیا اور کسی کو معاف نہیں کیا گیا یہاں تک کہ حضرت عیسیٰؑ اس دنیا میں ظہور پذیر ہوئے اور انہوں نے حضرت آدمؑ اور نسلِ انسانی کے گناہوں کا کفارہ ادا کیا۔ چنانچہ مسلمان اس ڈرامائی داستان کو اپنے عقیدے میں داخل نہیں کر سکتا کہ حضرت عیسیٰؑ کی تصلیب سے حضرت آدمؑ اور تمام نسلِ انسانی کو ہمیشہ کے لیے گناہوں سے نجات مل گئی اور اُن کی بخشش ہو گئی۔

یہاں ایک بات کی وضاحت کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ قارئین مندرجہ بالا سطور سے کوئی غلط نتیجہ اخذ نہ کر لیں۔ مسلمان اس بات پر یقین نہیں رکھتا کہ حضرت عیسیٰؑ کو اُن کے دشمنوں نے صلیب پر چڑھا دیا تھا کیونکہ حضرت عیسیٰؑ کی تصلیب کے عقیدے کی بنیاد جس قدر رحمتِ خداوندی اور اُس کے انصاف سے بعید ہے اسی

قدر انسانی منطق اور انسانی وقار کے خلاف بھی ہے۔ عیسائیوں کے عقیدے کو تسلیم نہ کر کے مسلمان کسی طرح بھی حضرت عیسیٰؑ کے احترام میں کمی نہیں کرتا اور نہ حضرت عیسیٰؑ کے اُس بلند رتبے میں کوئی تخفیف ہوتی ہے جو اسلام نے ان کو دیا ہے۔ اس سے مسلمان کے اس عقیدے میں بھی فرق نہیں پڑتا کہ آپؑ خدا کے ایک سربرآوردہ پیغمبر تھے۔ اس کے برعکس مسلمان عقیدۂ تصلیب کو رد کر کے حضرت عیسیٰؑ کو زیادہ عزت و احترام دیتا ہے اور اُن کے اصل پیغام کو اسلام کے ایک لازمی حصے کے طور پر تسلیم کرتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مسلمان ہونے کے لیے خدا کے تمام پیغمبروں پر ایمان لانا اور کسی فرق کے بغیر تمام پیغمبروں کا احترام کرنا ضروری ہے۔ اسلام میں حضرت عیسیٰؑ کے مقام اور مرتبے پر بحث اس کتاب کے کسی آئندہ باب میں ہوگی۔

۱۱۔ ایک صحیح مسلمان کا عقیدہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے بتاتے ہوئے راستے پر چل کر ہی اپنی بخشش و نجات کا سامان کر سکتا ہے۔ اس سے مراد ہے کہ بخشش کے لیے ایمان اور عمل دونوں ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں۔ ایمان بغیر عمل کے اسی طرح ناکافی ہے جس طرح عمل بغیر ایمان کے۔ بالفاظِ دیگر کوئی شخص اُس وقت تک نجات نہیں پا سکتا جب تک اُس کا خدا پر ایمان ایک اثر آفریں قوت بن کر اُس کی زندگی میں رچ بس نہ جائے اور اس کے عقائد حقیقت کا روپ نہ دھار لیں۔ یہ بات ایمان کی دوسری اسلامی شقوں کے عین مطابق ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ محض زبانی عقیدے کو قبول نہیں کرتا۔ جہاں تک ایمان کے ان حصوں کا تعلق ہے جو عمل کا تقاضا کرتے ہیں، مسلمان ان سے کبھی بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کی خاطر عمل نہیں کر سکتا نہ کسی کے لیے شفاعت کر سکتا ہے۔ (حوالے کے لیے دیکھیے قرآن کا سورہ ۱۰ : آیات ۹ تا ۱۰، سورہ ۱۸ : آیت ۳۰ ، سورہ ۱۰۳ : آیات ۱ تا ۳)

ایک سچے مسلمان کا ایمان ہے کہ خدا اُس وقت تک کسی شخص کو جوابدہ نہیں ٹھہراتا جب تک وہ اُسے صحیح راستہ نہیں دکھا دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے بہت سے پیغمبر مبعوث فرمائے اور صحیفے بھیجے اور واضح کر دیا کہ رشد و ہدایت اور انتباہ کے بغیر کسی کو سزا کا مستوجب نہیں ٹھہرایا جائے گا۔ لہٰذا اگر کسی شخص تک اللہ تعالیٰ کا پیغمبر یا اُس کا پیغام نہیں پہنچا یا اگر کوئی شخص فاتر العقل ہے، تو اُسے ہدایاتِ خداوندی کی خلاف ورزی کرنے پر جوابدہ نہیں ہونا پڑے گا۔ ایسا شخص صرف ان امور کے لیے جوابدہ ہوگا جو اُس کی سمجھ بوجھ کے مطابق اُسے کرنے چاہئیں تھے لیکن اُس نے نہیں کیے۔ لیکن جو شخص دیدہ دانستہ اور عمداً قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کرتا ہے یا صراطِ مستقیم سے انحراف کا مرتکب ہوتا ہے اُسے اپنے ان غلط اعمال کی وجہ سے سزا ملے گی۔

(قرآن کا سورہ ۴، آیت ۱۶۵، سورہ ۵ : آیت ۱۶ و ۲۱،
سورہ ۱۷ : آیت ۱۵)

یہ نکتہ ہر مسلمان کے لیے بہت اہم ہے۔ دنیا میں بہت سے لوگ ہیں جنہوں نے اسلام کے بارے میں کچھ نہیں سُنا اور اُن کے پاس اس بارے میں معلومات حاصل کرنے کے ذرائع بھی نہیں۔ ممکن ہے ایسے لوگ دیانت دار ہوں اور اگر اسلام تک اُن کی رسائی ہو جائے تو وہ اچھے مسلمان بن جائیں۔ اگر وہ اسلام سے متعارف نہیں اور ان کے پاس اسلام سے متعارف ہونے کے ذرائع بھی نہیں تو وہ اسلام قبول نہ کرنے کے لیے جوابدہ نہیں ہوں گے۔ اُن کی بجائے وہ مسلمان جو ان تک اسلام کا پیغام پہنچا سکتے تھے، اسلام کی دعوت نہ دینے اور انہیں اسلام سے متعارف نہ کرانے کے سبب خدا کے آگے جوابدہ ہوں گے۔ دنیا کے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ نہ صرف زبانی طور پر اسلام کی تبلیغ کرے بلکہ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اسلام کے مطابق ڈھالے۔

(حوالے کے لیے دیکھیے قرآن کا سورہ ۳: آیت ۱۰۴، سورہ ۱۶ : آیت ۱۲۵)

۱۳۔ ایک سچے مسلمان کا ایمان ہے کہ انسانی سرشت میں، جو خدا نے تخلیق کی ہے شر یا بدی کے مقابلے میں خیر یا نیکی کا مادہ زیادہ ودیعت کیا گیا ہے اور اصلاحِ احوال کی کامیابی کا امکان مایوس کن ناکامی کے امکان سے زیادہ ہے۔ یہ عقیدہ اس حقیقت سے اخذ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کچھ کام تفویض کیے ہیں اور اس کی رہنمائی کے لیے پیغمبروں کو الہامات دے کر بھیجا ہے۔ اگر انسان فطری طور پر ناقابلِ اصلاح ہوتا تو اللہ تعالیٰ حکمتِ کاملہ سے اُسے کیونکر فرائض تفویض کر سکتا تھا اور اوامر و نواہی کا حکم دے سکتا تھا؛ خدا ایسا کیوں کرتا اگر یہ سب بے سُود ہوتا۔ یہ حقیقت کہ خدا انسان کا خیال رکھتا ہے اور اُس کے مفاد کی حمایت کرتا ہے، اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان نہ تو مجبورِ محض ہے اور نہ وہ ناقابلِ اصلاح ہے بلکہ وہ طبعاً خیر یا نیکی کی طرف زیادہ مائل ہے۔ اگر خدا پر پختہ یقین ہو اور انسان پر اعتماد کیا جائے تو موجودہ زمانے میں بھی معجزات سرزد ہو سکتے ہیں۔ یہ بات صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ قرآنِ حکیم کے متعلقہ حصوں کا بنظرِ غائر مطالعہ اور ان کے معانی پر غور و خوض کیا جائے۔

۱۴۔ ایک سچے مسلمان کا عقیدہ ہے کہ مذہب کی اندھا دھند پیروی اور اسے بلا حجت قبول کرنے سے ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ صاحبِ ایمان ہونے کے لئے ذہنی طور پر قائل اور مطمئن ہونا ضروری ہے۔ اگر ایمان کا مقصد عمل کو تحریک دینا ہے اور نجات کے لیے ایمان اور عمل لازم و ملزوم ہیں تو پھر ضروری ہے کہ ایمان غیر متزلزل اطاعت پذیری اور یقینِ کُلّی کی بنیاد پر مستحکم ہو اور اس میں فریب یا جبر کا کوئی شائبہ نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں اگر کوئی شخص اپنی خاندانی روایات کے سبب مسلمان کہلاتا ہے یا کسی دباؤ کے تحت یا کورانہ تقلید سے اسلام قبول کرتا ہے تو وہ خدا کی نظر میں مکمل مسلمان نہیں ہے مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنا ایمان یقینِ کلی اور اطاعت کی بنیاد پر مستحکم کریں اور اپنے

دل و دماغ میں کسی شک یا غیر یقینی کیفیت کو راہ نہ پانے دیں۔ اگر کوئی سمجھتا ہے کہ اس کا ایمان پختہ نہیں تو خدا اُسے دعوت دیتا ہے کہ وہ فطرت کی کُھلی کتاب کا مطالعہ اور اس کی تحقیق کرے، اپنی استدلالی صلاحیت بروئے کار لائے اور قرآن کی تعلیمات پر غور و تدبر کرے۔ اس پر لازم ہے کہ وہ حتمی صداقت کی تلاش اس وقت تک جاری رکھے جب تک وہ اسے پا نہیں لیتا۔ اور اگر وہ اہل اور مخلص ہے تو یقیناً اس صداقت کو پانے میں کامیاب ہو جائے گا۔

(حوالہ کے لیے دیکھئے قرآن کا سورہ ۲، آیت ۱۷۰، سورہ ۴۳: آیات ۲۲ تا ۲۴)

غور و تدبر اور سچائی کی تلاش کی یہ کُھلی دعوت ہی ہے جس کی وجہ سے اسلام ایک مسلمان سے ایقان و اطاعت کا تقاضا کرتا ہے اور اندھا دھند پیروی کا مخالف ہے۔ اسلام اُس شخص کو جو واقعی کھرا اور سنجیدہ مفکر کہلانے کے اہل ہے حکم دیتا ہے کہ وہ سچائی کی تلاش میں اپنی تمام تر صلاحیتیں استعمال کرے۔ لیکن اگر کوئی شخص پوری اہلیت نہیں رکھتا یا اپنے بارے میں غیر یقینی کیفیت میں مبتلا ہے تو پھر اُسے اپنی سوچ بچار کا عمل اسی حد تک جاری رکھنا چاہیے جہاں تک اس کی محدود اہلیت اس کی اجازت دیتی ہے۔ ایسے شخص کے لیے مناسب ہوگا کہ وہ مذہب کے صرف مستند ذرائع، جو اپنے طور پر کافی ہیں، پر انحصار کرے اور ان ذرائع کے بارے میں ناقدانہ رویہ اختیار نہ کرے کیونکہ وہ ایسا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اصل نکتہ یہ ہے کہ کوئی شخص اُس وقت تک سچا مسلمان نہیں کہلا سکتا جب تک اس کا ایمان پختہ اور کلی یقین پر مبنی اور ذہن ہر قسم کے شکوک و شبہات سے آزاد نہ ہو۔ چونکہ اسلام اُسی وقت مکمل ہوتا ہے جب یہ پختہ یقین اور آزادیِ انتخاب پر مبنی ہو اس لیے اسے کسی پر بالجبر ٹھونسا نہیں جا سکتا کیونکہ خدا اس جبری ایمان کو قبول نہیں کرے گا نہ اللہ کے نزدیک یہ حقیقی اسلام ہی ہے جو انسان کے اندر سے نہیں پھُوٹتا یا اُس کے آزادانہ اور پختہ

یقین کا نتیجہ نہیں۔ اور چونکہ اسلام عقیدے کی آزادی کی ضمانت دیتا ہے اس لیے مسلم ممالک میں بہت سے غیر مسلم فرقوں کو ہمیشہ اپنے عقیدے اور ضمیر کے مطابق زندگی گزارنے کی پوری آزادی حاصل رہی ہے اور اب بھی ہے۔ مسلمان اس فیاضانہ رویّے کا مظاہرہ اس لیے کرتے ہیں کہ اسلام مذہب کے معاملے میں جبر یا دباؤ کی ممانعت کرتا ہے۔ اسلام ایک ایسی روشنی ہے جس کا انسان کے اندر سے پھوٹنا ضروری ہے کیونکہ انتخابِ مذہب کی آزادی جوابدہی کے لیے ایک بنیادی چیز ہے لیکن اس آزادی سے والدین اپنی اُن ذمہ داریوں سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتے جو بچوں سے متعلق ان پر عائد کی گئی ہیں نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ اگر وہ اپنے بچوں کی روحانی فلاح سے بے پروا رہیں گے تو انہیں معاف کر دیا جائے گا۔ درحقیقت انہیں اپنے بچوں کو ایک پختہ اور فعال عقیدہ قائم کرنے میں ہر ممکن مدد دینی چاہیے۔

مستحکم بنیادوں پر ایمان کے قیام کے کئی ایک مسالک ہیں۔ ایک روحانی مسلک ہے جو زیادہ تر قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پر مبنی ہے۔ ایک عقلی راستہ بھی ہے جو بالآخر خدائے بزرگ و برتر پر ایمان کی طرف لے جاتا ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ روحانی مسلک میں عقلیت کا فقدان ہے۔ اسی طرح عقلی مسلک بھی روحانی جذبے سے یکسر خالی نہیں۔ درحقیقت یہ دونوں مسالک ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اور ایک دوسرے پر نہایت خوشگوار طریقے سے اثرانداز ہوتے ہیں۔ اب مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کافی حد تک عقلی خوبیوں سے متصف ہے تو وہ عقلی اور روحانی مسالک میں سے کوئی ایک مسلک یا دونوں اختیار کر سکتا ہے اور صحیح نتیجے تک پہنچنے کے لیے پُراعتماد رہ سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص گہری تحقیق کی اہلیت نہیں رکھتا یا اُسے اپنی قوتِ استدلال پر بھروسہ نہیں تو وہ خود کو روحانی مسلک تک محدود رکھ سکتا ہے اور مذہب کے مستند ذرائع سے جو علم حاصل ہو اس پر اکتفا کر سکتا ہے۔ بات

یہ ہے کہ کوئی شخص حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے لیے خواہ روحانی مسلک اختیار کرے یا عقلی طریقہ یا بیک وقت دونوں مسلک اپنائے، وہ ہر صورت میں بالآخر خدا پر ایمان لانے کی منزل کو پہنچے گا۔ یہ تمام مسالک مساوی اہمیت کے حامل ہیں اور اسلام ان سب کو قبول کرتا ہے اور جب ان مسالک کو صحیح رُخ دے دیا جاتا ہے تو یہ تمام راستے ایک ہی منزل کی طرف جاتے ہیں یعنی خدائے واحد کی ذات پر ایمان لانا۔

(حوالے کے لیے دیکھیے قرآن کا سورہ ۵: آیات ۱۶ تا ۱۷، سورہ ۱۲: آیت ۱۰۹، سورہ ۱۸: آیت ۳۰، سورہ ۵۶: آیت ۸۰)۔

۱۵۔ ایک صحیح مسلمان کا عقیدہ ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے جسے حضرت جبرائیلؑ کی وساطت سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا گیا۔ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف مواقع پر تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا۔ قرآنی آیات کے نزول کا مقصد بعض سوالات کا جواب دینا، بعض مسائل کا حل بتانا، بعض تنازعات کا فیصلہ کرنا اور حق تعالیٰ کی صداقت اور دائمی مسرت کی طرف انسان کی بہترین رہنمائی کرنا تھا۔ قرآن کا ہر حرف اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اس میں پوشیدہ ہر آواز ندائے حق کی صحیح گونج ہے۔ قرآن اسلام کا اوّلین اور سب سے زیادہ مستند ماخذ ہے۔ یہ عربی زبان میں نازل ہوا۔ یہ اب بھی عربی میں ہے اور آئندہ بھی اپنی اصلیت اور مکملیت کے ساتھ عربی زبان میں ہی رہے گا کیونکہ قادرِ مطلق نے قرآن کی حفاظت کرنے، اسے انسان کے لیے مستقل ہدایت بنانے اور اسے مسخ ہونے سے بچانے کا تہیہ کر رکھا ہے۔

حوالے کیلیے دیکھیے قرآن کا سورہ ۴: آیت ۸۲، سورہ ۱۵: آیت ۹، سورہ ۱۷: آیت ۹، سورہ ۴۱: آیات ۴۱ تا ۴۴، سورہ ۴۲: آیت ۷، ۵۲ تا ۵۳، سورہ ۱۷: آیت ۹)

اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا جو وعدہ کر رکھا ہے اس کی سچائی کے ثبوت میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ انسانی تاریخ کا واحد صحیفۂ آسمانی ہے جو اپنے اسلوب حتیٰ کہ

رموزِ اوقاف میں بھی کسی معمولی سے معمولی تبدیلی کے بغیر اپنی اصل اور مکمل شکل میں اب تک محفوظ ہے۔ قرآن پاک کی نگارش، سورتوں کی تدوین اور متن کی سالمیت کی تاریخ نہ صرف مسلمانوں بلکہ دیانتدار اور سنجیدہ غیر مسلم اہل علم و اہل فکر کے اذہان میں بھی ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس پر کسی بھی عقیدے سے تعلق رکھنے والے عالم نے، جسے اپنے علم اور دیانت داری کا پاس ہے، کبھی شک کا اظہار نہیں کیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ایسا قائم و دائم معجزہ ہے کہ اگر تمام بنی نوع انسان مل کر کوشش کریں تب بھی وہ قرآن کی کسی مختصر سورت یا اس کے کسی مختصر حصے جیسی تحریر بھی تخلیق نہیں کر سکتے۔

(قرآن کا سورہ ۲ : آیات ۲۲ تا ۲۴، سورہ ۱۱، آیات ۱۳ تا ۱۴، سورہ ۱۷، آیات ۸۸ تا ۸۹)

۱۶۔ ایک سچے مسلمان کے عقیدے کے مطابق قرآن اور احادیثِ رسولؐ دو الگ الگ چیزیں ہیں اور ان میں واضح فرق موجود ہے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے جبکہ رسولِ خدا کی احادیث قرآن پاک کی عملی تاویلات ہیں۔ رسولِ خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضہ قرآنِ پاک کو دوسروں تک اسی حالت میں پہنچانا جس حالت میں آپ نے وصول کیا، اس کی وضاحت کرنا اور اس کی تعلیمات پر مکمل عمل کرنا تھا۔ آپ کی وضاحتیں اور عملی مظاہرے احادیثِ رسولؐ کہلاتے ہیں۔ ان احادیث کو اسلام کا دوسرا ماخذ کہا جاتا ہے۔ احادیث اور اولین ماخذ یعنی قرآن (جو ایک معیار یا کسوٹی کا درجہ رکھتا ہے) کا آپس میں مکمل طور پر ہم آہنگ ہونا نہایت ضروری ہے۔ اگر آنحضرتؐ کی کسی حدیث اور قرآن میں کوئی تضاد یا عدمِ مطابقت دیکھنے میں آئے تو مسلمان صرف قرآن کو صحیح تصور کرتے ہیں اور باقی ہر چیز پر اعتراض کر سکتے ہیں کیونکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول یا فعل قرآن سے متناقض یا خلاف نہیں ہو سکتا۔

تبصرہ

اسلام میں ایمان کی اہم اور بنیادی شعبوں کا ذکر کرتے ہوئے ہم نے جان بوجھ کر موضوع سے متعلق عام روایتی طور پر پائے جانے والے نظریہ سے ہٹ کر بات کی ہے۔ ہم نے ایمان کو پانچ یا چھ شقوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس کی بجائے ہم نے ممکن حد تک زیادہ سے زیادہ اصول شامل کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہاں اس بات کی وضاحت کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کی تمام شقیں جو اوپر بیان کی گئی ہیں قرآنی تعلیمات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پر مبنی ہیں۔ ایمان کی ان شقوں کی بنیاد پر روشنی ڈالنے کے لیے مزید قرآنی آیات اور احادیثِ رسولؐ کا حوالہ دیا جا سکتا تھا لیکن جگہ کی کمی کے باعث ایسا نہیں کیا گیا تاہم کسی بھی موضوع پر مفصل مطالعہ کے لیے قرآن اور احادیثِ رسولؐ سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

اِس باب میں ہم نے مغربی ممالک میں رائج تکنیکی قسم کی مذہبی اصطلاحات مثلاً "قضاد قدر" "تقدیر پرستی"، "جبر و اختیار" وغیرہ کا استعمال کم سے کم کیا ہے۔ ہم نے اس قسم کی اصطلاحات کے استعمال سے جہاں تک ممکن تھا عمداً اجتناب کیا کیونکہ ہم الجھاؤ اور تکنیکی مشکلات سے بچنا چاہتے تھے۔ زیادہ تر تکنیکی اصطلاحات جو غیر عرب لوگ عموماً مذہبی موضوعات پر بحث کے دوران استعمال کرتے ہیں، جب اُن کا اطلاق اسلام پر کیا جائے تو مغالطہ پیدا ہوتا ہے اور غلط تاثرات اُبھرتے ہیں۔ اگر ہم بھی غیر ملکی مذہبی اصطلاحات استعمال کرتے اور اُن کا اطلاق اسلام پر کرتے تو یہ کتاب اپنا مقصد کھو دیتی اور اسلام کی وضاحت کے لیے ہمیں بہت سے تبصرے شامل کرنا پڑتے۔ اس کے لیے مزید جگہ کی ضرورت ہوتی جس کا اہتمام ہم موجودہ وسائل میں نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ ہم نے ضروری باتوں کی وضاحت سادہ و سلیس زبان میں کر دی ہے۔ کتاب کے باقی حصوں میں بھی حتی الوسع یہی اسلوب اپنایا جائے گا۔

باب دوم

اسلام کے بنیادی تصورات

تصورِ ایمان

بعض لوگوں کا خیال ہوگا کہ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اُس کا آخری پیغمبر تسلیم کرلیتا ہے تو وہ مسلمان ہوجاتا ہے۔ لیکن محض یہ عقیدہ ایمان کے مکمل اور صحیح مفہوم سے بہت بعید ہے۔ اسلام میں ایمان کا صحیح مفہوم کسی طرح بھی برائے نام یا محض رسمی قبولیت نہیں ہوسکتا۔ اسلام میں ایمان اُس مسرت آگیں کیفیت کا نام ہے جو مثبت عمل اور تعمیری تصورات نیز متحرک اور مؤثر فعالیتوں سے حاصل ہوتی ہے۔

قرآن پاک اور رسول اللہ کی احادیث میں ان مطلوبہ فعالیتوں کی تعریف موجود ہے۔ اسلام کے یہ دو بڑے ماخذ ہمیں وہ معیار بھی مہیا کرتے ہیں جن کی مدد سے بامعنی ایمان پروان چڑھتا ہے، لہٰذا درحقیقت صاحبِ ایمان لوگ وہی ہیں جن میں مندرجہ ذیل خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

۱۔ جو ایمان لاتے ہیں خدا پر، اُس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر جن کی تکمیل قرآنِ پاک پر ہوئی، اُس کے پیغمبروں پر جن میں سب سے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، روزِ قیامت پر، خدا کے حتمی اور لامحدود علم اور اُس کی عقلِ کُل پر۔

۲۔ جو ہمیشہ خدا پر بھروسا کرتے ہیں اور اس کی ذات پر اُن کا ایمان غیر متزلزل ہے۔

۳۔ جو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس میں سے جو اللہ نے دولت، زندگی، صحت،

علم، تجربے یا کسی اور شکل میں انہیں دیا ہے۔

۴۔ جو روزانہ باقاعدگی سے نماز ادا کرتے ہیں نیز ہفتہ وار اور سالانہ اجتماعی عبادات میں شریک ہوتے ہیں۔

۵۔ جو اپنے دینی واجبات (خیرات یا زکوٰۃ) مستحقین (جن میں افراد اور ادارے شامل ہیں) کو ادا کرتے ہیں۔ یہ دینی واجبات سال بھر کی اصل آمدنی یا کاروباری مال کی کل مالیت، جو تمام اخراجات اور واجبات منہا کرنے کے بعد بچ جائے، کا کم از کم اڑھائی فی صد ہیں۔

۶۔ جو نیکی کی ہدایت کرتے ہیں اور برائی کے خلاف جنگ کرتے ہیں اور اس مقصد کے لیے وہ اپنے تمام جائز اور قانونی ذرائع بروئے کار لاتے ہیں۔

۷۔ جو اللہ اور اُس کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتے ہیں، جب قرآن پڑھا جائے تو ان کی قوتِ ایمانی میں اضافہ ہوتا ہے اور اللہ کا نام لیا جائے تو اُن کے دِل پر رقّت طاری ہو جاتی ہے۔

۸۔ جو خدا اور اس کے رسول حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم سے دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر محبت کرتے ہیں اور اپنے ساتھیوں سے صرف اللہ کی خاطر محبّت کرتے ہیں۔

۹۔ جو اپنے نزدیک کے اور دُور کے ہمسایوں سے محبت رکھتے ہیں اور اپنے مہمانوں خصوصاً اجنبیوں کے ساتھ حقیقی مہربانی سے پیش آتے ہیں۔

۱۰۔ جو سچ بولتے ہیں اور اچھی گفتگو کرتے ہیں، جھوٹ اور فضول باتوں سے اجتناب کرتے ہیں۔

اس بحث سے واضح ہو جاتا ہے کہ اگر ایمان کا صحیح مفہوم ذہن نشین ہو جائے تو پھر اسلام ایک مؤثر، تعمیری اور فعّال قوت بن کر زندگی کے ہر پہلو میں نفوذ کر جاتا ہے۔ اسلام کے مطابق سچا ایمان انسان کی روحانی کیفیت اور مادی حالت پر قطعیت کے ساتھ اثر انداز

ہوتا ہے۔ یہ انسان کے نجی اور معاشرتی رویے، سیاسی طرزِ عمل اور اقتصادی زندگی پر بھی اپنے قطعی اثرات مرتب کرتا ہے۔ یہاں قرآنِ پاک میں سے کچھ اقتباسات دیے جا رہے ہیں۔ ان سے واضح ہو جائے گا کہ قرآن سچے مومنین کی خوبیاں کس طرح بیان کرتا ہے۔ قرآن میں اس قسم کا ذکر متعدد بار آیا ہے۔

سچے اہلِ ایمان تو وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات اُن کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر اعتماد رکھتے ہیں۔ جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے اُن کو دیا ہے اُس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔ اُن کے لیے ان کے رب کے پاس بڑے درجے ہیں، قصوروں سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے۔ (سورہ ۸ : آیات ۲ تا ۴)

مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں۔ زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہو کر رہے گی، یقیناً اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے۔ ان مومن مردوں اور عورتوں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ انہیں ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اُن سدا بہار باغوں میں اُن کے لیے پاکیزہ قیام گاہیں ہوں گی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کی خوشنودی انہیں حاصل ہوگی۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔" (سورہ ۹ : آیات ۷۱ تا ۷۲)

حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لائے پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ وہی سچے لوگ ہیں۔ (سورہ ۴۹ : آیت ۱۵)

ان قرآنی حوالہ جات کے علاوہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی متعدد احادیث بھی ہیں جن سے ایک سچے مسلمان کی خصوصیات سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مثال کے طور پر آپ کا فرمان ہے

"تم میں سے کوئی اُس وقت تک صحیح مسلمان نہیں جب تک وہ اپنے مسلمان بھائیوں کے لیے بھی وہی کچھ پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے"۔

تین خوبیاں مضبوط ایمان کی علامت ہیں اور جو کوئی اپنے اندر یہ خوبیاں پیدا کر لیتا ہے وہ واقعی ایمان کی صحیح لذت سے بہرہ مند ہو سکتا ہے۔ وہ خوبیاں یہ ہیں۔

۱۔ خدا اور اس کے رسول حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم سے دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر محبت کرنا۔

۲۔ بنی نوع انسان سے صرف اللہ کی خاطر محبت کرنا۔

۳۔ ارتداد یعنی ترکِ ایمان کو اسی طرح برا سمجھنا اور اس سے باز رہنا جس طرح کسی شخص کو اگر آگ میں ڈالا جائے تو وہ اسے ناپسند کرتا ہے اور اپنے بچاؤ کے لیے پوری مزاحمت کرتا ہے۔

جو شخص اللہ پر اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہے اُسے سختی سے ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنے ہمسائے کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچائے، اپنے مہمانوں خصوصاً اجنبی مہمانوں سے مہربانی سے پیش آئے، ہمیشہ سچ بولے اور جھوٹ سے احتراز کرے۔

اوپر جن قرآنی آیات اور احادیث کا حوالہ دیا گیا ہے اس سے ملتی جُلتی اور بھی بہت سی آیات اور احادیث ہیں تاہم یہ بات ذہن میں رہے کہ ان حوالہ جات میں قرآن اور احادیث کا اصل مفہوم ادا نہیں ہوا اور نہ یہ ہو سکتا ہے کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی دوسری زبان کا کوئی مترادف لفظ ٹھیک وہی معنی دے جو قرآنی آیات و احادیث رسولؐ کے اصل عربی متن سے ادا ہو سکتے ہیں۔ اس کی وجہ بالکل سادا ہے۔ کوئی بھی مفسر خواہ کتنا متبحر اور زبان پر عبور رکھنے والا ہو قرآن کی روحانی قوت اور اس کا سحر انگیز اثر کسی دوسری زبان میں منتقل نہیں کر سکتا۔ قرآن یکتا و لاثانی ہے۔ قادرِ مطلق نے اسے ایسا ہی بنایا ہے اور اس سے ملتی جُلتی کوئی تحریر تخلیق کرنا انسانی تصور اور اختیار سے باہر ہے۔ اس ضمن میں جو کچھ قرآن کے بارے میں درست ہے وہ

احادیثِ رسولؐ کے بارے میں بھی ایک خاص حد تک درست ہے کیونکہ قرآن کے بعد آپؐ کے اقوال ہی سب سے زیادہ جامع، قاطع اور فصیح[1] ہیں۔

نیکی (بِرّ) کا تصور

اسلام ہمیشہ سطحی نظریات و رسومات، بے جان قسم کے رسم و رواج کی پابندیوں اور بے اثر عقائد کے خلاف خبردار کرتا ہے۔ ایک نصِ قرآنی میں اللہ تعالیٰ نیکی کا مکمل مفہوم اسی طرح بیان کرتا ہے۔

نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یومِ آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اُس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔ اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اُسے وفا کریں، اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں۔ یہ ہیں راست باز لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں۔ (سورہ ۲ : آیت ۱۷۷)

اس آیتِ کریمہ میں نیک شخص کی توصیف نہایت خوب صورت اور واضح انداز میں کی گئی ہے۔ ایک نیک شخص کو تمام مفید قواعد و ضوابط کی پابندی کرنی چاہیئے۔ اُسے خلوصِ نیت سے اللہ سے محبت اور اللہ کی خاطر اپنے ساتھیوں سے محبت کرنی چاہیئے۔ اس ضمن میں چار باتیں بہت اہم ہیں۔

۱۔ ہمارا ایمان سچا اور پرخلوص ہونا چاہیئے۔

۲۔ ہمیں اپنے ایمان کا مظاہرہ خیراتی کاموں میں حصہ لے کر اور اپنے رفقار کے ساتھ شفقانہ

---

[1] دیکھیے باب اوّل کا حاشیہ ۲

رویہ اپنا کر کرنا چاہیے۔

۳۔ ہمیں خیراتی اداروں اور سماجی بہبود کی تنظیموں کو امداد فراہم کر کے اچھے شہری ہونے کا ثبوت دینا چاہیے۔

۴۔ ہمیں ہر قسم کے حالات میں ثابت قدم اور غیر متزلزل رہنا چاہیے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نیکی محض خالی خولی دعووں کا نام نہیں بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ مضبوط ایمان اور مسلسل عمل کی بنیاد پر استوار ہو، انسان کی سوچ اور عمل پر حاوی ہو اور اس کی باطنی اور ظاہری زندگی اور اس کے انفرادی اور اجتماعی معاملات کا احاطہ کرے۔ جب نیکی کا اسلامی اصول قائم ہو جاتا ہے تو یہ فرد کو ہر قسم کے حالات میں امن و سکون، معاشرے کو ہر سطح پر سلامتی، قوم کو استحکام اور بین الاقوامی برادری کو اعتبار اور ہم آہنگی سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ اگر لوگ نیکی کے اسلامی تصور کو جامۂ عمل پہنائیں تو زندگی کس قدر پُرامن اور پُرلطف بن سکتی ہے۔ خالقِ رحیم و کریم پر ایمان اور اِن قابلِ احترام مقاصد کی تکمیل سے زیادہ اور کون سی چیز اطمینان اور تسکین کا باعث ہو سکتی ہے۔ اس سے بڑھ کر انسانی کام اور کیا ہو سکتا ہے کہ محکوموں کو پریشانیوں سے نجات دلا دی جائے، استحصال زدگان کے دکھوں میں کمی کر دی جائے اور بے بس لوگوں کی ضروریات پوری کر دی جائیں۔ اس سے زیادہ خوش اسلوبی اور دیانت داری اور کیا ہو سکتی ہے کہ وعدوں کا پاس کیا جائے، ضمیر کی محافظت کی جائے اور اخلاقی سالمیت کو قائم رکھا جائے اور اس سے زیادہ روحانی مسرت اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ سب کچھ باقاعدگی سے، حسبِ معمول اور اللہ تعالیٰ کی محبت میں ہو۔

تقویٰ کا تصوّر

اوپر جو کچھ ایمان اور نیکی کے ضمن میں کہا گیا ہے اُسے بالعموم تقویٰ کے بارے میں بھی درست سمجھنا چاہیے۔ ایمان کی طرح تقویٰ بھی کوئی خالی خولی دعویٰ یا زبانی اعتراف کا نام نہیں بلکہ یہ اس

سے کہیں زیادہ سنجیدہ مسئلہ ہے۔ اسلامی تصورات کی وضاحت کے لیے قرآن ہمارے لیے بہترین ماخذ ہے اور جب یہ متقیوں کے بارے میں کچھ بتاتا ہے تو اُن کا ذکر اس طرح کرتا ہے۔

(یہ وہ لوگ ہیں) جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو رزق ہم نے اُن کو دیا ہے، اُس میں سے خرچ کرتے ہیں جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں اُن سب پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے رب کی طرف سے راہِ راست پر ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔

(سورہ ۲: آیات ۳ تا ۵)

(اور متقی وہ لوگ ہیں) جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں خواہ بدحال ہوں یا خوش حال، جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں ــــ ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں ــــ اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام اُن سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انہیں یاد آجاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں ــــ کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہو ــــ اور وہ کبھی دانستہ اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کی جزا اُن کے رب کے پاس یہ ہے کہ وہ اُن کو معاف کر دے گا اور ایسے باغوں میں انہیں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ کیسا اچھا بدلہ ہے نیک اعمال کرنے والوں کے لیے۔

(سورہ ۳: آیات ۱۳۴ تا ۱۳۶)

ان آیات کے مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تقویٰ ہم سے اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ہم خدا کی صداقت اور زندگی کی حقیقت کا ادراک کر کے اپنے ذہن کا صحیح استعمال کریں؛

ہر قسم کے اچھے بُرے حالات میں اللہ کے راستے میں خرچ کر کے دولت کا صحیح استعمال کریں اور نماز قائم کر کے اپنی روحانی اور جسمانی صلاحیتوں کا صحیح استعمال کریں۔ نیز تقویٰ ہم سے اس امر کا بھی متقاضی ہے کہ ہم اپنے غصّے اور جذبات پر قابو پانے کے لیے ضبطِ نفس سے کام لیں، دوسروں کی تقصیریں معاف اور برداشت کرنے میں عالی ظرفی کا مظاہرہ کریں اور ارتکاب گناہ کی صورت میں احساسِ ندامت کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت شدّت سے محسوس کریں۔ متّقی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان سچّے اور نفیس اعتقادات رکھتا ہو، ثابت قدم اور صاحبِ کردار ہو، پُرعزم اور حوصلہ مند ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خدادوست ہو۔ تقویٰ، نیکی اور بامعنی ایمان کا ایک دوسرے کے ساتھ گہرا تعلق ہے اور ان سب کا راستہ ایک ہی ہے کیونکہ یہ ایسی صفات ہیں جو اسلام کی طرف رہنمائی کرتی ہیں اور انسانی ذات کی تعمیر و تشکیل کر کے اُسے سچا مسلمان بناتی ہیں۔

تصورِ نبوت

خدائے رحیم و کریم نے تاریخ کے مختلف ادوار میں بہت سے نبی بھیجے۔ ہر معروف قوم پر ایک یا ایک سے زیادہ نبی مبعوث ہوئے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کے تمام انبیاء علیہم الصّلوٰۃ والسّلام اعلیٰ کردار کے مالک اور لائقِ تکریم تھے۔ اُن کو اللہ تعالیٰ نے نبوت عطا کی تھی اور انہیں اس کام کے لیے بطورِ خاص منتخب کیا تھا کہ وہ اُس کا پیغام بنی نوعِ انسان تک پہنچائیں۔ اُن کی دیانت داری اور سچائی، اُن کی فراست و فطانت اور صلابتِ کردار ہر شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ وہ اس اعتبار سے معصوم تھے کہ کسی گناہ یا قانونِ الٰہی کی خلاف ورزی کے مرتکب نہیں ہوئے تاہم ممکن ہے کہ بشر ہونے کے ناتے اُن سے بعض انسانی معاملات اور فیصلوں میں غیر ارادی طور پر کچھ غلطیاں سرزد ہوئی ہوں۔ یہ ضروری نہیں کہ اُن کے شخصی نوعیت کے فیصلے ہمیشہ درست ثابت ہوتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء کی بعثت اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ آسمان اور زمین اور خدا اور انسان کے مابین ایک مستحکم رشتہ موجود ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا یہ مطلب ہے کہ انسان قابلِ اصلاح ہے اور اُس میں خیرِ کثیر موجود ہے۔ نبوت کا مقصد یہ ہے کہ انسان جو کچھ پہلے سے جانتا ہے یا مزید جان سکتا ہے اُس کی توثیق کی جائے اور جو کچھ وہ نہیں جانتا یا اپنے محدود ذرائع سے نہیں جان سکتا اُس سے اُسے واقف کرایا جائے۔ نبوت کا ایک مقصد خدا کے صراطِ مستقیم کو تلاش کرنے، نیکی اختیار کرنے اور برائی ترک کرنے میں انسان کی مدد کرنا بھی ہے۔

نبوت فی الحقیقت خدا کا اپنی مخلوقات سے محبت کا صریح اظہار اور عقیدہ و عمل کے صحیح مداستے کی جانب انسانوں کی رہنمائی کا منہ بولتا عزم ہے۔ نبوت اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ اللہ انسانوں کے ساتھ انصاف کرنا چاہتا ہے کیونکہ وہ نبوت ہی کے ذریعے انسان کو پہلے صحیح ہدایت بھیجتا ہے اُس کے بعد اُسے اپنے اعمال کے لیے ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ وہ اپنے انبیاء کے ذریعے انسان کو غلط اعمال کے خطرات سے خبردار کرتا ہے اور اگر انسان ان خطرات کو محسوس کرنے میں ناکام رہے تو پھر اُس کا طرزِ عمل اُس کے لیے سزا کا باعث بنتا ہے۔ یہ طریقۂ کار اللہ تعالیٰ کی محبت اور انصاف کے عین مطابق ہے اور انسان کو اللہ تعالےٰ کے آگے جوابدہ ہونے کے اہل بناتا ہے۔

نبوت کا سرچشمہ اور تمام انبیاء کو مبعوث کرنے والی ہستی ایک اور صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی ذات۔ ان تمام انبیاء کا مقصد اللہ کے احکام بجا لانا، انسان کو اللہ اور اس کی تعلیمات سے متعارف کرانا، سچائی اور نیکی قائم کرنا، انسان کو اُس کی تخلیق کا صحیح مقصد بتانا اور زندگی کو بامقصد طریقے سے گزارنے میں اس کی مدد کرنا ہے۔ یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جس کی وجہ سے اہلِ ایمان انبیاء کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے اور اُن کی تعلیمات کو یک رنگ اور حتمی خیال کرتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ مسلمان تمام الہامی صحیفوں اور خدا کے فرستادہ تمام انبیاء پر ایمان رکھتے ہیں جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے

تصورِ حیات

زندگی اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اُس کے علم کی ایک بیّن دلیل اور اس کے فن اور قدرت کا ایک روشن پرتو ہے۔ وہ زندگی دینے والا اور اس کی تخلیق کرنے والا ہے۔ کوئی شے محض کسی حادثے کی پیداوار نہیں ہے۔ کوئی شخص خود اپنی مرضی سے پیدا نہیں ہوتا اور نہ وہ کسی دوسرے شخص کی تخلیق کرتا ہے۔ زندگی ایک لائقِ احترام اور بیش بہا اثاثہ ہے اور کوئی ذی ہوش اور نارمل شخص اسے اپنی خوشی سے ضائع کرنا پسند نہیں کرتا حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو انتہائی مایوسی کے عالم میں خودکُشی کا ارتکاب کرتے ہیں آخری لمحات میں اپنی زندگی کی بازیابی کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں اور زندہ رہنے کا ایک اور موقع حاصل کرنے کی حسرت کرتے ہیں۔ زندگی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ امانت ہے اور وہی اُسے واپس لینے کا حق رکھتا ہے۔ کسی دوسرے شخص کو زندگی ختم کرنے کا حق حاصل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام ہر قسم کی خودکُشی اور کسی بھی طرح سے اپنی ذات کو نقصان پہنچانے کی ممانعت کرتا ہے اور کسی عزیز کی موت پر صبر اور ایمان کا سہارا لینے کی ہدایت کرتا ہے۔ جب کسی شخص کو سزا کے طور پر قتل کیا جاتا ہے تو اس کی زندگی بحق خدا اور قانونِ الٰہی کے مطابق لی جاتی ہے۔

جب خدا انسان کو زندگی عطا کرتا ہے تو وہ اُسے منفرد خوبیاں اور عظیم صلاحیتیں یونہی بیکار ہیں ودیعت نہیں کر دیتا اور نہ وہ خاص ذمہ داریاں ہی جو وہ انسان پر عائد کرتا ہے بے معنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ مقصدِ حیات کے حصول اور منزل تک پہنچنے میں انسان کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان زندگی گزارنے کا تخلیقی فن سیکھے اور الہامی ہدایت کے مطابق زندگی سے بھرپور طور پر لطف اندوز ہو۔ زندگی اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اور انسان اس کا امین ہے۔ اُسے چاہیے کہ وہ اس امانت کا استعمال کرتے وقت دیانت داری اور ہوشیاری سے کام لے، منشائے الٰہی کا لحاظ رکھے اور اپنی اُن ذمہ داریوں کا احساس کرے جن کے لیے اُسے خدا کے

آگے جواب دہ ہونا ہے۔

زندگی کو ایک سفر سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو ایک خاص نقطے سے شروع ہوتا ہے اور ایک خاص منزل تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے۔ اس دنیا کی زندگی ایک عبوری مرحلہ ہے اور موت کے بعد کی ابدی زندگی کا محض ایک تعارف ہے۔ اس سفر میں انسان ایک مسافر ہے اور اُسے صرف اس چیز سے تعلق رکھنا چاہیے جو اُس کی آئندہ زندگی میں کام آنے والی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اُسے ہر وہ نیکی کرنی چاہیے جو وہ کر سکتا ہے اور کسی بھی لمحے دائمی زندگی میں منتقل ہونے کے لیے اُسے پوری طرح تیار رہنا چاہیے۔ اُسے روئے زمین پر اپنی زندگی کو ایک موقع سمجھنا چاہیے جو اُسے اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ اسے بہترین طریقے سے گزارے جبکہ وہ ایسا کر سکتا ہے کیونکہ جب اُس کے کُوچ کا وقت آتا ہے تو وہ اسے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ٹال سکتا۔ جب انسان کی زندگی کی میعاد ختم ہو جاتی ہے تو اُس کے پاس اتنی مہلت نہیں ہوتی کہ وہ اس کا استعمال کر سکے یا اس میں توسیع کر سکے۔ چنانچہ زندگی کا بہترین استعمال یہ ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق بسر کیا جائے اور اسے مستقبل کی دائمی زندگی کے لیے ایک محفوظ سفر بنایا جائے۔ چونکہ زندگی آخری منزل تک پہنچنے کا ایک بہت ہی اہم ذریعہ ہے اس لیے اسلام نے قواعد و ضوابط کا ایک مکمل نظام دے دیا ہے تاکہ انسان جان سکے کہ اُسے کیا اپنانا ہے اور کیا چھوڑنا ہے۔ کون سا کام کرنا ہے اور کس کام سے باز رہنا ہے۔ تمام انسان اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انہیں اُسی کی طرف لوٹنا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک نہایت جامع اور حکیمانہ قول میں انسان کو ہدایت کی ہے کہ وہ اس زندگی میں خود کو ایک ایسا اجنبی یا مسافر تصور کرے جو اپنے سفر کے ایک مرحلے میں اس دنیا سے گزر رہا ہے۔

تصوّرِ مذہب

پوری تاریخِ انسانی میں مذہب کو غلط طور پر سمجھا اور استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ کچھ لوگ دوسروں کا استحصال کرنے اور اُن پر تشدّد برتنے کے لیے مذہب کو ایک ذریعہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی ذاتی اغراض کی خاطر مذہب کو حیلہ بنا کر جانب داری اور ایذا رسانی کا شیوہ اپناتے ہیں۔ بعض لوگ خواص اور عوام ہر دو پر قوّت اور غلبہ حاصل کرنے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے مذہب کا سہارا لیتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ مذہب کے نام پر بے جواز جنگیں لڑی گئیں، سوچ اور ضمیر کی آزادی کو کچلا گیا، سائنسدانوں کو ایذائیں دی گئیں، فرد کو اُس کے حقِ بلوغت سے محروم کیا گیا اور انسان کے عزّ و وقار کی کھلم کھلا توہین و تذلیل کی گئی۔ مذہب کے نام پر ہی عالمِ انسانیت کو ظلم و ناانصافی کا نشانہ بنایا گیا جس کے نتیجے میں خود مذہب کو بھی سخت نقصان پہنچا۔

یہ تاریخی حقائق ہیں جن سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہی مذہب کا اصل کردار ہے اور کیا مذہب کا صحیح راستہ یہی ہے؟ کیا مذہب کا یہ مقصد ہو سکتا تھا؟ ان سوالوں کا غیر متنازعہ جواب نفی میں ہے۔ دنیا میں بہت سے مذاہب ہیں اور ہر مذہب کا دعویٰ ہے کہ وہی اور صرف وہی واحد سچا مذہب ہے۔ ہر مذہب کے بارے میں یہی خیال کیا جاتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے انسان کی صحیح رہنمائی کے لیے نازل ہوا ہے لیکن یہ دعوے بنی نوعِ انسان کو خدائے رحمان و رحیم کے ایک آفاقی سائبان تلے یکجا کرنے اور ایک عالمی برادری کے رشتے میں منسلک کرنے کی بجائے ایک دوسرے کو جھٹلاتے ہیں، انسانوں میں تفرقہ ڈالتے ہیں اور ہر دوسرے مذہب کے خلاف معاندانہ ردِ عمل پیدا کرتے ہیں۔ یہ صورتِ حال ایک غیر جانب دار مبصّر کو الجھن میں ڈال دیتی ہے اور شاید اُسے تمام مذاہب سے متنفّر کر دیتی ہے۔

مذہب کا جو تصوّر اسلام نے دیا ہے وہ اپنے وسیع معنوں میں بالکل منفرد ہے۔ یہ درست ہے کہ بنیادی طور پر انسان کی فطرت اور خاص انسانی ضروریات ہر زمانے میں ایک سی رہتی ہیں

یہ نظریہ ہمیں ایک خاص نتیجے پر پہنچاتا ہے اور وہ یہ کہ ایک اور صرف ایک خدا کی جانب سے نازل ہونے والا صحیح مذہب صرف ایک ہے جو ہر زمانے کے بڑے انسانی مسائل سے عہدہ برآ ہوتا ہے۔ یہ مذہب اسلام ہے لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ اسلام کا پیغام لانیوالے صرف حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم ہی نہیں تھے بلکہ نبی آخر الزماں سے پہلے مبعوث ہونے والے تمام انبیاء نے اسلام ہی کی تعلیم دی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور دوسرے تمام انبیاء کے سچے پیروکار سب کے سب مسلم کہلاتے ہیں۔ لہٰذا اسلام ہی ہمیشہ خدا کا سچا عالمی مذہب رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا کیونکہ خدا ایک اور ناقابلِ تبدیل ہے کیونکہ انسانی فطرت اور بڑی انسانی ضروریات زمانہ، علاقہ، نسل، عمر یا دوسری باتوں کے لحاظ کے بغیر بنیادی طور پر ایک سی ہیں۔

اگر اس نکتے کو ذہن میں رکھا جائے تو اسلامی نظریہ کے مطابق مذہب انسان کی صرف روحانی یا ذہنی ضرورت ہی نہیں بلکہ یہ ایک معاشرتی یا عالمی ضرورت بھی ہے۔ مذہب انسان کو ورطۂ حیرت میں ڈالنے کے لیے نہیں بلکہ اس کی رہنمائی کے لیے ہے۔ یہ انسان کی تحقیر کے لیے نہیں بلکہ اُس کی اخلاقی فطرت کو بلندی و سرفرازی بخشنے کے لیے ہے۔ یہ انسان کو کسی مفید چیز سے محروم کرنے، اُس پر بار ڈالنے یا اُس کی صلاحیتوں کو دباتے کے لیے نہیں بلکہ اُس کے لیے صحت مند سوچ اور صحیح عمل کے غیر مختتم خزانے کھولنے کے لیے ہے۔ یہ اُسے تنگ حدود میں جکڑنے کے لیے نہیں بلکہ اُسے سچائی اور خیر کی بے کراں وسعتوں سے ہمکنار کرنے کے لیے ہے۔ مختصر یہ کہ سچا مذہب انسان کو خدا شناس، خود شناس اور کائنات شناس بناتا ہے۔ ان سطور میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ مذہب کے دائرۂ کار کی تعریف میں کسی طرح بھی مبالغہ آرائی نہیں ہے ہم ذیل کی سطور میں اس کی مزید وضاحت کیے دیتے ہیں۔

اگر سچے مذہب کے مقصد کا احتیاط سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ مذہب انسان کی روحانی اور اوسط درجے کی مادی ضروریات کی تسکین کرتا ہے۔ اُس کی ذہنی الجھنوں اور نفسیاتی

پیچیدگیوں کی گرہ کشائی کرتا ہے۔ اُس کی جبلتوں اور امنگوں کو بلندی عطا کرتا ہے۔ اُس کی خواہشات کو منضبط کرتا ہے اور زندگی کی روش کو ضابطے میں لاتا ہے۔ خدا، جو کہ کائنات کی سب سے بڑی سچائی ہے کی معرفت عطا کرتا ہے۔ خود شناسی کا شعور دیتا ہے۔ اسرارِ حیات کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ فطرتِ انسانی کا علم عطا کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ کائنات اور دوسرے انسانوں کے ساتھ اُسے کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ مذہب نیکی و بدی اور صحیح و غلط کے درمیان تمیز کرنا سکھاتا ہے، رُوح کو برائی سے پاک کرتا ہے، ذہن کو شکوک سے نجات دلاتا ہے، کردار کی تعمیر کرتا ہے۔ لیکن یہ تمام مقاصد اُس وقت حاصل ہوتے ہیں جب انسان پورے خلوص سے مذہب کے بتائے ہوئے روحانی فرائض اور دنیوی ضوابط کی پابندی کرتا ہے۔

دوسری طرف ایک سچا مذہب امید اور صبر، سچائی اور دیانت داری، خیر اور احسان اور ہمت و برداشت کی تعلیم دیتا ہے اور اس سلسلے میں اس کی تربیت کرتا ہے۔ یہ وہ خوبیاں ہیں کہ زندگی گزارنے کے عظیم فن میں مہارت حاصل کرنے کے لیے ان کی ضرورت پڑتی ہے۔ مزید برآں سچا مذہب انسان کو ہر قسم کے خوف اور روحانی شکست و ریخت سے محفوظ رکھتا ہے اور اُسے اللہ کی مدد اور اُس کے ناقابلِ انقطاع رشتے کا یقین دلاتا ہے۔ یہ انسان کو امن اور تحفظ دیتا ہے اور اُس کی زندگی کو با معنی بناتا ہے۔

سو یہ ہے وہ سب کچھ جو ایک سچا مذہب عالمِ انسانیت کے لیے کر سکتا ہے اور اسلام مذہب کا یہی تصور پیش کرتا ہے اور وہ مذہب جو انسان کو اِن ثمرات سے بہرہ ور کرنے میں ناکام رہے اسلام نہیں ہے بلکہ وہ مذہب ہی نہیں ہے۔ اور وہ شخص جو مذہب سے یہ فوائد حاصل نہ کر سکے اُس کا مذہب یا خدا سے کوئی رشتہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں بجا ارشاد فرماتا ہے:

> اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ اس دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے اُن لوگوں نے اختیار کیے جنہیں کتاب دی گئی تھی، ان کے اس طرزِ عمل

کی کوئی وجہ اس کے سوا نہ تھی کہ انہوں نے علم آجانے کے بعد آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کے لیے ایسا کیا اور جو کوئی اللہ کے احکام و ہدایات کی اطاعت سے انکار کر دے، اللہ کو اس سے حساب لینے کچھ دیر نہیں لگتی۔

(سورہ ۳ : آیت ۱۹)

اس فرماں برداری (اسلام) کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا۔

(سورہ ۳ : آیت ۸۵)

تصورِ گناہ

انسانی زندگی کا سب سے زیادہ تکلیف دہ پہلو دنیا میں گناہ یا بدی کا مسئلہ ہے۔ ایک عام عقیدے کے مطابق گناہ کی ابتدا آدم اور حوا سے اس زمانے میں ہوئی جب وہ جنت میں رہتے تھے۔ یہ واقعہ اُن کے زمین پر اُتارے جانے کا سبب بنا۔ اس کے بعد سے نسلِ انسانی کو جرم، رسوائی اور پریشانی سے منسوب کر دیا گیا۔

اس سارے مسئلے میں اسلام کا پیش کردہ نقطۂ نظر بالکل منفرد اور جداگانہ ہے۔ یہ نقطۂ نظر کسی دوسرے معروف مذہب نے اختیار نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

"پھر ہم نے آدم سے کہا کہ "تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں رہو اور یہاں بفراغت جو چاہو کھاؤ مگر اُس درخت کا رُخ نہ کرنا ورنہ ظالموں میں شمار ہو گے۔ آخر کار شیطان نے ان دونوں کو اُس درخت کی ترغیب دے کر ہمارے حکم کی پیروی سے ہٹا دیا اور انہیں اس حالت سے نکلوا کر چھوڑا جس میں وہ تھے۔ ہم نے حکم دیا کہ "اب تم یہاں سے اُتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہیں ایک خاص وقت تک زمین میں

ٹھہرنا اور وہیں گزر بسر کرنا ہے۔" اُس وقت آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کی، جس کو اُس کے رب نے قبول کر لیا کیونکہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

ہم نے کہا کہ "تم سب یہاں سے اُتر جاؤ۔ پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے، اُن کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا۔

(سورہ ۲: آیات ۳۵ تا ۳۸، سورہ ۷: آیات ۱۹ تا ۲۵، سورہ ۲۰: آیات ۱۱۷ تا ۱۲۳)

یہ علامتی واقعہ بڑی اہمیت کا حامل ہے اور اس سے بہت سے اسرار و رموز کی نقاب کشائی ہوتی ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ انسان نامکمل ہے اور خواہشات ہمیشہ اُس کے تعاقب میں رہتی ہیں خواہ اُسے جنت میں ہی رکھا جائے، لیکن گناہ یا غلطی کے ارتکاب سے، جیسا کہ آدم اور حوا سے ہوا، ضروری نہیں کہ انسانی دل مردہ ہو جائے، روحانی اصلاح کی گنجائش نہ رہے یا اخلاقی تربیت کا امکان ختم ہو جائے۔ اس کے برعکس انسان میں قدرتی طور پر اتنا شعور پایا جاتا ہے کہ وہ اپنے گناہوں اور خامیوں کا احساس کر سکتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ یہ معلوم کرنے کی اہلیت رکھتا ہے کہ گناہ کے ارتکاب کے بعد اُسے اپنی رہنمائی کے لئے کہاں اور کس سے رجوع کرنا ہے پھر سب سے زیادہ اہم یہ حقیقت ہے کہ اللہ اُن لوگوں کی مخلصانہ پکار سننے اور جواب دینے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہے جو اُسے مدد کے لیے پکارتے ہیں۔ وہ اتنا مہربان اور رحم کرنے والا ہے کہ اُس کی بخشش ہمہ گیر اور اُس کی رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔ (سورہ ۷: آیت ۱۵۶) آدم و حوا کے واقعہ سے ایک انکشاف یہ ہوتا ہے کہ جنس یا وراثت کی بنیاد پر جرم یا گناہ میں امتیاز کرنا روحِ اسلام کے خلاف ہے۔

اسلامی تعلیمات میں گناہِ آدم یا موروثی جرم کے تصور کی کوئی گنجائش نہیں۔ قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے مطابق ہر انسان کو پاکیزگی کی فطری حالت میں پیدا کیا گیا ہے (سورہ ۳۰؛ آیت ۳۰) یعنی ہر شخص پیدائشی طور پر اسلام یا بالفاظِ دیگر اللہ تعالیٰ کی مشیت اور قانون کے تابع ہوتا ہے۔ پیدائش کے بعد انسان جو کچھ بھی بنتا ہے اُس میں بیرونی اثرات یا ماحولی عوامل کار فرما ہوتے ہیں۔ اسی بات کو جدید نظریے کی روشنی میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ فطرتِ انسانی مطابقت پذیر ہے۔ معاشرتی عمل خاص طور پر گھریلو ماحول انسانی شخصیت کی تشکیل اور اُس کے اخلاق کی تعمیر میں فیصلہ کُن کردار ادا کرتا ہے۔ اس لیے فرد کی آزادیٔ انتخاب کی نفی نہیں ہوتی اور نہ وہ اپنی ذمّہ داری سے مستثنیٰ ہوتا ہے بلکہ پیدائشی طور پر ہر قسم کے گناہ سے پاک صاف ہونے کا نظریہ اُسے موروثی جرم یا فطری گناہ کے بھاری بوجھ سے آزاد رکھتا ہے۔

قرآن مجید کے مطابق خدا کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک منصف، حکمت والا، رحم کرنے والا، مہربان اور ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ اُس نے انسان کی تخلیق اُس میں اپنی روح پھونک کر کی (سورہ ۱۵: آیت ۲۹، سورہ ۳۲: آیت ۹، سورہ ۶۶: آیت ۱۲) چونکہ خدا سراسر خیر ہے اور اس کی رُوح جو کہ بالکل مکمل ہے اور چونکہ انسان کی تخلیق میں اللہ کی روح شامل ہے اس لیے انسان میں لازمی طور پر خالقِ کائنات کی روحِ خیر کا کچھ نہ کچھ حصہ شامل ہے یہی وجہ ہے کہ انسان میں روحانی آرزوئیں پائی جاتی ہیں لیکن دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس لیے تخلیق کیا ہے کہ وہ اس کی عبادت کرے۔ وہ خدا کے برابر، اُس کا حریف، اس کی تجسیم یا اس کی کسی صفت کا مکمل نمونہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان تخلیقی اعتبار سے خواہ کتنا ہی مکمل اور نیک ہو وہ خالقِ کائنات کی فضیلت اور کاملیت کے آگے ہیچ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انسان میں اللہ تعالیٰ کی صفات موجود ہیں لیکن یہ صفات انسان کی محدود فطرت، محدود اہلیت اور محدود ذمہ داری کے مطابق ایک خاص حد

اور تناسب میں پائی جاتی ہے اس بحث سے انسان کی نا تکمیلیت اور خطا پذیری کی وضاحت ہو گئی ہو گی۔

تاہم انسان کی یہ نا تکمیلیت اور خطا پذیری کسی گناہ یا جرم کے مترادف نہیں۔ کم از کم اسلام میں تو ایسا نہیں ہے۔ اگر انسان نا مکمل ہے تو خدا نے اُسے اس کی خامیوں اور کوتاہیوں کا شکار ہونے کے لیے بے یار و مددگار نہیں چھوڑا۔ اُسے الہامات کے ذریعے صاحبِ اختیار بنایا گیا ہے، فہم و خرد کے ذریعے سہارا دیا گیا ہے۔ پسندیدہ راستہ اختیار کرنے کی آزادی دے کر اُسے استحکام بخشا گیا ہے اور معاشرتی اور نفسیاتی میلانات کے ذریعے رہنمائی کی گئی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ وہ اپنی تکمیلیّت کی تلاش اور اس کے حصول کے لیے جد و جہد کر سکے۔ نیکی اور بدی کی قوتوں کے مابین مسلسل کشمکش زندگی کی جد و جہد ہے۔ اس کشمکش سے انسان کو آگے دیکھنے، آئیڈیل تلاش کرنے، کام کرنے اور اپنا کردار انجام دینے کی تحریک ملتی ہے۔ یہ کشمکش اُس کی زندگی کو دلچسپ اور بامعنی بنا دیتی ہے اس میں یکسانی اور جمود پیدا نہیں کرتی۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو روحانی اور اخلاقی کامیابیاں حاصل کرتے دیکھتا ہے تو خوش ہوتا ہے۔

اسلام کے اخلاقی معیار کے مطابق انسان کا نا مکمل اور خطا پذیر ہونا کوئی گناہ نہیں۔ یہ نا تکمیلیت اور خطا پذیری تو اس کی فطرت کا حصہ ہے کیونکہ انسان تخلیقی اعتبار سے ایک محدود اور پابندِ قیود مخلوق ہے۔ گناہ تو یہ ہے کہ کاملیت کے ذرائع موجود ہونے کے باوصف وہ ان کا طالب نہیں ہوتا۔ گناہ تو اس وقت لازم آتا ہے جب انسان کے کسی فعل، سوچ اور نیّت سے یہ ثابت ہو جائے کہ اُس نے

۱۔ گناہ دیدہ و دانستہ کیا ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کے حتمی قانون کی نافرمانی کی ہے۔

۳۔ حقوق اللہ یا حقوق العباد کی خلاف ورزی کی ہے۔

۴۔ کوئی ایسا کام کیا ہے جو روح اور جسم کے لیے مضرت رساں ہے۔

۵۔ غلطی کا ارتکاب بار بار کیا ہے اور

۶۔ عام حالات میں اس گناہ سے گریز کیا جا سکتا تھا۔

یہ ہیں گناہ کے اجزائے ترکیبی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ گناہ نہ تو انسان کی فطرت میں شامل ہے اور نہ موروثی ہی ہے۔ تاہم یہ درست ہے کہ انسان کے اندر گناہ کرنے کی قوی صلاحیت موجود ہے لیکن یہ اس کی تقوٰی یا نیکی اختیار کرنے کی صلاحیت سے زیادہ ہرگز نہیں ہے۔ اگر وہ نیکی کی صلاحیت سے کام لینے کی بجائے گناہ کی صلاحیت کو بروئے کار لاتا ہے تو وہ اپنی خالص اور پاکیزہ فطرت میں ایک نیا بیرونی عنصر شامل کر دیتا ہے۔ انسان صرف اسی اضافی بیرونی عنصر کے لیے جواب دہ ٹھہرایا گیا ہے۔

اسلام کے نزدیک بعض گناہ بڑے ہیں اور بعض چھوٹے۔ مثلاً بعض گناہ ایسے ہیں جو اللہ کے خلاف ہیں اور بعض اللہ اور انسان دونوں کے خلاف۔ اللہ کے خلاف سرزد ہونیوالے تمام گناہ بجز ایک کے قابلِ معافی ہیں بشرطیکہ گناہگار خلوصِ نیّت سے معافی کا خواستگار ہو۔ قرآن کے مطابق اللہ صرف شرک کا گناہ (یعنی ایک سے زیادہ خداؤں کو ماننا، مادی اشیاء کو خدا ماننا یا عقیدۂ تثلیث جس کے مطابق تین خداؤں پر ایمان لایا جاتا ہے) معاف نہیں کرتا۔ اس کے سوا وہ باقی تمام گناہ معاف کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔ لیکن اگر مشرک یا کافر بھی خدا سے رجوع کرتا ہے تو اُس کا گناہ معاف کر دیا جائے گا۔ انسانوں کے خلاف سرزد ہونے والے گناہ صرف اسی صورت میں قابلِ معافی ہیں کہ جس کے خلاف جرم سرزد ہوا ہے وہ مجرم کو معاف کر دے یا مجرم نقصان کی تلافی کر دے یا اُسے قرار واقعی سزا مل جائے۔

اس بحث کا لُبِّ لباب یہ ہے کہ گناہ اکتسابی ہے فطری یا پیدائشی نہیں ہنگامی ہے مکلّف نہیں۔ قابل اجتناب ہے ناگزیر نہیں۔ یہ خدا کے حتمی قانون کی دیدہ و دانستہ اور شعوری

خلاف ورزی ہے۔ اگر انسان کسی ایسے فعل کا ارتکاب کرتا ہے جو حقیقتاً انسان کی فطری جبلتوں کی پیداوار ہے یا قطعی طور پر ناقابلِ مزاحمت محرکات اور بے قابو تقاضوں کا نتیجہ ہے تو ایسا فعل اسلام کے نزدیک گناہ نہیں۔ اگر ایسے افعال کو گناہ تسلیم کر لیا جائے تو پھر خدا کے مقصد کا تعین نہیں ہو سکتا اور انسان کی جواب دہی بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ اللہ تعالیٰ انسان سے اُسی چیز کی توقع اور مطالبہ کرتا ہے جو بشری ممکنات کے دائرے اور انسان کی رسائی میں ہے۔

تصوّرِ آزادی

بہت سے افراد، حلقے اور اقوام آزادی کو ایک نظریہ اور قدر کے طور پر سمجھنے میں ناکام رہے ہیں۔ آزادی کا مفہوم اکثر صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا اور اس کا غلط استعمال کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی انسانی معاشرے میں انسان لفظ "آزادی" کے لغوی معنوں میں مکمل طور پر آزاد نہیں۔ اگر معاشرے کو کسی نظام کے تحت چلانا ہے تو کسی نہ کسی نوعیت کی حدود یا پابندیاں ضروری عائد کرنا پڑیں گی۔

اس عام خیال سے قطع نظر اسلام آزادی کا درس دیتا ہے، اس کی آبیاری کرتا ہے اور معاشرے میں مسلم اور غیر مسلم دونوں قسم کے افراد کے لیے اس کی ضمانت مہیا کرتا ہے۔ آزادی کے اسلامی تصور کا اطلاق زندگی کے ہر شعبے میں انسان کی تمام رضاکارانہ سرگرمیوں پر ہوتا ہے جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا ہے ہر انسان فطری طور پر آزاد یا خالص فطری حالت میں پیدا ہوتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان ہر قسم کی محکومی، گناہ، موروثی کہتری اور نسلی خلل اندازیوں سے آزاد پیدا ہوتا ہے۔ اس کا حقِ آزادی اس وقت تک مقدّس ہے جب تک وہ قانونِ الٰہی کی جان بوجھ کر خلاف ورزی یا دوسروں کے حقوق کی بے حرمتی نہیں کرتا۔

اسلام کا ایک بڑا مقصد انسانی ذہن کو توہّمات اور بے یقینیوں سے، روح کو گناہ اور بدعنوانی سے، ضمیر کو خوف اور دباؤ سے اور حتیٰ کہ جسم کو بے ترتیبی اور بگاڑ سے نجات دلانا ہے۔

اسلام نے انسان کو اس کی منزل سے آشنا کرانے کے لیے اُسے جس راستے پر چلنے کی ہدایت کی ہے اُس میں ذہنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال، روحانی پاکیزگی کی مسلسل حفاظت ، اخلاقی اصولوں کی پیروی حتیٰ کہ خوراک وطعام کے ضابطوں کی پابندی بھی شامل ہے ۔ جب انسان مذہب کی پیروی میں اس راستے پر چلتا ہے تو وہ آزادی اور نجات کی آخری منزل تک پہنچنے میں ناکام نہیں ہو سکتا ۔

اسلام میں عقیدہ ، عبادت اور ضمیر سے متعلق آزادی کا مسئلہ بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے ۔ ہر شخص کو عقیدے ، ضمیر اور عبادت کی آزادی حاصل ہے ۔ قرآنِ مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے :

> دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے ۔ صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے ۔ اب جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا ، اُس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا ، جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں ، اور اللہ (جس کا سہارا اُس نے لیا ہے) سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے ۔ (سورہ ۲ : آیت ۲۵۶)

اسلام یہ رویّہ اس لیے اختیار کرتا ہے کہ مذہب کا دارومدار ایمان ، نیّت اور اتباع پر ہے ۔ لہٰذا اسے جبراً قبول کرانا بے معنی ہو جاتا ہے ۔ مزید برآں اسلام اللہ کی سچائی کو ایک موقع کی شکل میں پیش کرتا ہے اور انسان کو مکمل آزادی دیتا ہے کہ وہ اپنے لیے جو راستہ چاہے اختیار کرے ۔ ارشادِ ربّانی ہے :

> (اے رسول) صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے ، اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے ۔ ہم نے انکار کرنے والے ظالموں کے لیے ایک آگ تیار کر رکھی ہے جس کی لپٹیں انہیں گھیرے میں لے چکی ہیں ۔ وہاں اگر وہ پانی مانگیں گے تو ایسے پانی سے اُن کی

تواضع کی جائے گی جو تیل کی تلچھٹ جیسا ہوگا اور اُن کا منہ بھون ڈالے گا،
بدترین پینے کی چیز اور بہت بُری آرام گاہ۔ (سورہ ۱۸ : آیت ۲۹)

آزادی کا اسلامی تصور ایمان کا ایک حصّہ ہے۔ یہ خالقِ حقیقی کی جانب سے ایک سنجیدہ اور قطعی حکم ہے۔ اسلام میں آزادی کی عمارت ان بنیادی اصولوں پر استوار کی گئی ہے۔

۱۔ انسان کا ضمیر صرف اللہ کے تابع ہے جس کے آگے ہر انسان براہِ راست جوابدہ ہے۔

۲۔ ہر انسان ذاتی طور پر صرف اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہے اور صرف وہی اپنے عمل کا پھل توڑنے کا حقدار ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ ذمہ داری سونپی ہے کہ وہ اپنے بارے میں خود فیصلہ کرے۔

۴۔ انسان کو کافی حد تک روحانی رہنمائی مہیا کر دی گئی ہے اور اُس میں عقلی صفات ودیعت کر دی گئی ہیں جن کی بنا پر وہ ذمہ دارانہ اور صائب فیصلے کر سکتا ہے۔

یہ ہے آزادی کے اسلامی تصور کی اساس اور اسلام میں آزادی کی قدر و منزلت۔ آزادی انسان کا فطری، روحانی اور اخلاقی استحقاق ہے اور سب سے بڑھ کر یہ ایک مذہبی فریضہ ہے۔ آزادی کے اس اسلامی تصور کے ڈھانچے میں مذہبی بنیاد پر ایذا رسانی، طبقاتی کشمکش یا نسلی عصبیت کی کوئی گنجائش نہیں۔ ایک فرد کا حقِ آزادی اتنا ہی مقدس ہے جتنا اُس کا زندہ رہنے کا حق ہے یعنی آزادی خود زندگی ہی کے مساوی ہے۔

تصورِ مساوات

اسلام کے نظامِ اقدار کا ایک بنیادی عنصر اصولِ مساوات ہے جس کے لیے عدلت کی اصطلاح زیادہ موزوں رہے گی۔ مساوات کی قدر کو یکسانیت یا اُس کے رسمی اور روایتی معنوں سے خلط ملط کرنا درست نہیں ہوگا۔ اسلامی تعلیم کے مطابق تمام انسان اللہ کی نظر میں برابر ہیں لیکن ضروری نہیں کہ وہ ہر لحاظ سے یکساں ہوں۔ مختلف انسانوں میں اہلیتوں، صلاحیتوں،

امنگوں، معاشی حالات اور دوسری کئی باتوں کا فرق پایا جاتا ہے لیکن ان میں سے کوئی امتیازی خصوصیت کسی ایک فرد یا نسل کو کسی دوسرے فرد یا نسل سے ممتاز نہیں کرتی۔ خدا کے نزدیک کسی شخص کے کردار یا اُس کی شخصیت کا اُس کی نسل، جلد کی رنگت، مال و دولت اور سماجی عزّ و وقار سے کوئی تعلق نہیں۔ خدا کے نزدیک اگر کسی شخص کو کسی دوسرے شخص پر فضیلت حاصل ہے تو وہ صرف تقویٰ کی بنیاد پر ہے اور امتیاز و برتری کا واحد معیار نیکی اور روحانی بلندی ہے۔ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

> "لوگو، ہم نے تم کو ایک عورت اور ایک مرد سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔
>
> (سورہ ۴۹ : آیت ۱۳)

نسل، رنگ اور سماجی مرتبے کا فرق محض ایک اتفاقیہ امر ہے۔ خدا کی نظر میں ان چیزوں کا انسان کے حقیقی مرتبے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مزید برآں مساوات کا اصول محض آئینی حقوق یا شریفانہ معاہدہ یا عجز و انکسار کا معاملہ نہیں بلکہ یہ ایمان کا ایک جزو ہے جس پر مسلمان بڑی سنجیدگی سے یقین رکھتے ہیں اور اُن کے لیے لازمی ہے کہ اس اصول پر خلوصِ نیت سے کاربند رہیں۔ مساوات کی اس اسلامی قدر کی بنیادیں اسلام کے ڈھانچے میں خاصی گہرائی تک اُتری ہوئی ہیں۔ اسلامی مساوات کا تصور مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں پر استوار ہے۔

۱۔ تمام انسانوں کو خدائے واحد نے پیدا کیا ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، جو سب کا آقا و مالک ہے۔

۲۔ تمام لوگ ایک نسل یعنی نسلِ انسانی سے تعلق رکھتے ہیں اور سب کی ولدیت مشترکہ ہے یعنی سب مساوی طور پر آدم و حوّا کی اولاد ہیں۔

۳۔ خدا اپنی تمام مخلوقات کے ساتھ انصاف کرنے والا اور مہربان ہے وہ کسی نسل، زمانے یا مذہب کے ساتھ جانبدار نہیں۔ پوری کائنات اُس کے زیرِ نگیں ہے اور سب اُس کی مخلوق ہیں۔

۴۔ تمام انسان بوقت پیدائش اس لحاظ سے برابر ہیں کہ وہ اپنے ساتھ دنیا میں کچھ نہیں لاتے اور بوقتِ مرگ اس لحاظ سے برابر ہیں کہ وہ دنیاوی سازوسامان میں سے کوئی چیز اپنے ساتھ نہیں لے جاتے۔

۵۔ خدا ہر شخص کے بارے میں فیصلہ اُس شخص کی ذاتی خوبیوں اور اُس کے اپنے اعمال کی بنیاد پر کرتا ہے۔

۶۔ خدا نے انسان کو انسان کے لقب سے نواز کر اُسے عزّ و شرف بخشا ہے۔

یہ ہیں اُن اصولوں میں سے چند ایک جو اسلام میں مساوات کے صحیح مفہوم کا تعین کرتے ہیں۔ اگر نظریۂ مساوات کے اس تصور کو عملی شکل دے دی جائے تو کسی بھی بنیاد پر جانبداری یا انسان کے ہاتھوں انسان کی ایذارسانی کا کوئی امکان باقی نہیں رہے گا اور جب اس الٰہی ضابطے پر مکمل عملدرآمد ہوگا تو ظلم و استبداد کی کوئی گنجائش موجود نہیں رہے گی اور لوگوں کے بارے میں اعلیٰ و ادنیٰ کا تصور، مراعات یافتہ اور پسماندہ طبقوں کی اصطلاحات اور اوّل درجے اور ثانوی درجے کے شہری جیسے الفاظ سب کے سب بے معنی اور متروک ہو کر رہ جائیں گے۔

تصوّرِ اخوت

اسلام کے نظامِ اقدار میں ایک اور بنیادی عنصر انسانی بھائی چارے کی قدر ہے۔ اس قدر کی بنیاد بھی انہی اصولوں پر رکھی گئی ہے جن کا ذکر آزادی اور مساوات کے ضمن میں ہو چکا ہے۔ ان متذکرہ اصولوں کے علاوہ اسلام میں انسانی بھائی چارے کی بنیاد خدائے معبود کی وحدانیت اور آفاقیت میں غیر متزلزل یقین، اس کی عبادت گزار نوعِ انسانی کے اتحاد اور مذہب (جو عبادت

کا راستہ دکھاتا ہے) کی وحدت پر ہے۔ ایک مسلمان کے عقیدے کے مطابق خدا ایک ہے، ازلی وابدی (لازوال) ہے اور آفاقی ہے۔ وہ سب انسانوں کا خالق، سب انسانوں کا پروردگار، سب انسانوں کا حساب لینے والا اور سب انسانوں کا آقا و مالک ہے۔ اُس کے نزدیک سماجی مرتبہ، قومی برتری اور نسلی اصلیت کی کوئی اہمیت نہیں۔ اُس کے آگے تمام انسان برابر اور ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ تمام بنی نوع انسان اس لحاظ سے رشتۂ وحدت میں منسلک ہیں کہ اُن سب کا تخلیقی سرچشمہ ایک ہے، سب کی ابتدائی ولدیت ایک ہے اور سب کی آخری منزل بھی ایک ہے۔ انسان کا تخلیقی سرچشمہ خود خدائے واحد کی ذات ہے۔ سب انسانوں کے ابتدائی مشترکہ والدین آدم اور حوا ہیں اور اُن کی بڑھائی ہوئی نسل میں سب انسان ان کی برابر کی اولاد ہیں۔ جہاں تک آخری منزل کا تعلق ہے سب مسلمانوں کا راسخ عقیدہ ہے اور اُن کے اذہان میں اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ سب انسانوں کو زندگی گزارنے کے بعد بالآخر خدا کی طرف ہی لوٹنا ہوگا جو سب کا خالق ہے۔

مسلمان اللہ کے دین کی وحدت پر یقین رکھتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مذہب، اپنی نعمتوں اور اپنی نوازشات کو کسی خاص قوم، کسی خاص نسل یا کسی خاص زمانے تک محدود نہیں رکھتا۔ اس سے یہ بھی مراد ہے کہ خدا کے مذہب میں کوئی تضاد یا بنیادی اختلاف نہیں۔ اگر اس نقطۂ نظر کی مناسب تاویل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک انسان کی دوسرے انسان پر مصنوعی برتری یا اس کی خود ساختہ علیحدہ حیثیت کی کوئی بنیاد موجود نہیں۔ اگر یہ نقطۂ نظر انسانی ذہن تک پہنچا دیا جائے تو انسانی بھائی چارے کی واضح اور ٹھوس بنیاد مہیا ہو جائے گی۔ چونکہ مسلمان خدا کی وحدانیت، انسان کی مساویانہ حیثیت اور دین کی وحدت پر یقین رکھتا ہے اس لیے وہ خدا کے تمام انبیاء اور صحیفوں پر بلا امتیاز ایمان لاتا ہے۔

ؔ اس کتاب کے پہلے باب میں اسلام میں ایمان کے بنیادی اجزاء کے موضوع کے تحت کی گئی بحث کا مطالعہ کریں۔

امن و سلامتی کا تصوّر

یہ سمجھنے کے لیے کہ اسلام کا مسئلۂ امن و سلامتی کے بارے میں کیا موقف ہے ہمارے لیے اسلام سے متعلق صرف چند ایک بنیادی حقائق پر غور کرنا ضروری ہے۔ 'سلامتی' اور 'اسلام' ایک ہی مادے سے مشتق ہیں اور انہیں ہم معنی خیال کیا جا سکتا ہے۔ 'سلام'، اللہ تعالیٰ کے اسمائ میں سے ایک ہے۔ ہر مسلمان کی روزانہ کی نماز سلامتی کے الفاظ پر ختم ہوتی ہے۔ مسلمان جب خدا کی طرف رجوع کرتا ہے تو وہ سلامتی کے لیے پکارتا ہے۔ اپنی روزمرہ زندگی میں مسلمان باہمی ملاقات کے موقع پر ایک دوسرے کے لئے سلامتی کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔ اسم صفت 'مسلم' کے معنی بھی ایک لحاظ سے 'سلامتی والا' ہیں۔ اسلام میں جس جنّت کا تصور دیا گیا ہے وہ سلامتی کی جگہ ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں سلامتی کا موضوع کس قدر بنیادی اور نمایاں مقام رکھتا ہے۔ جو شخص اسلام کی وساطت سے خدا تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ سلامتی کے حصول میں کبھی ناکام نہیں رہتا۔ وہ خدا کے ساتھ تعلق قائم کر کے سلامتی محسوس کرتا ہے، اپنی ذات میں سلامتی محسوس کرتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ سلامتی سے رہتا ہے۔ اگر ان تمام اقدار کو یکجا کر لیا جائے، کارخانہ قدرت میں انسان کو اس کا صحیح مقام دیا جائے اور زندگی کو اسلامی تناظر میں دیکھا جائے تو صاحبِ ایمان اور اعلیٰ اصولوں کی پیروی کرنے والے لوگ ہماری موجودہ دنیا سے بہتر دنیا کی تعمیر و تشکیل، انسانی وقار کی بازیابی، مساوات کے حصول، عالمی بھائی چارے کے فروغ اور دیرپا امن و سلامتی[1] کے قیام میں کبھی ناکام نہیں ہو سکتے۔

---

[1] 'جنگ اور امن' کی بحث کا مطالعہ کریں جو بعد کی سطور میں دی گئی ہے۔

تصوّرِ معاشرت

لفظ 'معاشرت' کے معنی ہیں کچھ ضمنی مفاہیم بھی مضمر ہیں۔ ان میں سے بعض رومانوی تاثر لیے ہوئے ہیں اور یادِ وطن سے متعلق ہیں جبکہ بعض تنقیص آمیز اور رجعت پسندانہ ہیں لیکن اس وقت چونکہ ہم معاشرت کی مبادیات پر بات کرنا چاہتے ہیں اس لیے ہم اپنی بحث کو لفظ 'معاشرت' کے بالکل بنیادی معنوں تک محدود رکھیں گے۔

بنیادی معنوں میں تصوّرِ معاشرت سے مراد ربط و تعلق کی وہ تمام شکلیں ہیں جن میں اعلیٰ درجے کا ذاتی لگاؤ، جذباتی گہرائی، اخلاقی ذمہ داری، سماجی بندھن اور بلحاظ زمانہ تسلسل و تواتر کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ جذبۂ معاشرت کسی خاص علاقے، مذہب، قوم، نسل، پیشے یا کسی مشترکہ نصب العین سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں ہو سکتا ہے۔ معاشرت کی ابتدائی شکل خاندان ہے۔ (نسبٹ: صفحات ۴۷، ۴۸)[۵]

ایک دوسرے بنیادی معنوں میں معاشرت سے مراد وہ جامع گروہ ہے جو دو بڑی خصوصیات سے متصف ہے۔

۱۔ یہ ایک ایسا گروہ ہے جس میں ایک فرد اُن سرگرمیوں اور تجربات میں حصہ لے سکتا ہے جو اُس کی اپنی ذات کے لیے اہم ہیں۔

۲۔ اس گروہ بندی کی شیرازہ بندی لوگوں کے اس مشترکہ احساس سے ہوتی ہے کہ وہ سب کے سب اس سے وابستہ ہیں اور اسی سے انکی شناخت قائم ہے۔

(بروم و شیلزنک: صفحہ ۳۱)[۶]

۵۔ رابرٹ نسبٹ کی تصنیف "دی سوشیالوجیکل ٹریڈیشن" (نیویارک: بیسک بکس، ۱۹۶۶)

۶۔ ایل بروم اور پی شیلزنک کی تصنیف "سوشیالوجی: اے ٹیکسٹ وِد ایڈیپٹڈ ریڈنگس" (نیویارک: ہارپر اینڈ رو، ۱۹۶۹)

ایک بڑا تاریخی رجحان یہ رہا ہے کہ افرادِ معاشرہ کے قریبی، گھرے اور اخلاقی روابط کی نوعیت تبدیل ہوتی رہی اور ان کی جگہ ایسے روابط درآتے رہے جو غیر شخصی اور رسمی ہیں اور جن کا تعلق وسیع تر انسانی معاشرے کی فلاح و بہبود یا رفاہِ عامہ سے ہے۔ یہ تحریک مختلف مراحل سے گزری اور انسانی معاشرے پر اس کے دور رس نتائج مرتب ہوئے۔

اس تاریخی رجحان سے بعض ٹھوس نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ پہلا یہ کہ یہ تاریخی ارتقاً نہ تو کلیتہً منفی اور نہ کلیتہً مثبت اور تعمیری رہا ہے۔ اس تحریک کے منفی اور مثبت ہر دو قسم کے نتائج نے مختلف لوگوں کو مختلف حد تک متاثر کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ جدید معاشرہ اپنی تکمیل کی منزل سے بہت دور ہے۔ اس سلسلے میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ تیسرے یہ کہ انسان کی حالت ابھی اتنی دگرگوں یا مایوس کن نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ انسانی معاشرہ فی الوقت بہت سے بحرانوں اور آزمائشوں سے دوچار ہے لیکن صورتِ حال ابھی مکمل طور پر قابو سے باہر نہیں ہوئی۔ سب سے آخری بات یہ کہ انسانوں کا ایک دوسرے پر انحصار بڑھ گیا ہے اور مختلف انسانی معاشروں کے باہمی تعلقات پہلے سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہو گئے ہیں۔ اگر معاشرے کا کوئی ایک حصہ کسی حالت سے دوچار ہوتا ہے تو باقی معاشرے کا اس سے متاثر ہونا ایک ناگزیر امر ہے۔ اسلامی تصورِ معاشرت پر بحث کرتے وقت ہمیں یہ ساری باتیں مدِ نظر رکھنا ہوں گی۔

یہ کہنا بالعموم درست ہوگا کہ اسلامی تصورِ معاشرت کی کچھ منفرد خصوصیات ہیں جن کا تعلق اسلامی معاشرت کی بنیاد، اس کے تاریخی مقصد، دیگر معاشروں میں اس کے مقام، اس کی شناخت اور اس کے تسلسل سے ہے۔

اسلام میں نسل، قومیت، جغرافیائی علاقے، پیشے، خاندان یا مخصوص مفادات کو معاشرت کی بنیاد نہیں بنایا گیا۔ اسلامی معاشرت کا نام کسی رہبر، بانی یا کسی واقعہ کے نام پر نہیں رکھا گیا۔ یہ معاشرت قومی سرحدوں اور سیاسی حدود داربعوں سے ماورا ہے۔ اسلام میں معاشرت

کی بنیاد وہ بنیادی اصول ہیں جو مشیتِ الٰہی کی اطاعت، اُس کے قانون کی پیروی اور اُس کی منشا کے ساتھ مخلص رہنے کا تقاضا کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اسلامی معاشرت اُس وقت معرضِ وجود میں آتی ہے جب اس کی نشو و نما اور آبیاری اسلام کے چشمے سے کی گئی ہو۔

اسلامی معاشرت کا ایک تاریخی مقصد ہے۔ یہ مقصد محض بقا، اقتدار، افزائشِ نسل یا جسمانی تسلسل نہیں بلکہ اس سے بالاتر ہے۔ قرآنِ مجید میں اس مشن کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

> تم میں سے کچھ لوگ تو ایسے ضروری ہونے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں، اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔ (سورہ ۳ : آیت ۱۰۴)

> اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ (سورہ ۳ : آیت ۱۱۰)

اسلامی معاشرت کا تاریخی مقصد ایسے لوگوں کا معاشرہ قائم کرنا ہے جو صحیح معنوں میں نیک، باکردار اور شریف النفس ہوں۔ ایک صحیح اسلامی معاشرہ نیکی کا چوکس محافظ اور بدی کا سخت دشمن ہے۔ اسلام پورے معاشرے سے جن خصوصیات کا تقاضا کرتا ہے وہی تقاضا فرداً فرداً اس معاشرے کے ہر رکن سے بھی کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پورا معاشرہ ایک منظم وجود ہوتا ہے اور اس کا ہر فرد اللہ کے سامنے جوابدہ ہے۔ پیغمبرِ آخرالزماں ؐ نے ایک مسلم فرد کا کردار ان الفاظ میں بہترین پیرائے میں ادا کیا ہے۔

> تم میں سے جو شخص کسی جگہ کوئی بُرائی دیکھے تو اُس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی قوت اور عمل سے اسے دُور کرے۔ اگر وہ ایسا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو اُسے چاہیے کہ وہ اس بُرائی کے خلاف آواز اُٹھا کر تبدیلی لانے کی

کوشش کرے۔ اور اگر وہ ایسا بھی نہیں کرسکتا تو دل میں اسے شدت سے
ناپسندیدہ اور بُرا محسوس کرے۔ اور یہ ایمان کا کمترین درجہ ہے"۔

جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں آنحضرتؐ کا یہ ارشاد بہت اہم اور جامع ہے۔ ذرائع ابلاغ کے اس انقلابی دور میں کوئی بھی صحیح العقل شخص متحدہ کارروائی کی طاقت، کہی گئی بات کی اثرانگیزی یا احساسات کی قوت کو خوب محسوس کرسکتا ہے اور اس بارے میں غلط اندازہ نہیں لگاسکتا۔

قرآنِ مجید میں اسلامی معاشرت کا تاریخی مقصد ایک اور موقع پر اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک امتِ وسطہ بنایا ہے تاکہ تم دنیا
کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسولؐ تم پر گواہ ہو۔ (سورہ ۲ : آیت ۱۴۳)

شہادت یا گواہی کا یہ کردار انتہائی اہم ہے اور معاشرے سے بہت سی باتوں کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس آیت سے عیاں ہے کہ اسلامی معاشرت کے لیے مثالی ہونا ضروری ہے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ کارکردگی کے اعلیٰ معیار قائم کیے جائیں جو دوسروں کے سامنے مثال کے طور پر پیش کیے جاسکیں۔ اس کے لئے لازم ہے کہ افراط و تفریط، سخت رویّے اور فوری اشتعال انگیزی سے اجتناب کرے۔ درمیانی راہِ عمل اختیار کرنا، ثابت قدم اور وضعدار رہنا، قبول ورد کے بارے میں واضح نقطۂ نظر رکھنا، بااصول ہونا اور پھر اس کے ساتھ ساتھ اپنے اندر ایسی صفات پیدا کرنا کہ خود کو حالات کے مطابق ڈھالا جاسکے یہ سب کچھ انسانی کردار اور سماجی استحکام کے لیے شاید مشکل ترین آزمائش ہے۔ لیکن اسلامی معاشرت اور مسلمانوں کے تاریخی مشن کا یہی کردار ہے۔ اور یہی وہ معیار ہے جو مسلمانوں کو ایک ایسی انسانی معاشرت کے اہل بناتا ہے جو پوری انسانی تاریخ میں ایک بہترین معاشرت کے طور پر اُبھر سکے۔

اسلامی معاشرت کی شناخت وضعدار توازن، مثالی رویے، مقصد کی یگانگت، احساسات اور جذبات کے مناسب اظہار، استحکام اور عدل کے اصولوں پر قائم ہے۔ اس ضمن میں قرآن اور سُنّت کے متعدد حوالے دیئے جاسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھیے قرآن کا سورہ ۴ :

آیت ۱۳۵ ، سورہ ۲۱ : آیت ۹۲ ، سورہ ۲۳ : آیت ۵۲)

جہاں تک اسلامی معاشرت کے تسلسل کا تعلق ہے اس بارے میں بعض نکات قابل لحاظ ہیں۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس تسلسل کو یقینی بنانے کے لیے اپنے تمام تر ذرائع بروئے کار لائیں۔ شادی بیاہ اور وراثت کے قوانین ، زکوٰۃ اور حج کے فرائض ، رشتہ داروں کے باہمی حقوق و فرائض ، انفرادی دیانت داری ، سماجی بندھن وغیرہ سے متعلق جتنے بھی احکامات ہیں سب کے سب اسلامی معاشرت کے صحت مند تسلسل کے لیے ہی تو ہیں۔ دوسری طرف خود اللہ تعالیٰ نے کئی طریقوں سے اس تسلسل کو برقرار رکھنے کا ذمہ لے رکھا ہے۔ مثلاً سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔

(دیکھیے قرآن کا سورہ ۱۵ : آیت ۹)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کی پیروی کرنے والا معاشرہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ قرآن کی اتباع کرنے والے ہمیشہ رہیں گے اگرچہ دوسری الہامی کتابوں کو ماننے والے بھی موجود ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ اسلام بذاتِ خود ایک تسلسل ہے۔ جب بھی کسی قوم نے اللہ کے راستے سے انحراف کیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے الفاظ دہرائے اپنی صداقت کی توثیق کی اور اسلام کا پیغام جاری رکھنے کے لیے نئے پیغمبر اور مصلحین بھیجے۔ تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے سختی سے تنبیہ کی ہے کہ اگر مسلمانوں نے اُس کے بتائے ہوئے سیدھے راستے سے انحراف کیا تو وہ خسارے میں رہیں گے۔ اللہ ان کی جگہ کسی ایسی قوم کو لے آئے گا جو اُن (بھٹکے ہوئے مسلمانوں) جیسے نہیں ہوں گے۔ (حوالے کے لیے دیکھیے قرآن کا سورہ ۴۷ : آیت ۳۸ ،

مزید برآں ایمان والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ اگر ان میں سے کوئی اپنے ایمان سے ہٹ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو لے آئے گا جن سے اللہ کو محبت ہوگی اور وہ اللہ سے محبت کرنے والے ہوں گے۔ یہ لوگ مومنوں کے لیے نرم خُو اور کفار کے لیے سخت ہوں گے وہ اللہ کے راستے میں جہاد کریں گے اور دشمنوں کی ملامت آمیز باتوں سے ڈرنے والے نہیں ہونگے۔

(حوالے کے لیے دیکھیے قرآن کی سورۃ ۵ : آیت ۵۷)

تصوّرِ اخلاقیات

اسلام میں اخلاقیات کا تصوّر کچھ بنیادی عقائد اور اصولوں پر مبنی ہے۔ یہ اصول و قواعد حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر نوع کی نیکی، سچائی اور حسن کی خالق اور سرچشمہ ہے۔

۲۔ انسان اپنے خالق کا ذمہ دار، باوقار اور لائقِ احترام نائب ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین میں ہر چیز بنی نوع انسان کے لیے مسخر کر دی ہے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ رحم والا اور حکمت والا ہے اور اپنی ان صفات کی وجہ سے وہ انسان سے اُن امور کی توقع نہیں کرتا جو اُس کے لیے ناممکن ہیں یا اُسے اُس امر کے لیے جوابدہ نہیں ٹھہراتا جو اُس کی طاقت سے باہر ہے نہ اللہ تعالیٰ انسان کو زندگی کی نعمتوں سے محظوظ ہونے سے منع کرتا ہے۔

۵۔ اعتدال، عمل اور توازن وہ اصول ہیں جو دیانت داری اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کی ضمانت دیتے ہیں۔

۶۔ انسان کو کوئی کام کرنے یا نہ کرنے کا پورا اختیار ہے سوائے اُس چیز کے جسے فرض قرار دیا گیا ہے (جس کا کرنا ضروری ہے) اور سوائے اُس چیز کے جس سے منع کیا گیا ہے (جس سے بچنا ضروری ہے)

۷۔ انسان حتمی طور پر اپنے افعال کا ذمہ دار صرف خدا کے سامنے ہے اور اُس کا منتہائے مقصود اپنے خالق کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔

اسلام میں اخلاقیات کے بہت سے پہلو ہیں اور یہ سب کے سب دور رس اور ہر

لحاظ سے جامع ہیں۔ اسلام کی اخلاقی اقدار جن امور کا احاطہ کرتی ہیں ان میں انسان کا خدا سے تعلق، انسان کا دوسرے انسانوں سے تعلق، انسان کا کائنات کے باقی عناصر اور مخلوقات سے تعلق اور انسان کا خود اپنی ذات سے تعلق شامل ہے۔ مسلمانوں کو بیرونی دنیا کے ساتھ اپنے رویئے، اپنے ظاہری اعمال، اپنی گفتگو، اپنے احساسات اور اپنی نیت کی نگہبانی کرنی پڑتی ہے۔ عموماً مسلمان کا کردار یہ ہے کہ وہ ہر صحیح چیز کی حمایت کرے اور ہر غلط چیز کے خلاف جہاد کرے، سچ کی تلاش میں رہے اور جھوٹ کو رد کر دے، حسن اور صحت مندی کو عزیز رکھے اور ناشائستگی سے پرہیز کرے۔ سچائی اور نیکی مسلمان کی منزل ہے۔ عجز و انکسار، سادگی، شائستگی، خوش اخلاقی اور ہمدردی جیسی صفات اُس کی فطرتِ ثانیہ ہیں۔ اُس کے نزدیک غرور، تکبر، درشتی اور بے رُخی کا رویّہ ناپسندیدہ، ناگوار اور اللہ کی ناراضی کا موجب ہے۔

اب ہم اسلامی تصورِ اخلاقیات کو ذرا مزید وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔ مسلمان کا اپنے خدا سے جو تعلق ہے وہ محبت، اتباع، اعتمادِ کُلی، فکر انگیزی، امن و سلامتی، فہم و ادراک، استقامت اور عملی خدمت گزاری کا تعلق ہے۔ یہ اعلیٰ سطح کی اخلاقی اقدار انسانی اخلاقیات کے فروغ اور تقویت کا باعث بنتی ہیں۔ اپنے انسان ساتھیوں کے ساتھ تعلقات میں مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ مہربانی سے پیش آئے اور پڑوسیوں کے مسائل میں دلچسپی لے۔ بزرگوں کا ادب کرے اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرے۔ بیماروں کی تیمارداری اور حاجت مندوں کی امداد کرے۔ مصیبت زدوں کے ساتھ ہمدردی کرے اور مایوسوں کی ڈھارس بندھائے۔ خوش نصیبوں کی مسرتوں میں شریک ہو اور گمراہوں کے ساتھ صبر و تحمل کا مظاہرہ کرے۔ جہلاء کے ساتھ رواداری اور مجبوروں کے ساتھ عفو و درگزر سے کام لے۔ بُرائی کو ناپسند کرے اور نیکی کی سربلندی کے لیے کام کرے۔ مزید برآں اُس کے لیے ضروری ہے کہ وہ دوسروں کے جائز حقوق کا اسی طرح احترام کرے جس طرح وہ اپنے حقوق کا کرتا ہے۔ اُس کا ذہن تعمیری خیالات اور سنجیدہ سرگرمیوں میں مصروف ہو۔ اس کا دل رحم اور خیر سگالی کے جذبات سے معمور ہو۔ اُس

کی رُوح امن وسلامتی اور سکون واطمینان کی کیفیت سے سرشار ہو۔ اُس کا مشورہ مخلصانہ اور ہمدردانہ ہو۔

یہ ایک مسلمان کی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ دیانت داری اور الملکیت کا بے داغ نمونہ ہو، اپنے وعدوں کو ایفا کرے اور اپنے فرائض بحسن وخوبی سرانجام دے۔ علم اور نیکی کی تلاش میں اپنے تمام ممکنہ ذرائع کام میں لائے۔ اپنی غلطیوں کی اصلاح کرے اور اپنے گناہوں پر نادم ہو۔ اپنے اندر اعلیٰ سماجی شعور اور انسانی خدمت کا جذبہ پیدا کرے۔ اپنے متعلقین کی فیاضانہ کفالت بغیر اسراف کے کرے اور اُن کی جائز ضروریات پوری کرے۔ ایک مسلمان کے لیے فطرت اور دنیا اُس کے مطالعے کے وسیع میدان ہیں اور محظوظ ہونے کے ذرائع بھی۔ اُس کے لیے لازم ہے کہ وہ کائنات میں موجود اشیاء سے استفادہ اور اُس کے عجوبوں پر غور وخوض کرے اور ان کو اللہ کی کبریائی کی نشانیاں جان کر ان کا گہرا مطالعہ کرے اور اُن کے حسن کا تحفظ کرے، نوادرات کا کھوج لگائے اور اُن کے اسرار ورموز کی نقاب کشائی کرے۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھے کہ خواہ وہ ان نوادرات سے استفادہ کر رہا ہو یا محض حظ اٹھا رہا ہو اُس کے لیے لازمی ہے کہ وہ ان کے ضیاع سے احتراز کرے اور تجاوز نہ کرے۔ خدا کا ذمہ دار اور دیانت دار نائب ہونے کی حیثیت میں اُس کے لیے ضروری ہے کہ وہ دوسروں کا بھی خیال رکھے جو اس دنیا میں اُس کے برابر کے حصہ دار ہیں اور مستقبل میں اُس کی جگہ لینے والے ہیں۔

اسلام کے اخلاقی اصول کہیں تو مثبت فرائض یا اوامر کی صورت میں بیان کیے گئے ہیں جن کی تکمیل ضروری ہے جبکہ کئی مواقع پر کچھ باتیں منفیات یا نواہی کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہیں، ان باتوں سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔ یہ اخلاقی اصول خواہ مثبت انداز میں بیان ہوئے ہوں یا منفی انداز میں اُن کا مقصد انسان میں خوش فکر ذہن، مطمئن روح، مضبوط شخصیت اور صحتمند جسم تعمیر کرنا ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ یہ اصول نوعِ انسانی کی عام فلاح اور خوشحالی کے لیے بنیادی ضروریات کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان ضروریات کی تکمیل کے لیے اسلام نے اور بہت سی

باتوں کے علاوہ حسبِ ذیل ضابطے بیان کیے ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت کی گواہی ایک بامقصد عہد کی صورت میں دینا۔

۲۔ روزمرہ کی فرض کی گئی نمازیں باقاعدگی سے ادا کرنا۔

۳۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کرنا۔

۴۔ ماہِ رمضان المبارک کے روزے رکھنا۔

۵۔ استطاعت رکھنے پر زندگی میں کم از کم ایک بار حج کرنا۔

ان ضابطوں کے اخلاقی اور معاشرتی پہلوؤں پر مفصل بحث آئندہ صفحات میں ہوگی۔

مثبت احکامات یا اوامر کے علاوہ کچھ احکامات امتناعی یا انتباہی نوعیت کے ہیں اور یہ نواہی کہلاتے ہیں۔ انسان کو ذہنی پستی، بگاڑ، اخلاقی گراوٹ، پرتعیش زندگی، ناشائستگی اور حرص و آز جیسی برائیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اسلام نے بعض چیزوں کی ممانعت کی ہے جن کا تعلق اشیائے خورد و نوش، تفریحات اور جنسی سرگرمیوں سے ہے۔ ان ممنوعات میں مندرجہ ذیل اشیاء شامل ہیں۔

۱۔ تمام نشہ آور مشروبات جن میں ہر قسم کی شراب، الکحل، سپرٹ وغیرہ شامل ہیں۔
(حوالے کے لیے دیکھیے قرآن کی سورۃ ۲ : آیت ۲۱۹، سورہ ۴ : آیت ۴۳، سورہ ۵ : آیت ۹۳-۹۴)

۲۔ خنزیر کا گوشت اور اس کی مصنوعات (مثلاً خشک کیا ہوا نمکین گوشت، ران کا گوشت، چربی یا کسی بھی شکل میں بطورِ غذا استعمال ہونے والا گوشت)، جنگلی جانوروں کا گوشت جو اپنے شکار کو ہلاک کرنے کے لیے پنجے یا دانت استعمال کرتے ہیں (مثلاً شیر، بھیڑیا، چیتا وغیرہ)، تمام شکاری پرندوں کا گوشت (مثلاً باز، گدھ، کوا وغیرہ)، کترنے والے جانوروں،

رینگنے والے جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کا گوشت، مردہ جانوروں اور پرندوں کا گوشت جنہیں صحیح طریقے سے ذبح نہ کیا گیا ہو (حوالے کے لیے دیکھیے قرآن کی سورۃ ۲: آیات ۱۷۲-۱۷۳، سورہ ۵: ۲-۶)

۳۔ جوا خواہ کسی شکل میں ہو اور دیگر لاحاصل کھیلیں (حوالے کے لیے دیکھیے قرآن کا سورہ ۲: آیت ۲۱۹، سورہ ۵: آیات ۹۳-۹۴)

۴۔ نکاح کے بغیر تمام جنسی تعلقات اور سرِعام بولنے، چلنے پھرنے، دیکھنے اور پہننے کے وہ تمام انداز جن سے جنسی ترغیب ملتی ہو، نفسانی خواہشات بیدار ہوتی ہوں، بدگمانی پیدا ہوتی ہو یا بے حیائی اور ناشائستگی کا مظاہرہ ہوتا ہو (حوالے کے لیے دیکھیے قرآن کی سورۃ ۲۳: آیات ۵-۷، سورہ ۲۴: آیات ۳۰-۳۳، سورہ ۷۰: آیات ۲۹-۳۱)

اللہ تعالیٰ نے امتناعی قانون اس لیے بنایا ہے کہ ان چیزوں سے پرہیز کرنے میں ہی انسان کی فلاح ہے۔ اس میں اُس کی روحانی بہتری کے ساتھ ساتھ عالمِ انسانیت کے وسیع تر اخلاقی اور مادی مفاد کا پہلو بھی مضمر ہے۔ ممانعت کا یہ حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی خود مختارانہ یا ظالمانہ فعل نہیں ہے۔ اس کے برعکس یہ اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانیت کی فلاح و بہبود میں کس قدر دلچسپی لیتا ہے اور اُسے انسان کی نگہداشت کس قدر عزیز ہے۔

جب خدا بعض اشیاء کی ممانعت کرتا ہے تو ایسا اس لیے نہیں کرتا کہ وہ انسان کو کسی اچھی یا مفید چیز سے محروم کرنا چاہتا ہے بلکہ اس لیے کرتا ہے کہ وہ انسان کی حفاظت اور اُس کے لیے ایسے حالات ساز گار کرنا چاہتا ہے جن میں رہ کر انسان نیک و بد کی تمیز کے لیے اعلیٰ درجے کی حس کو ترقی دے سکے، زندگی میں اچھی چیزوں کے لیے ذوقِ لطیف پیدا کر سکے اور اعلیٰ تر اخلاقی اقدار کے فروغ میں مسلسل دلچسپی کا مظاہرہ کر سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ انسان کی رُوح اور ذہن، جان اور جسم، ضمیر اور جذبات، صحت اور دولت اور تندرستی

اور کردار کی خوب نگہداشت کی جائے۔ لہٰذا ممانعت کا قانون محرومی نہیں بلکہ ثروت ہے، بندش بے جا نہیں بلکہ نظم و ضبط ہے، تحدید نہیں بلکہ توسیع ہے۔

یہ ثابت کرنے کے لیے کہ تمام ممانعتوں میں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور حکمت پوشیدہ ہے دو اسلامی اصول خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ پہلا یہ کہ غیر معمولی حالات، ہنگامی صورتِ حال اور اشد ضرورت کے تحت مسلمان کو اُن چیزوں کے استعمال کی اجازت ہے جن کی عام حالات میں ممانعت کی گئی ہے۔ جب تک ایسے حالات برقرار رہتے ہیں اور جس حد تک صورتِ حال اُس کے قابو سے باہر ہے ان حالات میں اگر وہ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے اخلاقی ضابطوں کی پابندی کرنے میں ناکام رہتا ہے تو اُسے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جائے گا۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے ایک ضابطۂ رحمت بنا رکھا ہے۔ جو لوگ بے خبری کی بنا پر کوئی برائی کر بیٹھتے ہیں لیکن اُس کے بعد نادم ہوتے ہیں اور اپنے رویے میں مثبت تبدیلی لے آتے ہیں انہیں یقیناً معاف کر دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ غفورٌ رحیم ہے اور اپنے بندوں کے گناہ معاف کرنے والا ہے۔

قرآنِ مجید میں ایک مقام پر جس کا متن اپنے موضوع کے اعتبار سے غیر معمولی اور خاص اہمیت کا حامل ہے، مضبوط اخلاقی رویے کی بنیاد اور اس کا فلسفہ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

> اے بنی آدم، ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو اور کھاؤ پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو، اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اے نبیؐ! ان سے کہو کس نے اللہ کی اُس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں؟ کہو، یہ ساری چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی ایمان لانے والوں کے لیے ہیں اور قیامت کے روز تو خالصتہً انہی کے لیے ہوں گی۔ اس طرح ہم اپنی باتیں صاف صاف بیان کرتے ہیں اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھنے والے ہیں۔ اے نبیؐ! ان

سے کہو کہ میرے رب نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ تو یہ ہیں: بے شرمی کے کام،
خواہ کھلے ہوں یا چھپے ___ اور گناہ اور حق کے خلاف زیادتی اور یہ کہ اللہ کے ساتھ
تم کسی ایسے کو شریک کرو جس کے لیے اُس نے کوئی سند نازل نہیں کی اور یہ کہ اللہ
کے نام پر کوئی ایسی بات کہو جس کے متعلق تمہیں علم نہ ہو کہ وہ حقیقت میں اُس
نے فرمائی ہے) (قرآن کی سورۃ ۷: آیات ۳۱-۳۳)

اسلام میں اخلاقیات کا دائرہ اس قدر ہمہ جہت اور مکمل ہے کہ یہ اللہ پر ایمان، مذہبی رسومات، روحانی ضروریات کی تکمیل، معاشرتی اطوار، فیصلہ سازی، ذہنی مشاغل، حسنِ خوراک، عادات، گفتگو کے آداب اور انسانی زندگی کے دیگر تمام پہلوؤں کا بیک وقت احاطہ کرتا ہے۔ چونکہ اخلاقیات اسلام کا ایک جزوِ لاینفک ہے اس لیے قرآن کی تمام آیات میں اخلاقی لہجہ رچا بسا ہوا ہے اور پوری کتاب میں جا بجا اخلاقی تعلیمات پر بار بار زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآنی حوالہ جات کے مطابق ان اخلاقی تعلیمات کو مبسوط شکل میں پیش کرنا اور ان کی مناسب درجہ بندی کرنا ایک مشکل کام ہے۔ قرآن مجید میں ہر اصول کا ذکر متعدد بار مختلف سیاق و سباق میں ہوا ہے۔ کبھی تو یہ ایک اہم مفرد اصول کی حیثیت میں بیان کیا گیا ہے اور کبھی اس کا ذکر مجموعی نظامِ اخلاقیات کے ایک حصّے کے طور پر ہوا ہے۔ یہ مجموعی نظامِ اخلاقیات، بجائے خود ایک اعلیٰ تر مکمل مذہبی نظام کا حصہ ہے۔

اس بحث کی روشنی میں قرآنِ حکیم کی حسب ذیل منتخب آیات کو صرف نمونہ تصور کرنا چاہیے۔ یہاں ان آیات کی تاویل انسانی بساط کے مطابق کی گئی ہے جو ظاہر ہے کہ قرآن کے اصل اور مکمل متن کا صحیح صحیح مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہے۔

اور تم سب اللہ کی بندگی کرو، اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، ماں
باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو، قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے
ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ، اور پڑوسی رشتہ دار سے، اجنبی ہمسایہ سے،

پہلو کے ساتھی اور مسافر سے اور اُن لونڈی غلاموں سے جو تمہارے قبضہ میں ہیں احسان کا معاملہ رکھو، یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اپنے پندار میں مغرور ہو اور اپنی بڑائی پر فخر کرے۔ اور ایسے لوگ بھی اللہ کو پسند نہیں ہیں جو کنجوسی کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی کنجوسی کی ہدایت کرتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اُسے چُھپاتے ہیں۔ ایسے کافر نعمت لوگوں کے لیے ہم نے رُسوا کن عذاب مہیا کر رکھا ہے۔ اور وہ لوگ بھی اللہ کو ناپسند ہیں جو اپنے مال محض لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتے ہیں اور در حقیقت نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ روزِ آخر پر۔ سچ ہے کہ شیطان جس کا رفیق ہوا اُسے بہت ہی بُری رفاقت میسر آئی۔" (سورہ ۴: آیات ۳۶-۳۸)

"اے نبیؐ! اُن سے کہو کہ آؤ میں تمہیں سناؤں تمہارے رب نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں: یہ کہ اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمہیں رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے، اور بے شرمی کی باتوں کے قریب نہ جاؤ، خواہ وہ کُھلی ہوں یا چُھپی، اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ۔ یہ باتیں ہیں جن کی ہدایت اُس نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو اور یہ کہ مالِ یتیم کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو بہترین ہو یہاں تک کہ وہ اپنے سنِ رشد کو پہنچ جائے اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو، ہم ہر شخص پر ذمہ داری کا اتنا ہی بار رکھتے ہیں جتنا اُس کے امکان میں ہے اور جب بات کہو انصاف کی کہو خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا کیوں نہ ہو اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ ان باتوں کی ہدایت اللہ نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم نصیحت قبول کرو نیز اُس کی ہدایت یہ

ہے کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اُس کے راستے سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کر دیں گے۔ یہ ہے وہ ہدایت جو تمہارے رب نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم کج روی سے بچو۔

(سورہ ۶ : آیات ۱۵۱ - ۱۵۳)

اللہ عدل اور احسان اور صلۂ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق لو۔ اللہ کے عہد کو پورا کرو جبکہ تم نے اُس سے کوئی عہد باندھا ہو، اور اپنی قسمیں پختہ کرنے کے بعد توڑ نہ ڈالو جبکہ تم اللہ کو اپنے اوپر گواہ بنا چکے ہو۔ اللہ تمہارے سب افعال سے باخبر ہے۔ (سورہ ۱۶ : آیات ۹۰ - ۹۱)

جو شخص بھی نیک اعمال کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ ہو وہ مومن، اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو اُن کے اجر اُن کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے۔

(سورہ ۱۶ : آیت ۹۷)

اے نبیؐ! اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ، اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو۔ تمہارا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اُس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہِ راست پر ہے۔ (سورہ ۱۶ : آیت ۱۲۵)

اور اُس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہو گی جس نے اللہ کی طرف بُلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ اور اے نبیؐ! نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اُس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا

ہے۔ (سورہ ۴۱ : آیات ۳۴-۳۶)

جو کچھ بھی تم لوگوں کو دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی چند روزہ زندگی کا سروسامان ہے، اور جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی۔ وہ اُن لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں، جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور اگر غصہ آجائے تو درگزر کر جاتے ہیں، جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں، ہم نے جو کچھ بھی رزق انہیں دیا ہے اُس میں سے خرچ کرتے ہیں، اور جب اُن پر زیادتی کی جاتی ہے تو اُس کا مقابلہ کرتے ہیں —— بُرائی کا بدلہ ویسی ہی بُرائی ہے، پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے اُس کا اجر اللہ کے ذمّہ ہے، اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جو لوگ ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیں اُن کو ملامت نہیں کی جا سکتی۔ ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتیاں کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ البتہ جو شخص صبر سے کام لے اور درگزر کرے، تو یہ بڑی اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے۔

(سورہ ۴۲ : آیات ۳۶-۴۳)

جو کوئی (اس دنیا میں) جلدی حاصل ہونے والے فائدوں کا خواہش مند ہو، اُسے یہیں ہم دے دیتے ہیں جو کچھ بھی جسے دینا چاہیں، پھر اُس کے مقسوم میں جہنم لکھ دیتے ہیں جسے وہ تاپے گا ملامت زدہ اور رحمت سے محروم ہو کر۔ اور جو آخرت کا خواہش مند ہو اور اس کے لیے سعی کرے جیسی کہ اس کے لیے سعی کرنی چاہیے، اور ہو وہ مومن، تو ایسے ہر شخص کی سعی مشکور ہو گی۔ ان کو بھی اور اُن کو بھی، دونوں فریقوں کو ہم دنیا میں سامانِ زیست دیے

جا رہے ہیں، یہ تیرے رب کا عطیہ ہے، اور تیرے رب کی عطا کو روکنے والا کوئی نہیں ہے۔

تو اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ بنا ورنہ ملامت زدہ اور بے یار و مددگار بیٹھا رہ جائے گا۔

تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ: تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو، مگر صرف اُس کی۔ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اگر تمہارے پاس اُن میں سے کوئی ایک، یا دونوں، بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں اُف تک نہ کہو، نہ انہیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ اُن سے احترام کے ساتھ بات کرو۔

اور نرمی اور رحم کے ساتھ اُن کے سامنے جُھک کر رہو، اور دُعا کیا کرو کہ "پروردگار، اُن پر رحم فرما جس طرح اُنہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔

تمہارا رب خُوب جانتا ہے کہ تمہارے دلوں میں کیا ہے۔ اگر تم صالح بن کر رہو تو وہ ایسے سب لوگوں کے لیے درگزر کرنے والا ہے جو اپنے قصور پر متنبہ ہو کر بندگی کے رویّے کی طرف پلٹ آئیں۔

رشتہ دار کو اُس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو اُس کا حق۔ فضول خرچی نہ کرو۔ فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔

اگر ان سے یعنی (حاجت مند رشتہ داروں، مسکینوں اور مسافروں سے) تمہیں کترانا ہو، اس بنا پر کہ ابھی تم اللہ کی اس رحمت کو جس کے تم امیدوار ہو تلاش کر رہے ہو، تو انہیں نرم جواب دے دو۔"

نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھو اور نہ اسے بالکل ہی کھُلا چھوڑ دو کہ ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ۔

تیرا رب جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور انہیں دیکھ رہا ہے۔

اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی۔ درحقیقت ان کا قتل ایک بڑی خطا ہے۔

زنا کے قریب نہ پھٹکو۔ وہ بہت بُرا فعل ہے اور بڑا ہی بُرا راستہ۔

قتلِ نفس کا ارتکاب نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ۔ اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو اُس کے ولی کو ہم نے قصاص کے مطالبے کا حق عطا کیا ہے پس چاہیئے کہ وہ قتل میں حد سے نہ گزرے، اُس کی مدد کی جائے گی۔

مالِ یتیم کے پاس نہ پھٹکو مگر احسن طریقے سے، یہاں تک کہ وہ اپنے شباب کو پہنچ جائے۔ عہد کی پابندی کرو، بے شک عہد کے بارے میں تم کو جواب دہی کرنی ہوگی۔

پیمانے سے دو تو پورا بھر کر دو، اور تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو۔ یہ اچھا طریقہ ہے اور بلحاظِ انجام بھی یہی بہتر ہے۔

کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو۔ یقیناً آنکھ، کان اور دِل سب ہی کی باز پُرس ہونی ہے۔

زمین پر اکڑ کر نہ چلو، تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو، نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔

ان امور میں سے ہر ایک کا بُرا پہلو تیرے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہے یہ وہ حکمت کی باتیں ہیں جو تیرے رب نے تجھ پر وحی کی ہیں۔ اور دیکھ! اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ بنا بیٹھ ورنہ تُو جہنم میں ڈال دیا جائے گا ملامت زدہ اور

ہر بھلائی سے محروم ہو کر۔

(سورہ ۱۷ : آیات ۱۸ - ۳۹)

ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی کہ اللہ کا شکر گزار ہو۔ جو کوئی شکر کرے اُس کا شکر اُس کے اپنے ہی لیے مفید ہے اور جو کفر کرے تو حقیقت میں اللہ تعالیٰ بے نیاز اور آپ سے آپ محمود ہے۔ یاد کرو جب لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا تو اُس نے کہا "بیٹا خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، حق یہ ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے"۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے۔ اُس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اُسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اُس کا دُودھ چھُوٹنے میں لگے۔ (اسی لیے ہم نے اُس کو نصیحت کی کہ) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجالا۔ میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے لیکن گر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تُو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو اُن کی بات ہرگز نہ مان۔ دنیا میں اُن کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ مگر پیروی اُس شخص کے راستے کی کر جس نے میری طرف رجوع کیا ہے۔ پھر تم سب کو پلٹنا میری ہی طرف ہے، اُس وقت میں تمہیں بتا دُوں گا کہ تم کیسے عمل کرتے رہے ہو (اور لقمان نے کہا تھا کہ) "بیٹا، کوئی چیز رائی کے دانہ برابر بھی ہو اور کسی چٹان میں یا آسمانوں یا زمین میں کہیں چھپی ہوئی ہو، اللہ اُسے نکال لائے گا۔ وہ باریک بیں اور باخبر ہے۔ بیٹا، نماز قائم کر، نیکی کا حکم دے، بدی سے منع کر، اور جو مصیبت بھی پڑے اُس پر صبر کر۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کی بڑی تاکید کی گئی ہے اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر، نہ زمین پر اکڑ کر چل، اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا۔ اپنی چال میں اعتدال اختیار کر، اور اپنی آواز ذرا پست رکھ، سب آوازوں سے زیادہ بُری آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے۔

(سورہ ۳۱ : آیات ۱۲ - ۱۹)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو، امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ سے تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمہیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے۔ پھر کیا تم اِن چیزوں سے باز رہو گے ؟

(سورہ ۵ : آیات ۹۰ - ۹۱)

جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دُنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر۔ احسان کر جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے، اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کر، اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔

(سورہ ۲۸ : آیت ۷۷)

ان منتخب آیات کی تائید میں قرآنِ کریم ہی کی بہت سی دوسری آیات اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پیش کی جا سکتی ہیں۔ تاہم محولہ بالا آیات بجائے خود اسلام کے بنیادی اخلاقی اصولوں کی وضاحت کے لیے کافی ہیں۔ اخلاقیات کے یہ اسلامی اصول اپنی نوعیت کے اعتبار سے ہر قسم کے حالات میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان اصولوں سے محض اس لیے روشناس نہیں کرایا کہ ان کو وقتاً فوقتاً سراہا جاتا رہے بلکہ اس لیے کہ ان پر سختی سے عمل کیا جائے اور ان کو موثر بنایا جائے۔ ان کا مقصد ایک فرد کو اپنی شخصیت کی تعمیر اور کردار کی تربیت نہایت صحت مند انداز میں کرنے اور خدا، جو کہ تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے، کے ساتھ اپنا تعلق استوار کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اخلاقیات کے اسلامی اصولوں کا مقصد فرد کو دھمکانا اور اُسے مجہول یا معاشرے سے بے تعلق بنانا ہرگز نہیں۔ اس نقطۂ نظر کی وضاحت ایک مثال سے ہوتی ہے۔ اگر کسی مسلمان کے ساتھ زیادتی یا تشدد ہوتا ہے تو اسے اس بات کا پورا اختیار حاصل

ہے کہ چاہے تو مزاحمت کرے اور زیادتی کرنیوالے سے برابر کا بدلہ لے یا پھر اُسے معاف کر دے اور اُس کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دے ۔ وہ جانتا ہے کہ اُسے ان دونوں میں سے کوئی ایک راستہ اختیار کرنے کا پورا حق حاصل ہے ۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اُس کے لیے معاف کر دینا بہتر ہے ۔ چنانچہ جب وہ معاف کر دیتا ہے تو وہ آزادانہ اپنی مرضی سے صرف اللہ کی محبت میں ایسا کرتا ہے ۔ اسی طرح جب وہ بدلہ لیتا ہے تو وہ قانونِ الٰہی کی خلاف ورزی یا کسی ناانصافی کا مرتکب نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف اپنے حقوق کا دفاع کرتا ہے اور ایسا کرنا بجائے خود ایک مقدس فرض ہے اور اس طرح وہ امن و انصاف قائم کرنے میں اربابِ اختیار کی مدد کرتا ہے ۔ اگر اسلام مظلوم سے حتمی معافی کا مطالبہ کرتا جس طرح بعض دوسرے مذاہب نظریاتی طور پر کرتے ہیں تو بہت سے غیر مہذب یا غیر تربیت یافتہ افراد کو زیادتی کرنے اور حد سے تجاوز کرنے کی ترغیب ملتی ۔ بالکل اسی طرح اگر اسلام مجرم سے ہر حالت میں بدلہ لینے کا حکم دیتا جس کی بعض دوسرے مذاہب سختی سے تعلیم دیتے ہیں تو اس صورت میں نہ تو رحم و برداشت کی اور نہ روحانی اصلاح اور اخلاقی تربیت کی کوئی گنجائش باقی رہتی ۔ اس طرح انسان کی بہت سی اعلیٰ خوبیاں دب کر رہ جاتیں اور بہت سی اخلاقی صلاحیتوں کو کبھی جامۂ عمل نہ پہنایا جا سکتا ۔

یہ ایک جانی پہچانی حقیقت ہے کہ جن لوگوں کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ اپنے مجرموں کو ہر حال میں معاف کر دیں وہ ان تعلیمات پر عمل نہیں کرتے اور شاید کبھی نہیں سکتے کیونکہ ایسا کرنا انجامِ کار انسانیت کے مفاد میں نہیں ہے اور نہ یہ خود اخلاقیات ہی کے مفاد میں ہے ۔ اسی طرح جن لوگوں کو سختی سے بدلہ لینے کی تعلیم دی جاتی ہے اُن کی نظر میں انسانی خوبیوں کا کوئی احترام نہیں رہتا اور وہ اخلاقی اقدار کو آفاقی قوانین کا درجہ نہ دیتے ہوئے ان کی پرواہ نہیں کرتے لیکن اسلام نے جو کہ فطرتِ انسانی کی پرورش کرنے والا ہے انسانی مسائل کا صحیح حل پیش کیا ہے ۔ ایسے مجرم جو ایک اور موقع حاصل کرنے کے خواہش مند ہوں اور انہیں معاف کر دینے سے اُن کی اصلاح ہو سکتی ہو اور وہ اس موقع سے فائدہ اُٹھا سکتے ہوں ، تو اسلام اُن کے لیے

عفو و درگزر سے کام لینے کی سفارش کرتا ہے اور انہیں معاف کر دینے کو ترجیح دیتا ہے۔ لیکن ایسے مجرمین جو معافی کے محرکات کو صحیح طور پر نہ سمجھ سکتے ہوں اور معافی پانے کے بعد دوبارہ جرم کی طرف راغب ہونے کا میلان رکھتے ہوں اُن کے لیے برابر کی انتقامی کارروائی کی اجازت دی گئی ہے چنانچہ ہر دو صورت میں مسلمان کا رویّہ مناسب اور سودمند ہے۔ جب وہ معاف کر دیتا ہے تو خدا کی خوشنودی حاصل کرتا ہے، اپنی بالادستی برقرار رکھتا ہے اور مجرم کی اصلاح میں اپنا حصّہ ادا کرتا ہے اور جب وہ بدلہ لیتا ہے تو اپنے حق کا دفاع کرتا ہے، امن و انصاف قائم کرتا ہے اور بُرائی کو پکڑنے اور اس کی روک تھام میں مدد دیتا ہے۔ اب دیکھیے کہ صحیح اخلاقی رویّہ کون سا ہے؟ آیا اُس شخص کا رویّہ جو بے رحمانہ طریقے سے بدلہ لیتا ہے اور ایک سے دوسرے مجرم میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھتا، یا ایک مسلمان کا رویّہ جس میں رحم اور معافی کی گنجائش اور غیر معمولی حالات سے عہدہ برآ ہونے کی لچک پائی جاتی ہے؟ یہ بھی دیکھیے کہ اخلاقی لحاظ سے کون شخص زیادہ بلند ہے؟ آیا وہ شخص جو اس لیے معاف کرتا ہے کہ اُسے بدلہ لینے کی اجازت ہی نہیں ہے یا ایک مسلمان جو یہ جانتے ہوئے معاف کر دیتا ہے کہ اُسے بدلہ لینے کا قانونی حق حاصل ہے؟ اب بتائیے کہ اصل معافی کون سی ہے؟ آیا وہ معافی جو بیرونی دباؤ کا نتیجہ ہے اور اس سے ہٹ کر دوسرا راستہ انتخاب کرنے کی اجازت ہی نہیں یا وہ معافی جو آزادانہ پسند اور آزادانہ راہِ عمل منتخب کرنے کا نتیجہ ہے؟ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ اسلام کے اخلاقی اصول جاندار، منفرد اور تصرف پذیر ہیں۔ یہ اصولی ہدایات ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تمام نیکیوں اور اخلاقیات کا منبع و سرچشمہ ہے۔

تصوّرِ کائنات

اس کتاب کے پیش لفظ میں ہم نے مغربی نصف کرۂ ارض میں مسلمانوں کے مقام اور اسلام کے مستقبل کا مختصراً ذکر کیا تھا۔ ان سطور میں ہم عصرِ حاضر میں انسان کے مقام، عالمِ انسانیت کی عمومی حالت اور کائنات یا دُنیا سے متعلق اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کریں گے۔ اس سے

اُن نظریات کی مزید تائید ہوگی جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے، کچھ نئے خیالات سامنے آئیں گے اور زیرِ بحث موضوع کے مختلف پہلو یکجا ہو کر اہم نکات کے اعادے کا کام دیں گے۔

ہمیں کہنا پڑے گا کہ موجودہ انسانی صورتِ حال چونکا دینے والی ہے۔ یہ صورتِ حال دنیا بھر کے نیک نیت لوگوں اور مردانِ خدا سے اس امر کی متقاضی ہے کہ وہ اس طرف خصوصی توجہ مبذول کریں اور حالات میں مثبت تبدیلی لانے کے لیے موثر عملی اقدام کریں۔ لیکن ہمیں اس صورتِ حال سے مایوس اور بے تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ امید کا عنصر اسلام کا ایک اہم جزو ہے اور ہمیشہ رہا ہے۔

(حوالہ کے لیے دیکھیے قرآن کا سورہ ۱۲ : آیت ۸۷ ، سورہ ۶۵ : آیت ۳)

دورِ جدید کے مسائل اور بحران کلیتہً منفرد یا انوکھے نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مشکل، پیچیدہ اور تکلیف دہ ہیں اور ان کی یہ نوعیت جس قدر آج سنگین ہے اس سے پہلے شاید کبھی نہ تھی۔ لیکن عصرِ حاضر اور گذشتہ صدیوں کے حالات میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ بنیادی طور پر درجے کا ہے نوعیت کا نہیں۔ موجودہ زمانے کے خطرات اور ان کی پیچیدگیوں میں مسلسل اضافے کی زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ ہماری توقعات اور اہلیتوں میں بھی اسی قسم کا اور اسی تناسب سے اضافہ ہوا ہے۔

گذشتہ کئی صدیوں تک کرۂ ارض کے متعدد علاقوں میں مشکل ترین بحرانوں کا بنیادی اور سب سے بڑا سبب اجنبی، مختلف اور غیر ملکی اقوام کا ایک دوسرے کے ساتھ غیر لچکدار، مغائرانہ اور متعصبانہ رویّہ رہا ہے۔ اس نئے تاریخی عمل نے نسل پرستی، احساسِ برتری، تعصب، جانب داری اور اس نوع کے دیگر بہت سے ناگوار رویّوں کو فروغ دیا۔

بہت کم لوگ اس حقیقت سے انکار کریں گے کہ پورا عالمِ انسانیت ایک غیر معمولی بحران سے دوچار ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ انسانی بحران ہماری خارجی، بیرونی اور مادی کارگزاریوں اور ہمارے داخلی، باطنی اور اخلاقی کاوشوں کے مابین شدید عدم توازن کی پیداوار ہے۔ کوئی بات

اس سے زیادہ آسان نہیں کہ توازن برقرار رکھنے کی تلقین کی جائے، افراط و تفریط سے بچنے کی تاکید کی جائے اور میانہ روی کے لیے جہاد کرنے کا پرچار کیا جائے۔ لیکن اس راہِ عمل پر چلنے سے زیادہ مشکل کوئی اور کام بھی نہیں۔ ماضی میں اس قسم کے نعروں مثلاً "انسان صرف روٹی پر زندہ نہیں رہ سکتا" کا اس قدر غلط استعمال کیا گیا کہ اس سے انسان کی مادی فلاح کو نظر انداز کرنے کا مفہوم لیا جانے لگا۔ اسی طرح توکّل علی اللہ کو غلط معنی پہنائے گئے۔ اس سے عام طور پر انسان کا مجبورِ محض ہونا، تقدیر پرستی اور نفیِ ذات مراد لی جاتی ہے۔ روحانیت اور عزلت گزینی پر ضرورت سے زیادہ زور دینے سے مادیت پرستی، عقلیت پرستی، آزادہ روی اور اس قسم کے دوسرے متقابل نظریات کا فروغ ایک قدرتی امر ہے۔ اگر روحانیت پر ایک خاص حد سے زیادہ زور دیا جائے تو توہم پرستی اور ذہنی پراگندگی کے لیے راہ ہموار ہوتی ہے۔ اسی طرح خلافِ روحانیت نظریات پر حد سے زیادہ زور مادیت پرستی کو بدعنوانی میں، آزاد خیالی کو بدچلنی میں اور عقلیت پرستی کو غرور و تکبر میں تبدیل کر سکتا ہے۔ گذشتہ چند صدیوں کی تاریخ جسے روحانیت کے مقابلے میں عقل و دانش کی ترقی کا عہد کہا جا سکتا ہے انہی رجحانات کی عکاسی کرتی ہے۔

حالیہ عشروں کے دوران روحانیت کی میزان اونچی نیچی ہوتی رہی ہے۔ ۱۹۶۰ء سے اب تک خلائی تحقیق کے واقعات جن کی ماضی میں کوئی نظیر نہیں ملتی خبروں کا اہم موضوع بنے ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اتنی ہی سنسنی خیز تحقیق خواہ ہم اُسے جنون ہی سے تعبیر کریں زندگی کی داخلی اور باطنی کیفیات سے متعلق ہوئی ہے۔

تحقیق و مطالعہ کی یہ دو بے مثال اور غیر متوازن شاخیں غیر معمولی طور پر تشویشناک ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ امرِ واقعہ ہے کہ ان کا ایک دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق دکھائی نہیں دیتا۔ ان کی ترقی کا عمل مختلف سمتوں میں ہو رہا ہے۔ یہ بظاہر ایک دوسرے سے مربوط نہیں، ایک دوسرے کے لیے باعثِ تقویت نہیں اور ایک دوسرے کی نشوونما کرنے سے یکسر

جاری ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا غیر یقینی اور غیر متوازن وجود لوگوں کی اکثریت کے لیے ایک مستقل خطرہ ہے۔ یہ صورتِ حال دنیا کو جذباتی تضاد اور افراتفری کی طرف لے جاسکتی ہے جس سے معاشرتی مسائل شدت اختیار کر سکتے ہیں اور آج کا انسان سخت مشکل میں گرفتار ہو سکتا ہے لیکن اگر خارجی دنیا کی سائنسی تحقیق اور انسان کی داخلی کیفیات کی تحقیق میں ہم آہنگی پیدا کر دی جائے تو متذکرہ خطرناک راستہ اپنا رُخ تبدیل کر سکتا ہے۔ انسان صرف روٹی پر زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ بات بہت حد تک درست ہے لیکن وہ صرف عبادات یا دعاؤں پر بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ بیک وقت معاشرتی یا مادی مخلوق بھی ہے اور روحانی اقدار کا جویندہ بھی۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے یہ بات بالکل واضح ہے کہ آج کی دنیا کو کئی قسم کے مسائل نے پریشان کر رکھا ہے لیکن ان مسائل سے نمٹنے کے لیے جو متضاد قسم کی تشخیصات اور نسخے تجویز کیے جاتے ہیں وہ بھی آج کی دنیا کے لیے کچھ کم پریشان کن نہیں ہیں۔ بعض لوگ وہی پُرانا راگ الاپے چلے جاتے ہیں مثلاً "آج دُنیا کو جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ہے باہمی پیار محبّت ...." وغیرہ۔ بعض لوگ نئے انسان کے ظہور پذیر ہونے کی آس لگائے بیٹھے ہیں۔ بعض مارکسزم، انسان دوستی، شیطنت یا سائنس پرستی کو انسانی مسائل کا اصل حل تصوّر کرتے ہیں۔ کچھ لوگ کسی نجات دہندہ کی آمد کے منتظر ہیں۔ مختلف نظریات کے حامل لوگوں کی اس طویل فہرست میں وہ لوگ شامل نہیں جو اس معاملے میں غیر جانب داری، مایوسی اور بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور جن کی تعداد تمام رجائیت پسند گروہوں کی مجموعی تعداد سے کہیں زیادہ ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج کے دور کی سب سے بڑی اور اشد ضرورت سمجھ بوجھ کو ترقی دینے کی ہے۔ انسان کو سب سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی ذات اور فطرت کو سمجھے، اپنی صلاحیتوں اور اپنے حدود کو پہچانے، کائنات میں اپنے مقام اور عناصرِ کائنات کے ساتھ اپنے تعلق کا ادراک حاصل کرے۔

اب سوال یہ ہے کہ اپنی ذات کا ادراک حاصل کرنے، اپنے ذہن کی گرہیں کھولنے اور دھندلائی ہوئی نظر کو روشن کرنے میں اسلام کس طرح انسان کی مدد کرتا ہے؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے ضروری ہے کہ اسلام کے بنیادی تصورات جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے اچھی طرح ذہن نشین کر لیے جائیں اور اسلامی نظامِ اقدار کے بعض نکات کی مزید وضاحت کی جائے۔ اس قسم کا تجزیہ واضح کر دے گا کہ یہ تصورات عہدِ جدید کی خطرناک صورتِ حال میں آج کے انسان سے کس طرح ہم آہنگ ہیں اور موجودہ صورتِ حال سے نکلنے میں اُس کے لیے کس طرح مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

اسلام کی ایک سب سے نمایاں خصوصیت اعتدال پسندی یا میانہ روی ہے۔ اس خصوصیت کا بہترین اظہار اُس وقت ہوتا ہے جب اسلام فطرتِ انسانی، مقصدِ حیات اور تصورِ خدا کا نظریہ پیش کرتا ہے۔ اسلام "انسان دوستی" کے فلسفے کی یک طرفہ حمایت نہیں کرتا جو انسان کو لائقِ پرستش بنا دیتا ہے اور اس سے آگے کچھ تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام اس یک طرفہ نظریے کی بھی تصدیق نہیں کرتا کہ انسان خلقی طور پر ناقص الفطرت، بُرا یا گناہگار ہے۔ اسلام اس نظریے کو بھی رد کرتا ہے کہ زندگی قابلِ نفرین، بہیمانہ، مختصر اور اندوہناک ہے۔ لیکن دوسری طرف اسلام اس نظریے کا بھی مخالف ہے کہ زندگی مقصود فی الذات، مسرتوں سے لبریز اور لاابالی ہے۔ ان تمام نظریات سے ہٹ کر اسلام زندگی کو ایک مثبت مفہوم اور ایک اعلیٰ مقصد عطا کرتا ہے۔ زندگی کا تعلق صرف آخرت سے جوڑنا دنیاوی زندگی کی قدر و منزلت کم کرنے کے مترادف ہو گا۔ زندگی صرف "یہاں اور اب"، وقتی عیش و نشاط اور فوری مسرتوں سے عبارت نہیں اور نہ یہ آخرت میں منزلِ جنت تک پہنچنے کی صرف ایک رہگذر ہے۔ اسلام اس دنیا میں انسان کی حالت اور آخرت میں اُس کی منزل ہر دو سے واسطہ رکھتا ہے۔ یہ واسطہ بلاشک و شبہ ایک متناسب واسطہ ہے۔ یہ زندگی کے ہر مرحلے کی قدر و منزلت انسان کی عمومی فلاح پر اس مرحلۂ زندگی کے اثرات کے مطابق متعین کرتا ہے۔

حوالے کے لیے دیکھیے قرآن کا سورہ ۷، آیت ۳۳ ، سورہ ۱۷ : آیات ۱۸-۲۱ ،
سورہ ۲۸ : آیت ۷۷ ، سورہ ۵۷ : آیات ۲۰-۲۱)

قرآنِ حکیم کے سورہ بقر کی آیات ۲۷ تا ۳۹ بہت سی دوسری آیات کی طرح کائنات کا ایک مخصوص تصور پیش کرنے میں خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ ان آیات میں اسلام کے بعض بنیادی اصول بیان کیے گئے ہیں اور ان اصولوں کی روشنی میں تصورِ کائنات کا اسلامی نقطۂ نظر بیان کیا گیا ہے۔ ان میں سے چند ایک نمایاں اصول درج ذیل ہیں۔

۱۔ کائنات ایک موزوں وجود ہے جسے ایک عظیم نقاش کی مشیّت نے تخلیق کیا ہے اور اُسی نے اسے بامعنی مقصد کے لیے برقرار رکھا ہوا ہے۔ اس میں حقیقی تبدیلیاں اُسی کی مشیّت کے مطابق رُونما ہوتی ہیں اور یہ اُسی کے بنائے ہوئے اٹل قوانین کے تابع رہتی ہیں۔ یہ تبدیلیاں محض اتفاقیہ امر کا نتیجہ نہیں اور نہ انہیں بے سوچے سمجھے اور بے ترتیب واقعات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ انسان کو بھی خدا نے تخلیق کیا ہے اور اُسے روئے زمین پر خدا کا نائب مقرر کیا ہے۔ اُسے یہ منصب اس لیے عطا کیا گیا ہے کہ وہ زمین کی کاشت کرے اور اپنی زندگی کو علم، نیکی، مقصدیت اور معنویت سے معمور کرے۔ اس نصب العین کے حصول کے لیے زمین اور آسمانوں میں ہر شے اُسی کے لیے پیدا کی گئی ہے اور اُس کے تابع کر دی گئی ہے۔ کرۂ ارض انسانی زندگی کے لیے قید خانہ نہیں۔ دُنیا میں اُس کا ظہور اُس کے سابقہ گناہوں کی پاداش میں دی گئی من مانی سزا نہیں ہے نہ اُسے کسی دوسری دُنیا سے بطورِ سزا نکال کر اس دُنیا میں لا پھینکا گیا۔ اُس کا وجود محض اتفاق یا بے سوچا سمجھا وقوعہ نہیں ہے۔

۳۔ علم انسان کی ایک منفرد خصوصیت ہے اور یہ اُس کی شخصیت اور وجود کا ایک لازمی جزو ہے۔ یہ علم ہی ہے جو انسان کو خالق کا نائب ہونے کے اہل بناتا ہے اور اُسے خدا کے

ملائک کے لیے بھی احترام و اطاعت کا سزاوار ٹھہراتا ہے۔

۴۔ کرۂ ارض پر انسانی زندگی کے پہلے مرحلے کا آغاز خالقِ اکبر کے خلاف کسی گناہ یا بغاوت کی پاداش میں نہیں ہوا۔ جنتِ عدن سے انسان کا نزول اور بعدازاں جو کچھ ہوا مثلاً آدمؑ و حوا کی پشیمانی اور ندامت، خدا کا عفو و درگزر سے کام لینا اور اُن پر رحم فرمانا، انسان اور شیطان کے مابین عداوت وغیرہ —— یہ سب کچھ خالقِ اکبر کے لیے کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی اور نہ واقعات کے تسلسل میں کوئی ناگہانی واقعہ تھا۔ اس کے برعکس یہ واقعہ اس قدر معنویت و مقصدیت کا حامل تھا کہ اسے محض حادثے کا نام نہیں دیا جا سکتا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا اور اس کا مقصدِ اولین انسان کو نظم و ضبط کا پابند بنانا اور اُسے ہبوط و صعود، اخلاقی شکست و فتح اور خدا کے راستے سے انحراف اور اُس سے دوبارہ مصالحت کے عملی تجربے سے گزارنا تھا۔ اس طریقۂ کار کی بدولت انسان زمینی زندگی کے لیے بہتر طور پر تیار ہو سکتا تھا اور دنیا میں پیش آنے والے غیر یقینی حالات اور آزمائشی لمحات کا مقابلہ زیادہ روشن خیالی اور کامیابی سے کرنے کے قابل ہو سکتا تھا۔

۵۔ حوّا پہلے انسانی جوڑے کی کمزور فریق نہیں تھی۔ اُس نے نہ تو حضرت آدمؑ کو شجرِ ممنوعہ کا پھل کھانے کی ترغیب دی اور نہ وہ جنتِ عدن سے اخراج کی تنہا ذمہ دار تھی۔ آدمؑ و حوّا دونوں میں مساوی طور پر شجرِ ممنوعہ کا پھل کھانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ یوں وہ دونوں اس گناہ کے برابر کے ذمہ دار ہیں۔ دونوں پشیمان اور نادم ہوئے۔ دونوں کو اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا اور اُن پر اپنا رحم فرمایا۔ یہ بات بہت اہم ہے کیونکہ اس وضاحت سے حوّا اُس ملامت سے آزاد ہو جاتی ہے جس کا مُدتوں تک اُسے اور اُس کی جنس کو سزاوار ٹھہرایا جاتا رہا ہے۔ وہ اس الزام سے بھی بری الذمہ ہے کہ آدم کے زمین پر اُتارے جانے کی وہی تنہا یا زیادہ ذمہ دار ہے۔ مزید برآں اِس سے

یہ بات بھی قطعی طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ عورت کی اخلاقی کمزوری کا عقیدہ بالکل ہی بے بنیاد ہے اور عورت اور مرد کے بارے میں دوہرا معیار قائم کرنا کلیتہً ناانصافی پر مبنی ہے۔ قرآن مجید دوسرے معاملات کی طرح اس معاملے میں بھی پوری طرح وضاحت کر دیتا ہے کہ مرد اور عورت دونوں مساوی طور پر خوبی اور خامی سے متصف ہیں، مساوی طور پر حساس ہیں اور مساوی طور پر لائق ستائش ہیں۔

۶۔ انسان ایک آزاد اور با اختیار کارندہ ہے۔ اُس کی یہی خصوصیت انسانیت کی روحِ رواں اور اپنے خالق کے سامنے جواب دہی کی بنیاد ہے۔ انسانی اختیار کے بغیر زندگی بے معنی ہو کر رہ جاتی اور انسان کے ساتھ اللہ کا معاہدہ بیکارِ محض ہوتا۔ اگر انسان کو اپنے اعمال و افعال پر اختیار نہ ہوتا تو اس کا مطلب تھا کہ خدا اپنے مقصد کو خود ناکام بنا رہا ہے اور انسان کوئی بھی ذمہ داری اٹھانے کے قابل نہ ہوتا۔ بیشک اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

۷۔ زندگی کا ظہور خدا کی ذات سے ہُوا ہے۔ زندگی نہ تو دائمی ہے اور نہ مقصود فی الذات۔ بلکہ یہ تو ایک عبوری مرحلہ ہے جس کے بعد سب کو خدا کی طرف لوٹنا ہے۔

۸۔ انسان ایک ذمہ دار کارندہ ہے لیکن گناہ کی ذمہ داری تنہا اصل مجرم کو اٹھانا ہوتی ہے۔ گناہ اپنی فطرت میں موروثی، انتقال پذیر یا اجتماعی نہیں ہے۔ ہر فرد اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے اور اگر انسان بُرائی قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو وہ اس سے اپنا دامن چھڑانے اور اپنی اصلاح کرنے کی اہلیت بھی رکھتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام فرد کو معاشرے پر ترجیح دیتا ہے۔ معاشرت سے منقطع ہو کر فرد کی انفرادیت بالکل بے معنی یا ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ایک فرد کو کئی قسم کے کردار ادا کرنا ہوتے ہیں۔ اُس کے لیے لازمی ہے کہ وہ ہر کردار اس طرح

---

۵ اسی باب میں تصورِ گناہ کا بیان ملاحظہ کیجیے۔

ادا کرے جس سے اُس کی اخلاقی سالمیت اور شناخت کا تحفظ ہو سکے، خدا کے حقوق پورے کر سکے اور اپنی معاشرتی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکے۔

۹۔ انسان ایک باوقار اور قابلِ احترام ہستی ہے۔ وہ باوقار اور قابلِ احترام اس لیے ہے کہ اُس میں خالقِ اکبر کی روح پھونکی گئی ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ وقار کسی خاص نسل، رنگ یا طبقے کے لوگوں تک محدود نہیں۔ یہ ہر انسان کا ایک فطری حق ہے جو روئے زمین پر باقی تمام مخلوقات سے زیادہ قابلِ احترام ہے۔

۱۰۔ سب سے آخری اور حتمی بات یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کی محوّلہ بالا آیات اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ خدا کی وحدانیت اور بنی نوعِ انسان کے اتحاد کی جڑیں اس کائنات میں بڑی گہرائی تک اتری ہوئی ہیں۔ اس سے مزید ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی اعلیٰ ترین خوبیاں تقویٰ اور علم ہیں اور جب وہ یہ علم حاصل کرتا ہے اور اسے الوہی ہدایت کے مطابق استعمال کرتا ہے تو اُسے آخرت میں سرخرو ہونے کی ضمانت مل جاتی ہے اور اُس کی زندگی سکون و طمانیت کی دولت سے مالا مال ہو جاتی ہے۔

باب سوم

ایمان کا اطلاق

اس باب میں ہم ایمان کے اُن خاص معمولات پر بحث کریں گے جن کا ذکر اسلام نے کیا ہے۔ ان میں نماز (صلوٰۃ)، روزہ (صوم)، صدقہ وخیرات (زکوٰۃ) اور زیارتِ کعبہ (حج) شامل ہیں۔ اگر ان معمولات کو اُسی طرح سرانجام دیا جائے جس طرح اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے تو ان سے تمام روحانی مقاصد اور انسانی ضروریات کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اِن میں سے بعض معمولات روزانہ کے ہیں، بعض ہفتہ وار، بعض ماہانہ، بعض ششماہی، بعض سالانہ اور بعض ایسے ہیں جن کو زندگی بھر میں کم از کم ایک بار ادا کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ ان معمولات کا تعلق ہفتہ کے تمام ایام سے، مہینے کے تمام ہفتوں سے، سال کے تمام مہینوں سے اور زندگی کے تمام برسوں سے ہے اور سب سے بڑھ کر یہ معمولاتِ اسلام زندگی کے پورے سفر کو رشتۂ اُلوہیت میں پرو دیتے ہیں۔

اس سے پہلے مذکور ہو چکا ہے کہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے ایمان بغیر عمل کے ایک بے مقصد سی شے ہے۔ اپنی فطرت کے لحاظ سے ایمان نہایت حساس ہوتا ہے اور مؤثر ترین قوت بن سکتا ہے لیکن جب اس کو عمل میں نہ لایا جائے یا اس سے کام نہ لیا جائے تو یہ بہت جلد اپنا اثر اور قوتِ تحریک کھو دیتا ہے۔ ایمان کو زندہ کرنے اور اس سے تکمیل مقصد کرانے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ اسے بروئے کار لایا جائے۔ عمل ایمان کی نشوونما کرتا ہے، اسے بقا دیتا ہے اور ایک اثر آفرین قوت بناتا ہے۔ اس کے بدلے ایمان انسان کو وف

شعاری میں راسخ اور عمل میں ثابت قدم بناتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان اور عمل کے درمیان ایک گہرا اور مضبوط تعلق پایا جاتا ہے اور ان کا ایک دوسرے پر انحصار قابلِ فہم ہے۔ ایمان سے عاری شخص کے پاس تحریک کا کوئی حقیقی سرچشمہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ اُس کے پیشِ نظر کوئی اعلیٰ مقصد بھی نہیں ہوتا جس کے حصول کے لیے وہ تگ و دو کرے اور نہ اُس کے دل میں کسی اعلیٰ نصب العین کی کوئی اُمنگ ہی ہوتی ہے۔ ایسے شخص کی زندگی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ صرف "آج" میں زندہ رہتا ہے جو کوئی زندگی نہیں ہے۔ دوسری طرف جو شخص ایمان رکھتا ہے لیکن اس کے عملی تقاضے پورے نہیں کرتا وہ خود فریبی میں مبتلا ہے اور درحقیقت وہ صاحبِ ایمان نہیں۔ اس صورت میں اس کی حیثیت ایک بے یار و مددگار بھٹکے ہوئے راہی سے زیادہ نہیں ہوتی۔

اسلام میں ایمان اور عمل کے مابین جو تعلق قائم ہے اُس کے واضح اثرات مذہب کے پورے ڈھانچے پر مرتب ہوتے ہیں اور یہ باہمی تعلق اسلامی تعلیمات کے گہرے فلسفے کی عکاسی کرتا ہے۔ اسلام جان اور جسد، روح اور مادے اور مذہب اور زندگی کے درمیان کسی بھی قسم کی تفریق کو تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام انسان کو اسی حالت میں قبول کرتا ہے جس حالت میں خدا نے اُسے پیدا کیا ہے اور اس کی فطرت کو روح اور جسم کا امتزاج تسلیم کرتا ہے۔ یہ اس کی روحانی فطرت کو نظر انداز نہیں کرتا۔ بصورتِ دیگر انسان اور دوسرے حیوانات میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اسلام انسان کی جسمانی اور مادی ضروریات کی اہمیت کو کم نہیں کرتا کیونکہ ایسا کرنا اُسے فرشتہ سمجھنے کے مترادف ہوگا جو کہ وہ نہیں ہے اور نہ بن سکتا ہے۔ اسلام کے مطابق انسان تخلیقی دھارے کے مرکز میں کھڑا ہے یعنی وہ تمام تخلیقات کا محور ہے۔ وہ خالصتہً روحانی مخلوق نہیں ہے کیونکہ خالص روحانی ہستیاں تو فرشتے ہیں، اور نہ وہ اُن روحانی ہستیوں سے ماورا ہے کیونکہ ان سے ماورا تو صرف خدا کی ذات ہے۔ انسان مکمل طور پر مادی یا جسدی نہیں ہے کیونکہ اس زمرے میں آنے والی تخلیقات تو حیوانات اور دوسری غیر ناطق مخلوقات ہیں۔ انسان

ایک تکمیلی مخلوق ہے جس کی فطرت مادی بھی ہے اور روحانی بھی، اخلاقی بھی ہے اور جسمانی بھی۔ لہٰذا اس کے تقاضے اور ضروریات بھی دوگونہ ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ متوازی حالت میں رہتی ہیں۔ جو مذہب انسان کو خدا کے قریب لانے میں مدد دے سکتا ہے وہ لامحالہ طور پر ایک ایسا مذہب ہی ہو سکتا ہے جو انسان کے تمام تقاضوں اور ضروریات کا خیال رکھے، جو اُس کے روحانی مرتبے کو بلند کرے اور اُس کی جسمانی یا مادی خواہشات کو نظم و ضبط میں لائے۔ یہ مذہب دین اسلام ہے۔ انسانی فطرت کے کسی ایک پہلو کو دبانے یا توازن کو بگاڑنے یا کسی ایک سمت میں زیادہ مائل ہونے کا عمل انسانی فطرت میں غلط قسم کا تضاد پیدا کرنے یا خدا کی بنائی ہوئی انسانی فطرت سے غیر ذمہ دارانہ سرکشی اختیار کرنے کے مترادف ہوگا۔

چونکہ اسلام انسانی فطرت کو اُس کی اصلی حالت میں پوری طرح تسلیم کرتا ہے اور انسان کی روحانی اور مادی فلاح میں گہری دلچسپی لیتا ہے اس لیے اسلام مذہب کو کسی کا ذاتی معاملہ یا زندگی کی عام روش سے ہٹ کر ایک الگ وجود تسلیم نہیں کرتا۔ دوسرے لفظوں میں اگر اس کی تعلیمات کے ٹھوس اثرات افراد کی ذاتی اور اجتماعی زندگی پر مرتب نہیں ہوتے تو مذہب کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ بعینہٖ زندگی اگر غیر منظم ہے اور الوہی قانون کے مطابق بسر نہیں ہو رہی تو یہ بے معنی ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام زندگی کے ہر شعبے میں نظم و ضبط کا شعور کیوں اجاگر کرتا ہے خواہ اس شعبے کا تعلق فرد کی ذات سے ہو یا اجتماعی رویّے سے، محنت کشی سے ہو یا صنعت سے، اقتصادیات سے ہو یا سیاسیات سے، قومی زندگی سے ہو یا بین الاقوامی تعلقات سے وعلیٰ ہٰذا القیاس۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام سیکولرزم یا مذہب کی انسان کے روزمرہ کے معاملات سے علیحدگی کو کیوں تسلیم نہیں کرتا۔ صحیح مذہب اور بامقصد زندگی کے درمیان بڑا اہم تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام خدائے رحیم و کریم کی منشا کے مطابق تمام انسانی سرگرمیوں کو ٹھوس اور صحت مند انداز میں منظم کرنے کے لیے

زندگی کے تمام شعبوں میں سرایت کر جاتا ہے۔

سچے مذہب اور روزمرہ زندگی کے مابین اس لازمی تعلق کے نتیجے میں اسلام اس عقیدے کو تسلیم نہیں کرتا کہ "چھ دن میرے لیے یا دنیا کے لیے اور ایک دن خدا کے لیے"۔ انجام کار اس عقیدے کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی اور اس سے مذہب کی شگفتگی ماند پڑ جاتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ عقیدہ خدا کے ساتھ انسان کی سخت ناانصافی کا مظہر ہے اور اس سے انسانی روح شدید طور پر مجروح ہوتی ہے۔ یہ عقیدہ روحانی اور اخلاقی ضروریات کو نظر انداز کر دیتا ہے جبکہ یہ ضروریات مادی ضروریات سے اگر زیادہ نہیں تو کسی طرح کم اہم بھی نہیں ہیں۔ اس عقیدے سے فطرتِ انسانی خطرناک انتشار سے دوچار ہو جاتی ہے اور انسان کی ذات میں اس طرح کا کوئی بھی عدمِ توازن پستی اور بگاڑ کی علامت ہے۔ اسی طرح اگر انسان ہفتے کے چھ دن رہبانیت یا صرف اعتکاف کے لیے اور ایک دن اپنے لیے مخصوص کر لے تو اس میں بھی اُس کے لیے کوئی بہتری نہیں ہوگی کیونکہ اس صورت میں بھی توازن بگڑ جائے گا۔ چنانچہ فطری اور منطقی راستہ وہی ہے جو اسلام نے بتایا ہے۔ انسان چونکہ دُہری فطرت کا مالک ہے اور مادی اور روحانی ہر دو قسم کے تخلیقی دھارے کے مرکز میں کھڑا ہے اس لیے اگر وہ اپنی روح اور جسم میں سے کسی ایک کو نظر انداز کرتا ہے یا کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دیتا ہے تو وہ شدید مشکلات سے دوچار ہو جائے گا۔ دونوں کی نشوونما کرنا اور دونوں کی متوازن اور صحتمند انداز میں تعمیر کرنا انسان کی حسِ انصاف وسالمیتِ کردار اور اُس کی قوتِ آزادی اور راستبازی کی سب سے کڑی آزمائش ہے اور اس آزمائش میں کامیاب ہونے میں انسان کی مدد کرنے کے لیے اور اُس کی نجات کے لیے اسلام ایمان کے معمولات کا ایک سلسلہ پیش کرتا ہے۔ معمولات کا یہ سلسلہ آئندہ سطور میں پیش کیا جا رہا ہے۔

نماز (صلوٰۃ)

نماز کا مقصد

نماز اسلام کا ایک ستون ہے اور اسے دین کی اساس سمجھا جاتا ہے۔ کوئی بھی مسلمان جو نماز ادا نہیں کرتا اور اس کے پاس ترکِ نماز کا کوئی معقول عذر نہیں ہے وہ سنگین جرم اور سخت گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ یہ جرم اس لیے سنگین ہے کہ یہ صرف خدا کے خلاف ہی نہیں (اگرچہ یہ بھی کوئی کم قبیح جرم نہیں) بلکہ خود انسان کی اپنی فطرت کے خلاف بھی ہے۔ یہ بات انسان کی جبلّت میں شامل ہے کہ وہ عظیم ہستیوں کی پرستش پر مائل اور بلند مقاصد کا آرزومند ہوتا ہے۔ سب سے عظیم ہستی اور سب کی بلند ترین منزلِ مقصود خدا کی ذات ہے۔ انسان میں ایک مضبوط شخصیت کی تعمیر کرنے اور اس کی امنگوں کو پوری طرح ترقی یافتہ شکل میں جامۂ عمل پہنانے کا بہترین طریقہ اسلامی نماز ہے۔ نماز کو نظر انداز کرنا گویا فطرتِ انسانی میں پائی جانے والی اعلیٰ خوبیوں کو دبانا اور اُسے پرستش و محبت کے حق، آرزومندی اور سربلندی کے حق، نیکی میں سبقت لے جانے کے حق اور اعلیٰ مقاصد کے حصول کے حق سے غیر منصفانہ طور پر محروم کرنا ہے۔ یہ جبر و رَد ایک نہایت سنگین اور تباہ کن جُرم ہے۔ یہ ہے انسان کی زندگی میں نماز کی اہمیت اور قوت۔

ہمیں یہ بات کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ خدا کو انسان کی نماز کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ وہ بے نیاز اور ہر قسم کی ضرورتوں سے آزاد ہے۔ اُسے ہر حالت میں صرف ہماری خوشحالی اور فلاح میں دلچسپی ہے۔ جب وہ نماز کی ضرورت پر زور دیتا ہے اور اُسے ہم پر فرض کر دیتا ہے تو وہ ہماری مدد کرنا چاہتا ہے کیونکہ ہم جو نیکی بھی کرتے ہیں اُس میں ہمارا اپنا فائدہ ہے اور ہم جس جرم کا بھی ارتکاب کرتے ہیں وہ ہماری اپنی روح کو مجروح کرتا ہے۔

یہاں بھی مرکزی اہمیت انسان ہی کو حاصل ہے اور اُسی کے مفادات کو اصل محور کار رکھا گیا ہے۔ انسان اسلامی نماز سے جو فائدہ حاصل کر سکتا ہے اُس کا اندازہ کرنا مشکل ہے اور نماز کی برکات انسانی تصور سے باہر ہیں۔ یہ محض ایک نظریہ یا تقلیدی فعل نہیں بلکہ ایک سحور کن حقیقت اور روحانی تجربہ بھی ہے۔ اسلامی نماز کی اثر آفرینی کی وضاحت کچھ اس طرح کی جا سکتی ہے۔

۱۔ یہ خدا کے وجود اور اُس کے سراپا خیر ہونے کے عقیدے کو تقویت بخشتی ہے اور اس عقیدے کو دل کی گہرائیوں میں اتار دیتی ہے۔

۲۔ یہ اس عقیدے کو زندگی عطا کرتی ہے اور اسے انسان کی عملی زندگی میں ایک تعمیری عنصر کی شکل دیتی ہے۔

۳۔ یہ انسان کی فطری اور جبلی امنگوں کی تکمیل میں مدد دیتی ہے اور اس طرح اُس میں عظمتِ کردار، اعلیٰ اخلاقیات، شرف و فضیلت اور پارسائی جیسی صفات پیدا کرتی ہے۔

۴۔ یہ قلب کی تطہیر اور ذہن کی تعمیر کرتی ہے۔ ضمیر کی تربیت اور روح کی طمانیت کا سامان فراہم کرتی ہے۔

۵۔ یہ انسان میں اچھے اور مہذب عناصر کی آبیاری اور قبیح و ناشائستہ میلانات کی سرکوبی کرتی ہے۔

اگر ہم اسلامی نماز کا تجزیہ اور اس کی منفرد نوعیت کا مطالعہ کریں تو ہم پر منکشف ہوگا کہ یہ محض مخصوص جسمانی حرکات یا قرآنی آیات کی خالی خولی تلاوت کا نام نہیں بلکہ ذہنی ارتکاز، روحانی خشوع و خضوع، اخلاقی بلندی اور جسمانی کسرت کے امتزاج کا ایک لاثانی اور بے نظیر فارمولا ہے۔ یہ ایک خاص الخاص تجربہ ہے جس میں انسانی جسم کا ہر حصہ روح اور ذہن کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر اللہ تعالیٰ کی تحمید و تمجید میں شریک ہوتا ہے۔ کوئی بھی شخص اسلامی عبادت کا مکمل مفہوم الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس کے باوجود نماز کے ضمن میں حسب ذیل نکات کا ذکر کیا جا

سکتا ہے۔

۱۔ یہ نظم و ضبط اور قوتِ ارادی کا درس دیتی ہے۔

۲۔ خدا اور تمام اعلیٰ مقاصد کے ساتھ وفاشعاری کا عملی مظاہرہ ہے۔

۳۔ یادِ خدا کا ذریعہ اور اُس کے احسان کا مستقل مظہر ہے۔

۴۔ روحانی بالیدگی اور اخلاقی پختگی کا بیج ہے۔

۵۔ زندگی کے صحیح اور سیدھے راستے کی نشاندہی کرتی ہے۔

۶۔ فحاشی، بدی، بے راہروی اور گمراہی سے تحفظ دیتی ہے۔

۷۔ سچی مساوات، ٹھوس اتحاد اور اخوت کا مظاہرہ ہے۔

۸۔ خدا کا شکر بجالانے اور اُس کی قدردانی کا اظہار ہے۔

۹۔ اندرونی سلامتی اور استحکام کا راستہ ہے۔

۱۰۔ تحمل و برداشت، حوصلہ مندی، امید اور اعتماد کا بھرپور ذریعہ ہے۔

یہ ہے اسلامی عبادت یا نماز اور اُس کے اثرات جو وہ انسان پر مرتب کرتی ہے۔ اس بیان کی بہترین تصدیق نماز کے تجربے سے گزرنے اور اس کی روحانی مسرتیں حاصل کرنے سے ہی ہو سکتی ہے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے انسان نماز کے صحیح مفہوم سے واقف ہو سکتا ہے۔

نماز کی شرائط

نماز کی ادائیگی ہر اس مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے جو:

۱۔ صحیح العقل اور ذمہ دار ہو۔

۲۔ ذہنی اور جسمانی طور پر پختہ ہو اور سنِ بلوغت میں قدم رکھ چکا ہو۔ عام طور پر چودہ سال کی عمر میں پختگی آجاتی ہے (والدین کو چاہیے کہ جب بچہ سات سال کی عمر کو پہنچ جائے تو اُسے

نماز کی ترغیب دیں اور جب وہ دس سال کا ہو جائے تو اُسے نماز پڑھنے کی تاکید کریں)

۳. کسی شدید عارضہ میں مبتلا نہ ہو اور عورتیں جب حالتِ حیض میں نہ ہوں اور بچے کی پیدائش کی صورت میں زچگی کی مدت پوری کر چکی ہوں۔ حیض اور زچگی کی زیادہ سے زیادہ مدت بالترتیب دس دن اور چالیس دن ہے۔ ان دونوں حالتوں میں خواتین نماز کی ادائیگی سے مکمل طور پر مستثنیٰ ہیں۔

نماز کے لیے مندرجہ ذیل شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر نماز جائز نہیں ہوگی۔

۱. وضو کرنا جس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

۲. پورے جسم، لباس اور نماز کے لیے استعمال ہونے والی جگہ کا ہر قسم کی گندگی اور غلاظت سے پاک صاف ہونا۔

۳. موزوں لباس اخلاقی ضابطوں کے مطابق پہننا جس سے ستر پوشی کا مقصد حاصل ہوتا ہو۔ مرد کے لیے ناف سے گھٹنوں تک کا حصہ ڈھکا ہوا ہونا ضروری ہے۔ عورتوں کے لیے چہرے، ہاتھوں اور پاؤں کے سوا پورا جسم ڈھکا ہونا ضروری ہے۔ مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ باریک لباس جس سے جسم کی نمائش ہوتی ہو سے احتراز کریں۔

۴. نماز کی نیت باندھنا اور جب بھی ممکن ہو دل اور زبان سے اس کا اقرار کرنا۔

۵. قبلہ یعنی کعبہ (جو مکہ میں ہے) کی درست سمت رُخ کرنا۔ درست سمت کا تعین کرنے کے بہت سے طریقے ہیں۔ اگر کسی شخص کے پاس کعبہ کی سمت معلوم کرنے کے ذرائع موجود نہیں تو وہ اپنے بہترین قیاس سے کام لے سکتا ہے۔

نماز کی اقسام

نماز کی مختلف اقسام درج ذیل ہیں۔

۱۔ فرض نمازیں جن میں روزانہ کی پنجگانہ نمازیں، نمازِ جمعہ اور نمازِ جنازہ شامل ہیں کسی معقول عذر کے بغیر ان نمازوں کی ادائیگی نہ کرنا ایک سنگین اور قابلِ سزا گناہ ہے۔

۲۔ واجب اور سنت نمازیں جو فرض نمازوں کے ساتھ ادا کی جاتی ہیں اور جن میں عیدین کی اجتماعی نمازیں شامل ہیں۔ ان نمازوں کو ترک کرنا موجبِ عتاب اور لائقِ ملامت طرزِ عمل ہے۔

۳۔ نفل نمازیں۔ یہ اختیاری نمازیں ہیں جو دن یا رات کے کسی بھی حصہ میں ادا کی جا سکتی ہیں۔ ان نمازوں کی ادائیگی کے لیے دو اوقات خاص طور پر لائق ترجیح ہیں —— رات کے آخری حصہ سے لے کر صبح صادق سے ذرا پہلے تک کے اوقات اور دوپہر کے اوقات۔

نماز کے اوقات

ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے روزانہ پانچ نمازیں بروقت ادا کرنا ضروری ہے۔ تاہم بعض معقول وجوہات کی بنا پر کوئی شخص نماز سے مستثنیٰ ہو سکتا ہے، اکٹھی نمازیں ادا کر سکتا ہے یا وقتی طور پر قضا کر سکتا ہے۔ نماز کے اوقات یہ ہیں۔

۱۔ نمازِ فجر

یہ نماز صبح صادق اور طلوعِ آفتاب کے درمیانی عرصے میں کسی بھی وقت ادا کی جا سکتی ہے۔ یہ دورانیہ تقریباً دو گھنٹے کا ہوتا ہے۔

۲۔ نمازِ ظہر

اس نماز کا وقت زوالِ آفتاب کے فوراً بعد شروع ہوتا ہے اور زوالِ آفتاب اور غروب

آفتاب تک کے دورانیے کی تقریباً نصف مدت تک رہتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر سورج شام سات بجے غروب ہوتا ہے تو نمازِ ظہر کا وقت دوپہر کے بارہ بجے سے قدرے بعد شروع ہو جائے گا اور سہ پہر کے ساڑھے تین بجے سے ذرا بعد تک رہے گا۔ اس کے بعد جلد ہی اگلی نماز کا وقت شروع ہو جائے گا۔ تاہم ہر نماز کا صحیح وقت بتانے کے نقشے موجود ہیں اور اگر ایسا کوئی نقشہ سرِ دست مہیا نہ ہو تو بہترین قیاس سے کام لینا چاہیے۔

۳۔ نمازِ عصر

نمازِ ظہر کا وقت ختم ہوتے ہی نمازِ عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے اور غروبِ آفتاب تک رہتا ہے۔

۴۔ نمازِ مغرب

اس نماز کا وقت غروبِ آفتاب کے فوراً بعد شروع ہو جاتا ہے اور مغربی اُفق پر شفق کے غائب ہونے تک رہتا ہے۔ عام طور پر یہ عرصہ ایک گھنٹہ اور بیس یا تیس منٹ کا ہوتا ہے۔

---

[1] اُن علاقوں میں جہاں دِن چھوٹے ہونے پر روزمرہ کے معمولات میں آسانی کی خاطر گھڑیاں آگے کر دی جاتی ہیں، مسلمانوں کو نمازِ جمعہ کے وقت کا تعین کرنے میں کچھ مشکل پیش آ سکتی ہے۔ اس مسئلے کا آسان حل یہ ہے کہ نمازِ جمعہ کا وقت سارے سال کے لیے دوپہر کے سوا ایک بجے سے اڑھائی بجے کے درمیان مقرر کر لیا جائے۔ اسی طرح موسمِ سرما سے موسمِ گرما کے آنے پر وقت تبدیل کرنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ ہم اپنے مسلم بھائیوں کے لیے یہ طریقہ اپنانے کی بھرپور سفارش کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے ہفتہ وار شیڈول میں اسے مستقل جگہ دے سکیں۔ اتوار کے روز نمازِ ظہر کے اجتماع کے سلسلے میں بھی اسی طرح کی مطابقت پیدا کی جا سکتی ہے۔

۵۔ نمازِ عشاء

اس نماز کا وقت غربی افق پر شفق کے غائب ہونے سے شروع ہوتا ہے (غروبِ آفتاب کے قریباً ڈیڑھ گھنٹہ بعد) اور صبح صادق سے ذرا پہلے تک رہتا ہے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اسلام نے نماز کے اوقات اس طرح مقرر کیے ہیں کہ اس سے ہماری روحانی فرحت اور جسمانی نشوونما میں غیر معمولی طور پر موافقت پیدا ہوتی ہے اور جسمانی آسودگی کے ساتھ ذہنی سکون بھی حاصل ہوتا ہے۔ نمازِ فجر باقاعدگی سے صبح کے ناشتے کے وقت واجب الادا ہوتی ہے۔ نمازِ ظہر دوپہر کے کھانے کے وقت سے مطابقت رکھتی ہے۔ نمازِ عصر سہ پہر کی چائے یا کافی کے وقفے کے دوران ادا کی جاتی ہے۔ نمازِ مغرب تقریباً شام کے کھانے کے وقت اور نمازِ عشاء رات گئے واجب الادا ہوتی ہے جب ہم کوئی ہلکی پھلکی چیز کھانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ایک مسلمان ان نمازوں کی پابندی کر کے نہ صرف اپنے دن کا آغاز اور اختتام روحانی عمل سے کرتا ہے بلکہ دن بھر کے دوران بھی وقفے وقفے سے اپنی روح کی آبیاری کرتا رہتا ہے۔ اس طرح وہ مذہب اور زندگی میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ دن بھر اپنے اندر خدا کا وجود محسوس کرتا ہے، اپنے روزمرہ کے معاملات روحانی کیفیت میں نمٹاتا ہے اور اپنا اخلاقی عزو وقار مضبوط بنیادوں پر تعمیر کرتا ہے۔ مزید براں اسی طریقے سے مسلمان اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں میں ایک روحانی قوت سمو دیتا ہے اور یوں مذہب عملی زندگی کے تمام شعبوں میں جاری و ساری ہو جاتا ہے۔ یہ تجارتی مراکز اور دفاتر میں، گھروں اور کھیتوں میں، فیکٹریوں اور کارخانوں میں ایک فعّال قوت بن جاتا ہے۔ یہ ہر کاروباری حلقے میں اپنی روشنی پھیلاتا ہے۔ نماز کا یہ لائحہ عمل بے شک غیر معمولی نوعیت کا حامل ہے کیونکہ یہ خدا کا بنایا ہوا ہے اور اسلام کا پیش کردہ ہے۔

سب سے زیادہ پسندیدہ بات یہ ہے کہ نماز کا وقت ہوتے ہی اسے ادا کیا جائے کیونکہ

ہوسکتا ہے کہ بعض وجوہات کی بنا پر اس میں غیر متوقع تاخیر واقع ہوجائے یا اسے معرضِ التوا میں ڈال دیا جائے۔ یہ عبادات مقدس آزمائشیں ہیں۔ ان آزمائشوں میں کامیاب ہونے والوں کا انعام واکرام اتنا زیادہ ہے کہ اندازہ نہیں لگایا جاسکتا اور مسرت اتنی بے پایاں کہ تصور سے باہر۔ انہیں جو خوشی حاصل ہوتی ہے، جو سرور وہ محسوس کرتے ہیں اور جو اعزاز انہیں ملتا ہے، اس کا اظہار الفاظ میں نہیں کیا جاسکتا۔ دوسری طرف ان آزمائشوں میں شرکت نہ کرنا ایک قابلِ سزا گناہ ہے۔ نماز کا ترک کرنا سخت سزا، روحانی محرومی، ذہنی اذیت اور معاشرتی علیحدگی کا موجب ہے۔

نمازِ ظہر اور نمازِ عصر سفر یا بیماری کی حالت میں اکٹھی ادا کی جاسکتی ہیں۔ یہ اجازت مغرب اور عشاؔر کی نمازوں کے لیے بھی ہے۔

وضو

نماز ادا کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ انسان اچھی وضع قطع اور پاکیزہ حالت میں ہو۔ چنانچہ جسم کے وہ اعضاء جو عموماً گندگی، گرد یا دھوئیں وغیرہ کی زد میں رہتے ہیں ان کا دھونا ضروری ہے۔ صفائی کے اس عمل کو وضو کہتے ہیں۔ وضو کرنے کا مستحب طریقہ حسبِ ذیل ہے۔

۱۔ نیت کرنا کہ یہ فعل (وضو) اللہ تعالیٰ کی عبادت اور پاکیزگی کے لیے ہے۔

---

[۱] پہلی صورت میں دو نمازوں (ظہر اور عصر) کی اکٹھی ادائیگی ایک طرح کی پیشگی ادائیگی ہے۔ اس صورت میں نمازِ عصر اپنے وقت سے پہلے اور نمازِ ظہر کے فوراً بعد ادا کی جاتی ہے۔ دوسری صورت میں دو نمازوں (مغرب اور عشار) کی اکٹھی ادائیگی تاخیری ادائیگی ہے۔ اس صورت میں نمازِ مغرب صحیح وقت گزر جانے کے بعد اور نمازِ عشا سے فوراً پہلے ادا کی جاتی ہے۔ نمازوں کو اس طرح ملا دینے سے ان مسلمانوں کے لیے جو جائز وجوہات مثلاً سفر یا کام کی شغف وغیرہ کی بنار پر ہر نماز اپنے صحیح وقت پر ادا نہیں کرسکتے کسی نماز کے چھوٹ جانے کا خدشہ نہیں رہتا۔

۲۔ دونوں ہاتھوں کو کلائیوں تک تین بار دھونا۔

۳۔ تین بار منہ میں پانی بھر کر باہر نکالنا یعنی کُلّی کرنا اور اگر ممکن ہو تو دانتوں میں برش یا مسواک کرنا۔

۴۔ تین بار ناک میں پانی سڑک کر باہر نکالنا۔

۵۔ پورا چہرہ دونوں ہاتھوں سے تین بار دھونا۔ ممکن ہو تو پیشانی کے اوپر کے سرے سے ٹھوڑی کے نیچے تک اور ایک کان سے دوسرے کان تک دھونا۔

۶۔ دایاں بازو کہنی کے آخری حصّے تک تین بار دھونا اور اسی طرح بایاں بازو دھونا۔

۷۔ سارے سر کا یا اس کے کچھ حصّے کا ایک بار مسح کرنا یعنی سر پر گیلا ہاتھ پھیرنا۔

۸۔ کانوں کا مسح کرنا یعنی شہادت کی دونوں انگلیاں کانوں کے اندرونی حصوں میں اور انگوٹھے کانوں کے بیرونی حصوں پر پھیرنا۔ مسح کرتے وقت شہادت کی انگلیاں اور انگوٹھے پانی سے تر ہونے چاہئیں۔

۹۔ گردن کا مسح کرنا یعنی گیلے ہاتھ گردن کے چاروں طرف پھیرنا۔

۱۰۔ دونوں پاؤں کو تین تین بار ٹخنوں تک دھونا۔ پہلے دایاں پھر بایاں۔ دونوں پاؤں بائیں ہاتھ سے مَل کر دھونے چاہئیں۔

اس مرحلے پر وضو مکمّل ہو جاتا ہے اور باوضو شخص نماز کے لیے پوری طرح تیار ہے۔ اگر وضو درست طریقے سے کیا گیا ہو تو باوضو شخص جب تک چاہے اپنا وضو برقرار رکھ سکتا ہے اور ایک بار کیے ہوئے وضو سے وہ جتنی نمازیں چاہے پڑھ سکتا ہے۔ لیکن مناسب یہ ہے کہ جتنی بار ممکن ہو وضو نئے سرے سے کیا جائے اور اوپر بیان کردہ ترتیب کے مطابق کیا جائے۔ تاہم اگر کوئی شخص یہ ترتیب برقرار نہیں رکھ سکتا تو اس کا وضو بھی قابلِ قبول ہے۔ اس طریقے کے مطابق کیا ہوا وضو اس وقت تک نماز کے لیے کافی ہے جب تک یہ کسی وجہ سے ٹوٹ نہیں جاتا۔

وضو کا ٹوٹنا

مندرجہ ذیل چیزوں سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

۱۔ پیشاب، پاخانہ یا ریح وغیرہ کا اخراج ہونا۔

۲۔ جسم کے کسی حصے سے خون، پیپ یا اس قسم کی کوئی اور رطوبت نکل کر بہہ جانا۔

۳۔ قے ہونا۔

۴۔ سو جانا۔

۵۔ ادویات یا کسی نشہ آور چیز کے استعمال سے ہوش و حواس کھو بیٹھنا۔

اگر ان میں سے کوئی چیز واقع ہو جائے تو نماز کے لیے نئے سرے سے وضو کرنا ضروری ہے کیونکہ صفائی کے لیے ٹشو پیپرز وغیرہ کا استعمال پاکیزگی اور عبادت کے مقصد کے لیے کافی نہیں۔

وضو کا متبادل تیمم

تیمم سے مراد وضو یا غسل کے لیے پانی کی بجائے پاک مٹی کا استعمال ہے۔ تیمم مندرجہ ذیل صورتوں میں جائز ہے۔

۱۔ جب کوئی شخص بیمار ہو اور پانی استعمال نہ کر سکتا ہو۔

۲۔ جب کافی مقدار میں پانی دستیاب نہ ہو۔

۳۔ جب پانی کے استعمال سے نقصان پہنچنے یا کسی بیماری کے لگنے کا اندیشہ ہو۔

۴۔ جب وضو کرنے سے نمازِ جنازہ یا نمازِ عید (جن کا کوئی متبادل نہیں) کے قضا ہونے کا امکان ہو۔

مندرجہ بالا میں سے کسی بھی ایک صورت میں تیمم کرنا جائز ہے جس کا طریقہ یہ ہے:

۱۔ دونوں ہاتھ پاک مٹی یا ریت یا پتھر پر آہستگی سے مارنا۔

۲۔ پھر ہاتھ جھاڑ کر سارے منہ پر ایک بار اس طرح ملنا جس طرح وضو کرتے وقت ملا جاتا ہے۔

۳۔ دوبارہ مٹی پر ہاتھ مارنا۔ پھر دایاں ہاتھ کہنیوں تک بائیں ہاتھ سے ملنا اور بایاں ہاتھ کہنیوں تک دائیں ہاتھ سے ملنا۔

تیمّم وضو کی اہمیت کا ایک علامتی مظاہرہ ہے جبکہ وضو عبادت اور صحت ہر دو کے لیے ضروری ہے۔ اسلام نے وضو کی تکرار سے متعارف کرا کے انسان کو حفظانِ صحت کا ایک بہترین فارمولا دیا ہے جس کا تصوّر کسی دوسرے روحانی عقیدے یا طبی نسخے میں موجود نہیں تھا۔

وضو میں خصوصی مراعات

وضو کے سلسلے میں اسلام نے کچھ خاص آسانیاں رکھی ہیں۔ اگر کسی نے جرابیں یا ٹخنے پہن رکھے ہیں اور انہیں وضو کے بعد پہنا گیا ہے تو نیا وضو کرنے کے لیے ان کو اتارنا ضروری نہیں۔ ان کو اتارنے کی بجائے گیلے ہاتھ سے ان پر مسح کرنا کافی ہے۔ تاہم چوبیس گھنٹے میں ایک بار ان کو اُتار کر پاؤں دھونا ضروری ہے۔ اسی طرح اگر کسی نے بوٹ پہن رکھے ہیں اور اُن کے تلے اور ظاہری حالت صاف ہے تو پھر بھی اُن پر گیلے ہاتھوں سے مسح کرنا کافی ہے۔ اسی طرح اگر جسم کے کسی ایسے حصّے پر زخم ہے جس کا وضو میں دھویا جانا ضروری ہے لیکن اس حصّے پر پانی کا لگنا ضرر رساں ثابت ہو سکتا ہے تو زخم پر بندھی ہوئی پٹی کا گیلے ہاتھ سے مسح کرنے کی اجازت ہے۔

مکمّل غسل

مکمّل غسل میں پورا جسم دھویا جاتا ہے جس میں ناک میں پانی سُٹر کنا، منہ بھر کر کُلی کرنا اور سر کو دھونا بھی شامل ہے۔ اگر کوئی شخص مندرجہ ذیل میں سے کسی ایک حالت سے دوچار ہو چکا ہو تو اُس کے لیے نماز ادا کرنے سے پہلے مکمل غسل کرنا ضروری ہے۔

۱۔ جنسی اختلاط کے بعد

۲۔ سوتے میں مادۂ تولید کے اخراج کے بعد

۳۔ عورت کا ایامِ حیض کے اختتام پر

۴۔ بچہ جننے والی عورت کے لیے حالتِ زچگی کے اختتام پر۔ حالتِ زچگی کی زیادہ سے زیادہ مدت عام طور پر چالیس دن ہے۔ اگر یہ اس سے پہلے ختم ہو جائے تو مکمل غسل کرنا چاہیئے۔

یہاں اس بات کا ذکر کرنا مناسب ہوگا کہ غسل شروع کرنے سے پہلے یہ نیت بالکل واضح ہونی چاہیئے کہ غسل پاکیزگی اور عبادت کے مقصد کے تحت کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ وضو یا غسل کرنے والے کو اپنی زبان سے ایسے کلمات ادا کرنے چاہئیں جن سے اللہ تعالیٰ کی شان کا اور اس کی ہدایت حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار ہوتا ہو۔ اس قسم کے کلمات کی تفصیل مذہبی کتابوں میں مل جاتی ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص اصل کلمات سے واقف نہیں تو وہ اپنی طرف سے بہترین کلمات ادا کر سکتا ہے۔ اگر یہ کلمات اللہ تعالیٰ کی حمد میں ہیں اور خلوصِ دل سے ادا کیے گئے ہیں تو اتنا ہی کافی ہے۔

اذان

اوپر بیان کیے گئے طریقے کے مطابق غسل یا وضو کر لینے کے بعد اسلامی عبادت کی تیاری مکمل

ہو جاتی ہے۔ جب نماز کا وقت ہو جائے تو اذان کہنا ایک اچھی روایت ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ اذان کہنے کے لیے مؤذن قبلہ رو ہو کر کھڑا ہو جاتا ہے (مسلمانوں کا قبلہ مکّہ میں خانہ کعبہ ہے) اپنے دونوں ہاتھ کان تک اٹھاتا ہے اور یہ کلمات بلند آواز سے ادا کرتا ہے۔

اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ — ۱۔ اللہ سب سے بڑا ہے (چار مرتبہ)

اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ

اَشْہَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ — ۲۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی

اَشْہَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ — معبود نہیں۔ (دو مرتبہ)

اَشْہَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ — ۳۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ بے شک محمدؐ اللہ

اَشْہَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ — کے رسول ہیں (دو مرتبہ)

حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ — ۴۔ نماز کے لیے آجاؤ (دائیں طرف منہ پھیر کر دو مرتبہ)

حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ — ۵۔ کامیابی کی طرف آؤ (بائیں طرف منہ پھیر کر دو مرتبہ)

اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ — ۶۔ اللہ سب سے بڑا ہے (دو مرتبہ)

لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ — ۷۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔
(ایک مرتبہ)

اذانِ فجر میں مؤذن پانچویں حصہ حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ کے بعد اس جملے کا اضافہ کرتا ہے

اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ — نماز نیند سے بہتر ہے۔

اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ — (دو مرتبہ)

اس کے بعد موذن چھٹا اور ساتواں حصہ حسبِ دستور ادا کرتا ہے۔ یہ اضافی جملہ صرف فجر کے وقت ادا کیا جاتا ہے کیونکہ اُس وقت لوگ محوِ خواب ہوتے ہیں اور انہیں نماز کی یاد دہانی کی ضرورت ہوتی ہے۔

اقامت

جب اذان مکمل ہو جاتی ہے تو نمازی نماز کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور اس کا آغاز اعلانِ اقامت سے کیا جاتا ہے۔ اقامت کے کلمات بھی وہی ہے جو اذان کے ہیں جسے اوپر نقل کیا گیا ہے تاہم اقامت دو طرح سے اذان سے مختلف ہے۔

ا : ا[illegible]ت نسبتاً جلدی جلدی اور کم بلند آواز میں کہی جاتی ہے۔

ب : اذان کے پانچویں حصہ حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ کے بعد حسب دستور چھٹا اور ساتواں حصہ ادا کیا جاتا ہے۔

نماز کی ادائیگی

جب نمازی نے (غسل یا وضو سے) پاکیزگی حاصل کر لی ہو اور اذان اور اقامت ہو چکی ہو تو نماز کی ادائیگی اس طرح شروع ہوتی ہے۔

۱۔ نمازِ فجر

اس نماز میں پہلے دو سُنّت رکعتیں اور اس کے بعد دو فرض رکعتیں ادا کی جاتی ہیں۔ سُنّت اور فرض دونوں قسم کی رکعتیں ایک ہی طرح سے ادا کی جاتی ہیں سوائے اس کے کہ نیت کرتے وقت ان دو قسموں کی رکعتوں میں فرق کرنا ضروری ہے۔ نماز کی ادائیگی کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

پہلا عمل

نماز پڑھنے والے کو چاہیے کہ وہ احترام اور عجز کے ساتھ قبلہ رُو ہو کر کھڑا ہو جائے اپنے دونوں ہاتھوں کو کانوں تک اٹھائے اور سُنت نماز کے لیے کہے: نَوَیتُ اُصَلّی سُنّتَ الفجر (میں نیت کرتا ہوں فجر کی دو رکعت سنت نماز ادا کرنے کی) اور فرض نماز کے لیے کہے: نَوَیت اصلی فرض صلوٰۃ الفجر (میں نیّت کرتا ہوں فجر کی دو رکعت فرض نماز ادا کرنے کی) اس کے بعد اللہ اکبر کہہ کر دونوں ہاتھ ناف کے عین نیچے اس طرح رکھے کہ دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کے اوپر رہے[۳۴]۔ نماز کے لیے کھڑے ہونے کی اس حالت کو وقوف کہتے ہیں۔

دوسرا عمل

اس کے بعد دھیمی آواز میں یہ کلمات پڑھے۔

سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَآ اِلٰهَ غَيْرُكَ۔ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔

"اے اللہ تو پاک ہے اور بے عیب ہے۔ تو تعریف کے لائق ہے۔ تیرے نام میں بڑی برکت ہے۔ تیری شان سب سے اونچی ہے۔

---

۳۴ حالتِ وقوف میں ہاتھ باندھنے کا یہ طریقہ ایک مکتبِ فقہ کے مطابق ہے۔ دوسرے مکاتبِ کے نزدیک دوسرے طریقے لائقِ ترجیح (مستحب) ہیں تاہم ان تمام طریقوں میں معمولی فرق پایا جاتا ہے اور اس سے نماز کی صحت متاثر نہیں ہوتی۔ فی الحقیقت اس طرح کے تمام اختلافات آرام اور آسانی کے لیے ہیں نہ کہ رکاوٹ پیدا کرنے یا پابندیاں عائد کرنے کے لیے۔

تیرے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں ۔ میں شیطان مردود سے بچنے
کے لیے اللہ کی پناہ لیتا ہوں ۔ شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت
رحم کرنے والا اور مہربان ہے [۲]

تیسرا عمل

اس کے بعد دھیمی یا سنائی دینے والی آواز میں قرآنِ مجید کی پہلی سورت "الفاتحہ" کی تلاوت کرے۔ پھر قرآن میں سے کچھ آیات پڑھے (سورہ "الفاتحہ" اور قرآنی آیات کا تذکرہ کتاب کے اِسی حصے میں بعد میں آئے گا۔

چوتھا عمل

اس کے بعد اَللّٰہُ اَکْبَرُ (اللہ سب سے بڑا ہے) کہتے ہوئے آگے کو اس طرح جُھکے کہ دھڑ ٹانگوں کے ساتھ زاویۂ قائمہ بنائے اور اپنی ہتھیلیاں گُھٹنوں پر رکھے اور تین بار یہ کلمات کہے: "سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ" (میرا رب جس کی بہت بڑی شان ہے) اس حالت کو رکوع کہتے ہیں
اس کے بعد حالتِ قومہ میں آتے ہوئے یعنی کھڑا ہوتے ہوتے ہوئے یہ کلمات کہے:
سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ. رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ. (جو شخص اللہ کی تعریف کرتا ہے اللہ اُس کو سُنتا اور قبول کرتا ہے ۔ اے ہمارے پروردگار تیرے ہی لیے سب تعریفیں ہیں)۔ یہ کہتے ہوئے ہاتھ پہلوؤں پر نیچے کی سمت ہوں۔

---

[۲] نماز کا یہ حصہ مستحب ہے نماز کی تکمیل کے لیے لازمی نہیں ۔

پانچواں عمل

اس کے بعد نمازی "اَللّٰہُ اَکْبَرُ" کہتے ہوئے اس طرح نیچے جُھکے گا کہ اُس کے دونوں پاؤں کی انگلیاں، دونوں گھٹنے، دونوں ہاتھ اور پیشانی زمین کے ساتھ چھوئے گی۔ یہ حالتِ سجود ہے۔ اس حالت میں نمازی یہ کلمات تین بار کہے گا
سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی (میرا رب بلند مرتبے والا ہے ہر قسم کی برائی سے پاک ہے)

چھٹا عمل

اس کے بعد نمازی "اَللّٰہُ اَکْبَرُ" کہتے ہوئے جلوس یا جلسہ کی حالت اختیار کرے گا۔ یہ بیٹھنے کا ایک مختصر سا وقفہ ہے۔ حالتِ جلسہ میں بائیں پاؤں کا بالائی حصہ اور دائیں پاؤں کی انگلیاں (کھڑی حالت میں) زمین پر ٹکی ہوں گی اور دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے جائیں گے۔ اس کے بعد دوسرا سجدہ اُسی انداز میں اور انہیں کلمات کے ساتھ کیا جائے گا جس انداز میں اور جن کلمات کے ساتھ پہلا سجدہ کیا گیا تھا۔ اس دوسرے سجدے کے ساتھ ہی نماز کی ایک رکعت مکمل ہو جائے گی۔

ساتواں عمل

پہلی رکعت مکمل ہونے پر نمازی "اَللّٰہُ اَکْبَرُ" کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہو گا اور دوسری رکعت کے لیے حالتِ وقوف اختیار کرے گا اور پہلی رکعت کی طرح "الفاتحہ" اور اس کے بعد قرآنِ مجید کی کچھ آیات تلاوت کرے گا۔

آٹھواں عمل

پہلی رکعت کی طرح جب وہ دوسری رکعت کے دونوں سجدے ادا کرلے گا تو حالتِ قعدہ میں آئے گا۔ یہ وہی حالت ہے جو دو سجدوں کے درمیانی وقفے میں جلسہ کی ہوتی ہے۔ حالتِ قعدہ میں وہ تشہّد کے دونوں حصّوں کی زیرِ لب تلاوت کرے گا (تشہّد کا ذکر اسی حصّہ کے آخر میں آئے گا)

نواں عمل

آخر میں نمازی اپنا چہرہ دائیں طرف پھیرتے ہوئے کہے گا: "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ (تم پر سلامتی اور اللہ کی رحمت ہو)۔ پھر وہ اپنا چہرہ بائیں طرف پھیرتے ہوئے یہی کلمات دہرائے گا۔

یہ ہے دو رکعت نماز ادا کرنے کا طریقہ خواہ یہ فرض نماز کی ہوں یا سُنّت نماز کی۔ اس کی صحیح طریقے سے ادائیگی سیکھ جانے کے بعد دوسری نمازیں بہت آسان ہو جائیں گی۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ اسلامی عبادت میں ہر حرکت اور ہر لفظ اپنی اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتا ہے اور ایک گہری معنویت کی علامت ہے۔

۲۔ نمازِ ظہر

اس نماز میں چار رکعت سنت، چار رکعت فرض اور پھر دو رکعت سنت کی ہیں۔ اس نماز کی فرض رکعات کی ادائیگی کا طریقہ حسبِ ذیل ہے۔

(۱) فرض کی پہلی دو رکعتیں اُسی طرح ادا کی جائیں گی جس طرح نماز فجر میں ادا کی جاتی ہیں۔ فاتحہ اور قرآن کی اضافی آیات کی تلاوت دھیمی آواز میں کی جائے گی۔ رکوع

اور سجدے کی ادائیگی بھی اُسی طرح ہوگی۔

(ب) دوسری رکعت کے بعد تشہُّد پڑھتے ہوئے نمازی اُس کا پہلا حصہ پڑھنے کے بعد رُک جائے گا اور دوبارہ حالتِ وقوف اختیار کرے گا۔

(ج) پھر وہ تیسری رکعت میں صرف فاتحہ پڑھے گا اور اُس کے ساتھ اضافی قرآنی آیات کی تلاوت نہیں کرے گا۔

(د) جب وہ تیسری رکعت کے اختتام کو پہنچے گا تو چوتھی رکعت کے لیے حالتِ وقوف میں آئے گا اور تیسری رکعت کی طرح چوتھی رکعت میں بھی صرف فاتحہ پڑھے گا۔

(ر) رکوع و سجود کے بعد وہ حالتِ جلسہ اختیار کرے گا اور دو حصّوں پر مشتمل مکمل تشہُّد پڑھے گا۔

(س) پھر وہ دائیں اور بائیں سلام پھیرے گا۔

(ص) دو رکعت سنّت نماز ادا کرنے کا طریقہ وہی ہے جو نمازِ فجر میں ادا کرنے کا ہے لیکن اس نماز میں تلاوت زیرِلب دھیمی آواز میں کی جائے گی۔

۳۔ نمازِ عصر

نمازِ عصر چار رکعت سُنّت نماز اور چار رکعت فرض نماز پر مشتمل ہے۔ان رکعات کی ادائیگی کا طریقہ وہی ہے جو نمازِ ظہر کا ہے۔"الفاتحہ" اور قرآنِ مجید کی اضافی آیات کی تلاوت زیرِلب دھیمی آواز میں کی جائے گی۔

۴۔ نمازِ مغرب

نمازِ مغرب تین رکعت فرض اور دو رکعت سُنّت پر مشتمل ہے۔ فرض کی پہلی دو رکعت دھیمی یا قابلِ سماعت آواز میں پڑھی جاسکتی ہیں۔تیسری رکعت دھیمی آواز میں پڑھی جائے

گی ۔ یہ فرض رکعات بھی اُسی طریقے سے ادا کی جائیں گی جس طرح نمازِ ظہر یا نمازِ عصر کی فرض رکعات ادا کی جاتی ہیں سوائے اس فرق کے کہ چوتھی رکعت حذف کر دی جائے گی اور آخری حالتِ جلسہ تیسری رکعت کی فاتحہ، رکوع اور سجود کے بعد اختیار کی جائے گی جس کے اختتام پر سلام پھیرا جائے گا۔ اس کے بعد دو سنت رکعتیں اسی طرح ادا کی جائیں گی جس طرح نمازِ فجر میں کی جاتی ہیں۔

۵۔ نمازِ عشاء

نمازِ عشاء میں چار رکعت فرض، دو رکعت سنت اور تین رکعت وتر شامل ہیں اور وتر سنت رکعات سے زیادہ اہم اور فرض رکعات سے کم اہم ہیں۔ چار فرض رکعات کی پہلی دو رکعتیں دھیمی یا قابلِ سماعت آواز میں پڑھی جا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ فرض رکعات اُسی طرح ادا کی جائیں گی جس طرح ظہر یا عصر کی نماز میں ادا کی جا سکتی ہیں۔ دو سنّت رکعتوں کی ادائیگی کا طریقہ بالکل وہی ہے جو نمازِ فجر میں ادا کرنے کا ہے۔

جہاں تک تین وتر رکعات کا تعلق ہے ان کی ادائیگی بالکل اسی طرح ہوگی جس طرح مغرب کی تین فرض رکعات کی ہوتی ہے۔ البتّہ وتر میں یہ دو استثناء ہیں:

(ا) تیسری رکعت میں فاتحہ کے بعد قرآنی آیات تلاوت کی جائیں گی اور

(ب) رکوع کے بعد حالتِ قومہ اختیار کر کے سجدے میں جانے سے پہلے نمازی یہ کلمات پڑھے گا۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْتَعِيْنُكَ وَنَسْتَهْدِيْكَ وَنَسْتَغْفِرُكَ وَنَتُوْبُ اِلَيْكَ وَنُؤْمِنُ بِكَ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْكَ وَنُثْنِيْ عَلَيْكَ الْخَيْرَ كُلَّهٗ نَشْكُرُكَ وَلَا نَكْفُرُكَ وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَّفْجُرُكَ. اَللّٰهُمَّ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَلَكَ نُصَلِّيْ وَنَسْجُدُ وَاِلَيْكَ نَسْعٰى وَنَحْفِدُ. نَرْجُوْا

رَحْمَتَكَ وَنَخْشٰى عَذَابَكَ اِنَّ عَذَابَكَ بِالْكُفَّارِ مُلْحِقٌ وَصَلِّ اللّٰهُمَّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَسَلِّمْ۔

اسے دعائے قنوت کہتے ہیں اس کا مفہوم یہ ہے :

اے اللہ ہم تجھی سے مدد اور ہدایت مانگتے ہیں اور مغفرت چاہتے ہیں اور تجھ پر ایمان لاتے ہیں اور تجھ پر بھروسہ کرتے ہیں، اور تیری تعریف کرتے ہیں۔ تیرا شکر ادا کرتے ہیں اور ناشکری نہیں کرتے۔ جو شخص تیری نافرمانی کرتا ہے ہم اُس کو چھوڑ دیتے ہیں اور اس سے الگ ہو جاتے ہیں۔ اے اللہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور تیرے لیے نماز پڑھتے ہیں اور تجھی کو سجدہ کرتے ہیں، اور تیری طرف دوڑتے ہیں اور تیری خدمت بجالاتے ہیں تیری رحمت کے امیدوار ہیں اور تیرے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ بے شک تیرا عذاب کافروں کو ملنے والا ہے۔ اے اللہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، آپؐ کی آل اور آپ کے اصحابؓ پر رحمت بھیج۔

اگر دعائے قنوت یاد نہ ہو تو اس جیسی کوئی اور دُعا اُس وقت تک پڑھ لینا کافی ہے جب تک دعائے قنوت اچھی طرح ازبر نہیں ہو جاتی۔ تمام سنّت رکعات باجماعت نہیں بلکہ انفرادی طور پر ادا کی جاتی ہیں۔ سوائے عید کی نماز کے اور وتر صرف ماہِ رمضان کی تراویح میں باجماعت ادا کیے جاتے ہیں۔

جس شخص نے کچھ فرض نمازیں قضا کر دی ہوں اُسے سنّت نمازیں ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایسے شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ سُنّت نمازوں کی ادائیگی کی بجائے قضا شدہ فرض نمازیں ادا کرے۔ سُنّت نمازوں کی اُس وقت بھی ضرورت نہیں جب اُن کے ساتھ فرض نمازوں کا وقت گزر چکا ہو۔ پس اگر کسی شخص سے کوئی نماز چھوٹ

جاتی ہے اور وہ اس کی تلافی کرنا چاہتا ہے تو اُسے صرف فرض نمازیں ادا کرنا ہوں گی۔

اگر کوئی نمازی اپنی پوری نماز عربی زبان میں ادا کرنا نہیں جانتا تو وہ کسی دوسری زبان میں جس سے وہ واقف ہے ادا کر سکتا ہے بشرطیکہ اس زبان میں وہی مفہوم ادا ہو جائے جو کہ عربی زبان میں ہوتا ہے۔ فرض نماز کو امام کے پیچھے با جماعت پڑھنا زیادہ مستحب ہے۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ با جماعت نماز مسجد میں پڑھی جائے تاہم یہ دوسری جگہوں پر بھی پڑھی جا سکتی ہے۔

باجماعت نماز

۱۔ با جماعت نماز کسی امام کے اقتدار میں ادا کی جاتی ہے۔ امامت کے فرائض موجود نمازیوں میں سے کوئی شخص ادا کر سکتا ہے۔ امام کا انتخاب اس کے دینی علم اور تقویٰ کی بنیاد پر کرنا ضروری ہے۔

۲۔ جماعت کا امام سب سے آگے اکیلا کھڑا ہوتا ہے جبکہ مقتدی اُس کے پیچھے سیدھی صفوں میں قبلہ رُو کھڑے ہوتے ہیں۔ جماعت صرف دو اشخاص یعنی امام اور ایک مقتدی پر بھی مشتمل ہو سکتی ہے۔

۳۔ نمازِ فجر اور نمازِ مغرب کی پہلی دو رکعت میں امام اعلانِ نیت کے بعد فاتحہ اور اس کے ساتھ دیگر قرآنی آیات کی تلاوت بلند آواز میں کرتا ہے۔ جب امام قرآن مجید کی تلاوت بلند آواز میں کر رہا ہوتا ہے تو مقتدی انہماک اور عاجزی کے ساتھ اُس کی آواز سنتے ہیں۔ وہ امام کے پیچھے فاتحہ یا دوسری قرآنی آیات کی تلاوت نہیں کرتے۔

۴۔ جب امام فاتحہ مکمل کرتا ہے تو مقتدی "آمین" کہتے ہیں۔ جب امام رکوع سے حالتِ قومہ میں آتا ہے تو کہتا ہے سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ (جو شخص اللہ کی تعریف کرتا ہے وہ اس کو سنتا اور قبول کرتا ہے) اور مقتدی اس کا جواب ان کلمات سے

دیتے ہیں رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ (اے ہمارے پروردگار تیرے ہی لیے سب تعریفیں ہیں)

۵۔ مقتدیوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ امام کی حرکات کی پیروی کریں اور کسی متوقع عمل میں پہل نہ کریں۔ اگر کوئی شخص کسی فعل میں امام سے سبقت لے جاتا ہے تو اُس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔

۶۔ باجماعت نماز اس وقت تک درست نہیں ہوتی جب تک امام اپنی اس نیت کا اعلان نہ کرے کہ وہ امام کی حیثیت میں خدمت انجام دے رہا ہے۔ اسی طرح مقتدیوں کے لیے بھی اس نیت کا اعلان کرنا ضروری ہے کہ وہ اس امام کی پیروی میں فلاں نماز ادا کر رہے ہیں۔

۷۔ اگر کوئی شخص نماز شروع ہونے کے بعد پہنچتا ہے اور جماعت میں شامل ہو جاتا ہے تو اُس کے لیے ضروری ہے کہ امام کی پیروی کرے خواہ ایک یا ایک سے زیادہ رکعتیں اُس کے پہنچنے سے پہلے پڑھی جا چکی ہوں۔ جب امام نماز کے اختتام پر سلام پھیرے تو دیر میں پہنچنے والے کو سلام میں شامل نہیں ہونا چاہیے بلکہ حالتِ وقوف اختیار کر کے چھوٹ جانیوالی پہلی رکعتوں کی ادائیگی کرنی چاہیے۔ جب کوئی شخص نماز میں اُس وقت شریک ہوتا ہے جب جماعت رکوع کی حالت میں ہے اور ابھی قومہ میں نہیں آئی تو اس کی شمولیت آغازِ رکعت سے تصور کی جائے گی۔ لیکن اگر وہ رکوع کے بعد کسی مرحلے میں شریک ہوتا ہے تو اس سے مطلب لیا جائے گا کہ اُس سے وہ رکعت چھوٹ گئی ہے اُس پر لازم ہے کہ امام کی طرف سے نماز مکمل ہوتے ہی چھوٹی ہوئی ایک یا زیادہ رکعتیں انفرادی طور پر ادا کرے۔

مسلمان کو چاہیے کہ اُسے جب بھی باجماعت نماز ادا کرنے کا موقع ملے تو اسے ضائع نہ کرے۔ باجماعت نماز ایک خوبصورت مظاہرہ ہے مقصد و عمل میں یک جہتی کا۔

خدا کے آگے اجتماعی تقویٰ اور عجز کا، مسلمانوں میں مؤثر استحکام کا، معاشرتی نظم وضبط کا اور باہمی میل جول کا۔

اسلام کا اجتماعی نظامِ عبادات عالمِ انسانیت کے اُن حساس ترین مسائل کا مثبت حل پیش کرتا ہے جو نسلی امتیاز، معاشرتی اُونچ نیچ اور انسانی تعصبات کے نتیجے میں جنم لیتے ہیں۔ اسلام کی اجتماعی عبادت میں حاکم یا محکوم، امیر یا غریب، گورے یا کالے، اعلیٰ یا ادنیٰ، پچھلی نشستوں یا اگلی نشستوں، مخصوص نشستوں یا عام نشستوں میں کوئی تمیز نہیں کی جاتی۔ تمام عبادت گزار دنیاوی مرتبے کے لحاظ کے بغیر نہایت منظم طریقے سے شانے سے شانہ ملا کر کھڑے ہوتے اور عبادت کرتے ہیں۔

نمازِ جمعہ

اب تک ہم روزانہ کی نمازوں پر بحث کرتے آئے ہیں۔ اب ہم ہفتہ وار اجتماعی نماز یعنی نمازِ جمعہ کی طرف آتے ہیں۔ جمعہ کی عبادت ہر اُس شخص کے لیے جس پر دوسری نمازیں فرض ہیں اور جس کے پاس ترکِ نماز کا کوئی معقول اعتذار نہیں لازمی قرار دی گئی ہے۔ یہ نماز ہر ہفتے جمعہ کے روز پڑھی جاتی ہے اور حسبِ ذیل وجوہات کی بنا پر اسے خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

۱۔ نمازِ جمعہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے اجتماعی عبادت کا موقع مخصوص کیا ہے۔

۲۔ یہ نماز ہماری گذشتہ ہفتے کی روحانی کیفیات کا جائزہ لینے اور آئندہ ہفتے کے لیے تیاری کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے بالکل اسی طرح جس طرح لوگ اپنی دوسری کاروباری مصروفیات کے سلسلے میں کوئی ایک دن مخصوص کر لیتے ہیں۔

۳۔ یہ مسلمانوں کا ایک خصوصی اجتماع ہے جس میں وہ اپنے اندیشے دُور کرتے ہیں اور اخلاقی اور روحانی بنیادوں پر اپنے مذہبی رشتوں اور سماجی بندھنوں کی توثیق کرتے ہیں۔

۴۔ اس نماز سے یہ بات کُھل کر سامنے آجاتی ہے کہ مسلمان کس طرح اللہ کی آواز پر لبیک

کرتے ہیں اور اس کی عبادت کو اپنے تمام دوسرے معاملات پر ترجیح دیتے ہیں۔

نمازِ جمعہ کے اہم نکات

نمازِ جمعہ کے حسب ذیل اہم نکات ہیں

۱۔ اس کا وقت وہی ہے جو نماز ظہر کا ہے اور یہ نماز ظہر ہی کا بدل ہے۔

۲۔ اسے کسی امام کی اقتداء میں با جماعت ادا کرنا ضروری ہے۔ کوئی شخص اسے انفرادی طور پر یا تنہا ادا نہیں کر سکتا۔

۳۔ اگر کسی شخص سے یہ نماز چھوٹ جاتی ہے تو وہ اس کی قضا نہیں پڑھ سکتا۔ اس کی بجائے اسے نمازِ ظہر ادا کرنا ہوگی جو ایک بنیادی نماز ہے اور جس کا بدل عام حالات میں نمازِ جمعہ ہے۔

۴۔ ہفتے کے دوسرے ایّام کی طرح جمعہ کے روز بھی ہر قسم کے کام حسب معمول انجام دینے کی اجازت ہے۔ مسلمانوں کے لیے سبت (آرام کا کوئی مخصوص دن) مقرر نہیں۔ وہ جمعہ کے روز بھی اپنے معمول کے کام اور مصروفیات جاری رکھ سکتے ہیں لیکن اُن کے لیے ضروری ہے کہ وہ نمازِ جمعہ وقت پر ادا کریں جس کے اختتام پر وہ اپنی دنیوی سرگرمیاں دوبارہ شروع کر سکتے ہیں۔

۵۔ اگر مسجد موجود ہو تو نمازِ جمعہ مسجد میں ادا کرنا ضروری ہے بصورتِ دیگر یہ کسی بھی جگہ جہاں لوگ اکٹھے ہو سکیں مثلاً گھروں، میدانوں، پارکوں وغیرہ میں ادا کی جا سکتی ہے۔

۶۔ جب نمازِ جمعہ کا وقت ہو جائے تو اذان کہی جاتی ہے۔ پھر چار رکعت سنت انفرادی طور پر زیرِ لب ادا کی جاتی ہیں جس طرح نمازِ ظہر میں ادا کی جاتی ہیں۔ نماز کا یہ حصّہ مکمل ہونے پر امام حاضرین کے رُو برُو کھڑا ہو جاتا ہے اور خطبہ دیتا ہے جو جمعہ کی عبادت کا ایک لازمی حصّہ ہے۔ خطبہ کے دوران گفتگو کرنے یا نماز پڑھنے کی اجازت نہیں۔ ہر شخص کو چاہیے کہ

وہ اپنی جگہ پر بیٹھا رہے اور مکمل خطبہ خاموشی سے سُنے۔

۷۔ خطبہ دو حصوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہر حصّے کا آغاز حمدِ باری تعالیٰ اور رسولِ خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم پر صلوٰۃ و سلام ہوتا ہے۔ حصّہ اوّل میں بغرضِ ہدایت و نصیحت چند قرآنی آیات کی تلاوت اور اُن کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔ پہلے حصّے کے اختتام پر امام مختصر وقفے کے لیے بیٹھ کر آرام کرتا ہے۔ پھر خطبے کا دوسرا حصّہ سنانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ خطبے کے کسی ایک حصّے یا دونوں حصوں میں مسلمانوں کے عمومی امور کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے حصّے میں امام بالخصوص مسلمانوں کی عام فلاح کے لیے دُعا کرتا ہے۔

۸۔ بعد ازاں تمام نمازی حالتِ اقامت میں آتے ہیں اور امام کی اقتدا میں دو رکعت فرض نماز ادا کرتے ہیں۔ امام سورہ الفاتحہ اور دیگر قرآنی آیات کی تلاوت بلند آواز میں کرتا ہے۔ ان دو رکعتوں کی تکمیل پر نماز مکمل ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد سنّت نماز کی دو رکعت انفرادی طور پر زیرِ لب ادا کی جاتی ہیں۔

فرض نماز سے پہلے کی چار رکعت اور بعد کی دو سنّت رکعت گھر میں بھی ادا کی جا سکتی ہیں نیز ان رکعات کو کسی قضا شدہ فرض نماز جو واجب الادا ہے کے بدلے میں ادا کیا جا سکتا ہے۔

ہفتہ وار نمازِ جمعہ یا سالانہ نمازِ عید میں شامل ہونے والے کو کوشش کرنی چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو صاف ستھرا ہو کر نماز میں شریک ہو۔ اگرچہ ان اجتماعی نمازوں میں شامل ہونے کے لیے مکمل طہارت یعنی غسل کو لازمی قرار نہیں دیا گیا تاہم غسل کی پُرزور سفارش کی جاتی ہے کیونکہ اس سے انسان تر و تازہ ہو جاتا ہے اور یک گونہ فرحت محسوس کرتا ہے۔

نمازِ عید کی اہمیت

عید کے معنی ہیں خوشی اور مسرّت کا بار بار آنا۔ نمازِ عید تمام مسلمانوں کے لیے خصوصی

اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں روزمرہ عبادت کی خوبیاں جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، ہفتہ وار دینی نمازِ جمعہ کے اثرات اور مسلمانوں کے درمیان سالانہ تجدید ملاقات کی خصوصیات موجود ہیں۔ عیدیں دو ہیں۔ پہلی عید، عید الفطر (روزہ چھوڑنے کا تہوار) کہلاتی ہے۔ یہ عید ماہِ رمضان المبارک جس میں قرآن نازل ہوا اور جس میں روزے رکھے جاتے ہیں کے اختتام پر اسلامی سال کے دسویں مہینے شوال کی یکم کو منائی جاتی ہے۔ دوسری عید، عید الاضحیٰ (قربانی کا تہوار) کہلاتی ہے جو اسلامی سال کے آخری مہینہ ذوالحجہ کی دسویں کو منائی جاتی ہے۔ عید الاضحیٰ منانے سے پہلے حج (زیارتِ مکہ) ادا کیا جاتا ہے جو ایک انتہائی پُرخلوص اور جاں نثاری کی عبادت ہے۔

اسلامی عیدین ہر لحاظ سے ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔ کسی دوسرے مذہب یا معاشرتی نظام میں اس قسم کے تہوار نہیں منائے جاتے۔ ان تہواروں میں اعلیٰ درجے کی روحانی اور اخلاقی خصوصیات کے علاوہ ایسی خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں جن کی مثال کسی اور تہوار میں نہیں ملتی۔ یہ خوبیاں حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ ہر عید عبادتِ خداوندی میں مسلمان فرد کی غیر معمولی کامیابی کی خوشی میں ایک صحت مند تقریب ہے۔ پہلی عید رمضان المبارک کے مکمل ہونے کی خوشی میں ہے۔ اس پورے مہینے کے دوران مسلمان دن کے وقت مکمل روزہ رکھتے ہیں۔ دوسری عید حج یا زیارتِ مکہ کی تکمیل ظاہر کرتی ہے۔ حج کی ادائیگی ایک ایسی عبادت ہے جس میں مسلمان دنیوی معاملات سے فراخدلانہ دستبرداری کا مظاہرہ کرتا ہے اور صرف اللہ تعالیٰ کی ابدی آواز پر کان دھرتا ہے۔

۲۔ ہر عید یومِ تشکر ہے۔ اس دن مسلمان برادرانہ اور پُرمسرت ماحول میں جمع ہوتے ہیں اور اس بات پر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اُس نے عید سے قبل روحانی فرائض کی تکمیل میں اُن کی مدد فرمائی۔ اظہارِ تشکر کی یہ شکل صرف روحانی عبادت اور زبانی اظہار تک ہی محدود نہیں بلکہ اس سے مادی یہ شکر گزاری معاشرتی اور انسانی جذبے کا مظہر بھی ہے۔

مسلمان جنہوں نے ماہِ رمضان کے پورے روزے رکھے وہ پہلی عید کے روز ناداروں اور حاجت مندوں میں صدقہ و خیرات تقسیم کر کے شکرِ خداوندی کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی طرح حجِ مکہ کی رسوم پوری کرنے والے اور وہ بھی جو حج کی ادائیگی نہ کر سکے اور اپنے گھروں میں رہے نذرانے کے جانور ذبح کر کے اور اُن کا گوشت ناداروں اور حاجت مندوں میں تقسیم کر کے قربانی بخشش کرتے ہیں۔ صدقات و خیرات اور جانوروں کے گوشت کی تقسیم عید کے اہم اور روشن پہلو ہیں۔ اظہارِ تشکر کی یہ اسلامی شکل روحانی عبادت اور انسانی سطح پر فیض رسانی کا ایک صحت مند امتزاج ہے جس کی مثال اسلام کے سوا کہیں اور نہیں ملتی۔

۳۔ ہر عید یاد آوری کا دن ہے۔ مسلمان ان انتہائی پُرمسرت لمحات میں بھی اپنے دن کا آغاز اللہ تعالیٰ کی اجتماعی عبادت سے کرتے ہیں اور اُس کی نعمتوں کے اعتراف کا اظہار کرنے کے لیے اُس سے دُعا مانگتے ہیں اور اُس کی حمد و ثنا کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ گزرے ہوؤں کو دُعائے بخشش سے، حاجت مندوں کو مالی امداد سے، آزردہ خاطروں کو اظہارِ ہمدردی اور دلجوئی سے، بیماروں کو عیادت اور نیک خواہشات کے کلمات سے اور بچھڑے ہوؤں کو پُرجوش اور پُرخلوص سلام و دُعا اور مروّت و لحاظ سے یاد کرتے ہیں۔ اس طرح عید کے روز یاد آوری کا مفہوم تمام حدود سے ماورا ہو جاتا ہے اور انسانی زندگی کے دُور رس پہلوؤں کا احاطہ کر لیتا ہے۔

۴۔ ہر عید یومِ فتح ہے۔ ہر وہ شخص جو اپنے روحانی حقوق حاصل کرنے اور رُوح کو بالیدگی بخشنے میں کامیاب ہو جاتا ہے وہ عید کا استقبال فاتحانہ جذبے سے کرتا ہے۔ جو شخص عید سے منسلکہ فرائض دیانت داری سے انجام دیتا ہے وہ واقعی ایک فاتح شخص ہے۔ وہ ثابت کر دیتا ہے کہ وہ اپنی خواہشات پر قابو پا سکتا ہے، ضبطِ نفس کا مظاہرہ کر سکتا ہے اور منظم و منضبط زندگی کے فوائد سے بہرہ مند ہو سکتا ہے۔ جب کسی شخص میں یہ صفات

پیدا ہو جائیں تو اس کا مطلب ہے کہ اُس نے بڑی سے بڑی فتح حاصل کر لی ہے کیونکہ جو شخص خود پر قابو پانے اور اپنی خواہشات کو نظم و ضبط میں لانے پر قادر ہے وہ گناہ و تقصیر، خوف و ہراس، بدی و ناشائستگی، حسد و طمع، تذلیل و تحقیر اور غلامی کے دیگر عناصر سے آزاد ہے۔ چنانچہ جب وہ عید، جو اُس کے حصولِ آزادی کی علامت ہے، کا استقبال کرتا ہے تو وہ درحقیقت اپنی فتح منا رہا ہوتا ہے اور اس طرح عید ایک یومِ فتح بن جاتی ہے۔

۵۔ ہر عید حصولِ ثمرات کا دن ہے۔ اللہ کے احکام بجالانے والے تمام نیک کارندے اور تمام اطاعت گزار مسلمان اس دن اپنے نیک اعمال کے ثمرات سے بہرہ مند ہوتے ہیں کیونکہ اس دن اللہ تعالیٰ اپنی رحمتوں اور نوازشوں کے خزانے کھول دیتا ہے۔ دوسری طرف اسلامی معاشرہ صدقات و خیرات کی رقوم جمع کرتا ہے جس کا ادا کرنا اسلامی برادری پر فرض اور ایک معاشرتی ذمہ داری ہے۔ یہ رقوم باہمی محبت، ہمدردی اور تعلق کی علامت کے طور پر تقسیم کی جاتی ہیں۔ اس طرح اسلامی معاشرے کا ہر فرد اس کے ثمرات حاصل کرتا ہے یا کسی نہ کسی شکل میں مالیہ وصول کر رہا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بے حد و حساب دیتا ہے۔ خصوصاً اُن لوگوں کو جو خلوصِ نیت سے اپنے مسلمان بھائیوں کی فلاح و بہبود کا خیال رکھتے ہیں۔ وہ لوگ جو دے نہیں سکتے اللہ تعالیٰ کی مددِ فراوان پانے کے علاوہ اپنے محسن بھائیوں کی امداد میں سے بھی وصول کرتے ہیں۔ اس طرح محروم اور صاحبِ ثروت دونوں ہی اجتماعی طور پر رحمتِ خداوندی سے متمتع ہوتے ہیں اور یوں عید کا دن حصولِ ثمرات کا دن بن جاتا ہے۔

۶۔ ہر عید یومِ بخشش ہے۔ جب مسلمان عید کے دن کی اجتماعی نماز میں شرکت کے لیے جمع ہوتے ہیں تو وہ سب کے سب تہِ دل سے اپنی بخشش اور تقویتِ ایمان کی دُعا مانگتے ہیں اور اللہ نے اُن لوگوں کو جو خلوصِ دل سے اُس کی طرف رجوع کرتے ہیں اپنی

رحمت و بخشش کا یقین دلا رکھا ہے۔ اس پاکیزہ اور اعلیٰ درجہ کے روحانی اجتماع میں ہر سچا مسلمان اپنے بھائیوں کے لیے کسی بھی قسم کی عداوت یا بغض رکھنے کی صورت میں خدا کے سامنے شرمسار ہوگا۔ ایک سچا مسلمان اس برادرانہ اور روحانی اجتماع سے گہرے طور پر اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور اگر اُس کے دل میں کسی کے خلاف کوئی بغض ہے تو وہ اس پر غالب آسکتا ہے۔ نتیجۃً وہ عید منانے کے اصل جذبے سے متاثر ہو کر قلب و روح کو پاکیزہ بنانے میں خود کو دوسروں کے ہم کاب محسوس کرتا ہے۔ اس صورت میں وہ اُن لوگوں کو معاف کر دیتا ہے جنہوں نے کبھی اُس کے ساتھ غلط برتاؤ کیا تھا کیونکہ وہ خود اللہ کی بخشش کا طالب اور اُس کے حصول کے لیے خلوصِ دل سے کوشاں ہوتا ہے۔ یہ اعلیٰ درجے کا روحانی اجتماع اُسے یہ درس دیتا ہے کہ اگر وہ دوسروں کی غلطیوں سے درگزر کرے گا تو اس کے بدلے اللہ اُسے معاف کر دے گا اور جب وہ انہیں تہِ دل سے معاف کر دے گا تو اللہ تعالیٰ اپنے رحم و کرم سے عفو و بخشش کی صفت سے کام لے گا۔ اسی طرح باہمی عفو و درگزر کا سلسلہ محدود نہیں رہتا بلکہ معاف کر دینے کا یہ نیک جذبہ مسلمانوں کی جماعت میں وسعت اختیار کر لیتا ہے۔ یہی خصوصیت یومِ عید کو یومِ بخشش بنا دیتی ہے۔

۷۔ ہر عید یومِ امن و سلامتی ہے۔ جب کوئی مسلمان قانونِ خداوندی کی پیروی اور منظم و منضبط زندگی اختیار کر کے اپنے قلب میں امن قائم کر لیتا ہے تو سمجھ لیجیے کہ یقیناً اُس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ناقابلِ تنسیخ معاہدۂ امن طے کر لیا۔ اسی طرح جب کوئی شخص اللہ کے ساتھ امن و سلامتی قائم کر لیتا ہے تو اُس کی ذات میں بھی امن قائم ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں وہ باقی کائنات کے ساتھ بھی حالتِ امن میں رہتا ہے۔ چنانچہ جب وہ صحیح طریقے سے عید مناتا ہے تو وہ درحقیقت اپنی ذات اور اللہ کے درمیان طے پانے والے میثاقِ امن کی تقریب منا رہا ہوتا ہے جس کے باعث عید کا دن یومِ امن بن جاتا ہے۔

یہ ہے اسلامی عید کا صحیح مفہوم۔ عید کیا ہے؟ یہ امن و تشکّر کا دن ہے بخشش اور اخلاقی فتح کا دن ہے۔ ثمرات سے بہرہ مند ہونے اور غیر معمولی کامیابیوں کے حصول کا دن ہے مسرت و یاد آوری کا دن ہے۔ اسلامی عید یہ سب کچھ اور مزید بہت کچھ ہے کیونکہ یہ اسلام کا دن ہے۔ اللہ کا دن ہے۔

نمازِ عید کی ادائیگی

۱۔ ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ بہترین اور صاف ستھرا لباس زیبِ تن کر کے جوش و جذبہ کے ساتھ عید کے اجتماع میں شامل ہو جس طرح وہ نمازِ جمعہ میں شامل ہوتا ہے۔ مسجد یا جائے اجتماع میں اصل نماز شروع ہونے سے پہلے زبانی طور پر اللہ کی شانِ کبریائی میں کچھ مخصوص کلمات پڑھے جاتے ہیں جنہیں تکبیر کہتے ہیں۔ تکبیر کا ذکر آئندہ سطور میں آئے گا۔

۲۔ نمازِ عید کا وقت طلوعِ آفتاب کے بعد شروع ہوتا ہے اور سورج کے نصف النہار میں پہنچنے سے پہلے تک رہتا ہے۔ نمازِ عید کے لیے اذان یا اقامت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ نماز کی دو رکعت ہوتی ہیں۔ امام ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ اور قرآن مجید میں سے کسی سورت کی قرأت بلند آواز میں کرتا ہے۔

۳۔ امام ”اَللّٰہُ اَکْبَرُ“ (اللہ سب سے بڑا ہے) کہہ کر امامت کی نیّت کا اعلان کرتا ہے۔ پھر یہی کلمات تین مرتبہ دُہراتا ہے اور ہر مرتبہ تکبیر (اللہ اکبر) کہتے وقت اپنے ہاتھ کانوں تک اُٹھاتا ہے اور تکبیر کے اختتام پر ہاتھ نیچے چھوڑ دیتا ہے۔ تیسری تکبیر کے بعد اپنے ہاتھ اس طرح باندھتا ہے کہ بایاں ہاتھ ناف کے نیچے اور دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کے اوپر رکھتا ہے جیسا کہ دوسری نمازوں میں کیا جاتا ہے۔ مقتدی امام کی ان حرکات کی درجہ بہ درجہ پیروی کرتے ہیں اور وہی کچھ کہتے ہیں جو امام کہتا ہے۔

۴۔ پہلی رکعت کے اختتام پر امام ”اللہ اکبر“ کہتے ہوتے دوسری رکعت کے لیے اُٹھ

کھڑا ہوتا ہے۔ دوسری رکعت میں بھی وہ اُسی طرح تین مرتبہ تکبیر کہتا ہے جس طرح پہلی رکعت میں کہی گئی تھی اور تمام نمازی اس کی پیروی کرتے ہیں۔

۵۔ دو رکعت نمازِ عید مکمل ہونے پر امام دو حصوں پر مشتمل خطبہ دیتا ہے۔ دونوں حصّوں کے درمیان ایک مختصر سا وقفہ ہوتا ہے۔ پہلے حصّے کے شروع میں "اللہ اکبر" نو مرتبہ اور دوسرے حصّے کے شروع میں سات مرتبہ کہا جاتا ہے۔ باقی خطبہ جمعہ کے خطبہ کی طرح وعظ و نصیحت پر مشتمل ہوتا ہے۔

۶۔ سال کی پہلی عید (عید الفطر) کے خطبہ میں امام کو چاہیے کہ وہ لوگوں کی توجہ صدقۃ الفطر (اختتامِ صیام کی خیرات) کی جانب مبذول کرائے۔ صدقۃ الفطر ایک لازمی ٹیکس ہے جس کی ادائیگی ہر اُس مسلمان شخص پر فرض ہے جو اسے ادا کرنے کی استطاعت رکھتا ہے۔ چنانچہ ہر صاحبِ استطاعت کے لیے لازمی ہے کہ وہ کسی غریب کو پیٹ بھر کھانا کھلائے یا اس کی قیمت کے برابر رقم اُسے دے۔ اگر کچھ افراد اُس کے زیرِ کفالت ہیں تو اُسے اپنے علاوہ ہر زیرِ کفالت فرد کا صدقۃ الفطر بھی دینا ہوگا۔ مثال کے طور پر اگر وہ اپنے علاوہ مزید تین افراد کی کفالت کا ذمہ دار ہے تو اُس کے لیے لازمی ہے کہ وہ کم از کم چار افراد کا پیٹ بھر کھانا یا اِس کے برابر رقم حاجت مندوں میں تقسیم کرے۔ زیادہ باعثِ ثواب بات یہ ہے کہ صدقۃ الفطر کی رقم نمازِ عید سے بہت پہلے تقسیم کر دی جائے تاکہ غریب افراد عید کے دن کا استقبال مسرّت و شادمانی کے جذبے سے کر سکیں۔

۷۔ دوسری عید (عید الاضحیٰ) کے خطبہ میں امام کو چاہیے کہ وہ لوگوں کی توجہ قربانی کے فرض کی طرف مبذول کرائے۔ عید الاضحیٰ یا عیدِ قربان کے روز ہر صاحبِ استطاعت مسلمان کے لیے کسی جانور کی قربانی دینا فرض ہے۔ ایک گھر کے لیے ایک بکرے یا مینڈھے کی قربانی کافی ہے۔ ایک گائے یا بچھڑا سات مختلف گھروں کے لیے کافی ہے۔ بہتر ہے کہ قربانی کا جانور عید کے روز نماز کے بعد ذبح کیا جائے لیکن اگر اُسے دوسرے یا تیسرے دن ذبح کیا جائے

پھر بھی قابلِ قبول ہے۔ مذبوحہ جانوروں کے گوشت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت یہ ہیں۔ "ان میں سے خود بھی کھاؤ اور اُن کو بھی کھلاؤ جو قناعت کیے بیٹھے ہیں اور اُن کو بھی جو حاجت پیش کریں۔" (سورہ ۲۲ : آیت ۳۶)

اس سے اگلی آیت میں قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کو مذبوحہ کے گوشت اور خون کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ تو اس کے عبادت گزار بندوں کا تقویٰ ہے جو اُس تک پہنچتا ہے اور اسی میں اُس کی دلچسپی ہے۔

یہاں ہم یہ دُہراتے چلیں کہ نمازِ عید نمازِ فجر کا متبادل نہیں ہے۔ نمازِ فجر، روزانہ کی فرض نمازوں میں سے ہے اس لیے کوئی دوسری نماز اُس کی جگہ نہیں لے سکتی۔

عیدین کی نمازوں سے پہلے تکبیر کہی جاتی ہے۔ یہی تکبیر دوسری عید (عیدالاضحیٰ) کے بعد کے تین دن کے دوران ہر باجماعت نماز کے بعد بھی کہی جاتی ہے اور تکبیر التشریق کہلاتی ہے۔

تکبیر یا تکبیر التشریق یہ ہے۔

اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ
لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ
اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ
اَللّٰهُ اَكْبَرُ كَبِيْرًا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا
وَسُبْحَانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا
لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ صَدَقَ وَعْدَهٗ
وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَاَعَزَّ جُنْدَهٗ
وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ
لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَا نَعْبُدُ اِلَّآ اِيَّاهُ
مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ

اللہ سب سے بڑا ہے (تین مرتبہ)
اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اللہ سب سے
بڑا ہے۔ (دو مرتبہ) اُسی کے لیے سب
تعریفیں ہیں۔ اُسی کی پاکیزگی اور حمد و ثنا
ہے صبح و شام۔ اللہ کے سوا کوئی معبود
نہیں۔ وہ ایک ہے اس نے اپنا وعدہ
پورا کیا، اپنے بندے (حضرت محمد صلی اللہ
علیہ وسلم) کی مدد کی، اُس کے لشکر کو واضح فتح
عطا کی اور دشمنوں کو فیصلہ کن شکست دی۔ اللہ
کے سوا کوئی معبود نہیں اور ہم سوائے اُس کے

اَلْکَافِرُوْنَ۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اَصْحَابِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اَنْصَارِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اَزْوَاجِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی ذُرِّیَّۃِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّسَلِّمْ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا

کسی کی عبادت نہیں کرتے۔ ہم اُس کے دین سے مخلص ہیں خواہ کفار اس کا برا ہی مانیں۔ اے اللہ صلوٰۃ بھیج حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آل پر اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب پر اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کرنے والوں پر اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج پر اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد پر اور ان سب پر ڈھیروں سلامتی نازل فرما۔

نمازمیں قصر

۱۔ جب کوئی شخص اڑتالیس میل یا اس سے زیادہ کا سفر کرنے کے ارادے سے گھر سے نکلا ہو تو اُسے چاہیے کہ وہ چار رکعت والی فرض نمازوں میں قصر کرکے ہر چار رکعت فرض کی بجائے دو رکعت فرض ادا کرے۔ اسے قصر کہتے ہیں۔ قصر کی اجازت ظہر، عصر اور عشاء کی نمازوں کے لیے ہے۔ فجر اور مغرب کی نمازوں میں قصر نہیں ہو سکتا۔

۲۔ قصر کی رعایت مسافر کے منزل پر پہنچ جانے کے بعد بھی مؤثر رہتی ہے بشرطیکہ وہ پندرہ دن یا اس سے زیادہ مدت تک ٹھہرنے کا ارادہ نہ کرے اور اگر وہ پندرہ دن یا اس سے زیادہ مدت تک ٹھہرنے کا ارادہ کر لے تو اس کے لیے پوری رکعات کے ساتھ نمازیں پڑھنا ضروری ہو جاتا ہے۔

۳۔ ان حالات میں مسافر نمازِ فجر کی دو رکعت سُنّت اور عشاء کی وتر نماز کے سوا باقی تمام

سُنّت نمازوں سے مستثنیٰ ہے۔

نماز کے ممنوع اوقات

مسلمان کے لیے مندرجہ ذیل اوقات میں فرض اور سُنّت ہر دو قسم کی نمازیں پڑھنے کی ممانعت ہے۔

۱۔ طلوعِ آفتاب کے وقت۔

۲۔ جب آفتاب نصف النہار پر ہو۔

۳۔ غروبِ آفتاب کے وقت۔

۴۔ ایامِ حیض، حالتِ زچگی کے دوران۔

۵۔ ناپاکی کی حالت میں خواہ یہ ناپاکی جزوی ہو یا مکمل۔

قضا نمازوں کی ادائیگی

۱۔ اصولی طور پر ہر مسلمان مرد اور عورت کو نماز وقت پر ادا کرنی چاہیے۔ بلا معقول عُذر نماز چھوڑنا قابلِ سزا گناہ ہے۔

۲۔ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ چھوڑی ہوئی نمازوں کی قضا پڑھے۔ تاہم خواتین جو زچگی یا حیض کی حالت میں ہونے کی وجہ سے یا کوئی بھی شخص جو وقتی طور پر ہوش و حواس کھو بیٹھنے کی وجہ سے نماز ادا نہ کر سکا ہو نما کی قضا پڑھنے سے بری الذمہ ہے۔

۳۔ نمازوں کی قضا اُن کی اصل شکل میں پڑھی جانی چاہیے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی ایسی نماز قضا ہوئی ہے جسے قصر کر کے پڑھا جانا تھا تو اُس کی قضا بھی قصر کر کے پڑھی جائے گی وعلیٰ ہٰذا القیاس۔

۴۔ قضا نمازوں کے درمیان اور قضا اور موجودہ نمازوں کے درمیان ترتیب کا لحاظ رکھنا

ضروری ہے۔ مثلاً جو نماز پہلے قضا ہوئی ہے اُسے پہلے پڑھا جائے لیکن اگر قضا نمازوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو کہ اُن کی صحیح تاریخ یاد رکھنا مشکل ہو جائے یا اگر قضا اور موجودہ نمازوں کی ادائیگی کے لیے کافی وقت نہ ہو تو ترتیب کو نظر انداز کر دیا جائے گا۔ اس صورت میں موجودہ نماز پہلے اور قضا نمازیں بعد میں ادا کی جائیں گی۔ مسلمان کو ہر حال میں اس بات کا یقین کر لینا چاہیے کہ اُس کے بہترین علم کے مطابق اُس کا ریکارڈ صاف ہے اور کوئی قضا نماز باقی نہیں رہ گئی۔

نمازِ تراویح

نمازِ تراویح ماہِ رمضان المبارک کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ نمازِ عشار کے بعد پڑھی جاتی ہے۔ اس میں آٹھ سے بیس رکعات دو دو کر کے پڑھی جاتی ہیں۔ ہر دو رکعت کے بعد تھوڑی دیر کا وقفہ کیا جاتا ہے۔ نمازِ تراویح باجماعت پڑھنا تنہا پڑھنے کی نسبت کہیں زیادہ پسندیدہ ہے۔ نیز اسے وِتر (نمازِ عشار کا آخری حصہ) سے پہلے پڑھنا زیادہ موزوں ہے۔

مفسداتِ نماز

مندرجہ ذیل میں سے کسی فعل کے سرزد ہونے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔

۱۔ نماز کے کسی فعل یا حرکت میں امام سے سبقت لے جانا۔

۲۔ نماز کے دوران کچھ کھانا یا پینا۔

۳۔ نماز میں پڑھے جانے والے معیّنہ کلمات سے ہٹ کر کچھ بولنا یا بات کرنا۔

۴۔ مکہ (قبلہ) کی طرف سے رُخ یا سینہ پھیر لینا۔

۵۔ کوئی ایسی حرکت یا فعل کرنا جو نماز میں کی جانے والی حرکات یا افعال سے ہٹ کر ہو۔

۶۔ کوئی ایسی بات ہو جانا جس سے وضو ٹوٹ جائے مثلاً پیشاب، پاخانہ، ریح، خون، وغیرہ کا اخراج ہونا۔

۷۔ نماز کے بنیادی افعال مثلاً اقامت، قرأتِ قرآن، رکوع، سجود وغیرہ چھوٹ جانا۔

۸۔ نماز کے دوران مرد کا ناف سے گھٹنوں تک جسم کا کوئی حصہ برہنہ ہو جانا اور عورت کا سوائے ہاتھ، چہرہ اور پاؤں کے جسم کا کوئی دوسرا حصہ برہنہ ہونا۔

کوئی نماز جب فاسد ہو جائے یعنی ٹوٹ جائے تو اس کا دوبارہ صحیح طریقے سے پڑھنا ضروری ہے۔

نمازِ جنازہ

۱۔ کسی مسلمان کی میت کی نماز فرضِ کفایہ ہے۔ فرضِ کفایہ کا مطلب کی کچھ تعداد یہ نماز ضرور پڑھے اور جب موقع پر موجود مسلمانوں میں سے چند یکسر نماز پڑھ لیں تو کافی ہے اور باقی مسلمان اس فرض سے بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔

۲۔ جب کوئی مسلمان فوت ہوتا ہے تو اُس کی میت کو غسل دیا جانا ضروری ہے۔ غسل کا آغاز اُس کے جسم کے کھُلے حصوں (جنہیں وضو کرتے وقت دھویا جاتا ہے) سے شروع کیا جاتا ہے اور سارا جسم صابن، آبی صابن یا کسی جراثیم کُش دوا سے اچھی طرح دھویا جاتا ہے۔ جب سارا جسم اچھی طرح صاف ہو جائے تو اسے ایک یا کئی سفید سوتی چادروں میں اس طرح لپیٹا جاتا ہے کہ جسم کے تمام حصّے اچھی طرح ڈھک جائیں۔

۳۔ اس کے بعد میت کو کسی تابوت یا صندوق میں لٹا دیا جاتا ہے اور نمازِ جنازہ کے لیے کسی مسجد یا کسی پاک صاف جگہ لے جایا جاتا ہے۔ نماز کے وقت میت کو اس حالت میں رکھا جاتا ہے کہ اُس کا چہرہ مکّہ (قبلہ) کی طرف ہو۔

۴۔ نمازِ جنازہ میں شریک ہونے والے اگر پہلے سے باوضو نہیں ہیں تو اُن کے لیے وضو

کرنا ضروری ہے۔ امام قبلہ رُو ہو کر میت کے قریب کھڑا ہو جاتا ہے اور مقتدی اُس کے پیچھے صفیں بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

۵۔ امام اپنے ہاتھ کانوں تک لے جاتے ہوئے دھیمی آواز میں نیت کرتا ہے کہ میں خدا کے لیے فلاں شخص کی میت کی نمازِ جنازہ پڑھاتا ہوں، اور اَللّٰہُ اَکْبَرُ (اللہ بہت بڑا ہے) کہتا ہے۔ مقتدی امام کے اقتدا میں ناف کے نیچے اس طرح ہاتھ باندھتے ہیں کہ دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کے اوپر آئے جس طرح دوسری نمازوں میں کیا جاتا ہے۔

۶۔ اس کے بعد امام دھیمی آواز میں صرف ثنا اور فاتحہ پڑھتا ہے جیسا کہ دوسری نمازوں میں پڑھا جاتا ہے۔

۷۔ اِس موقع پر امام ہاتھ اٹھائے بغیر "اَللّٰہُ اَکْبَرُ" کہتا ہے اور تشہد کا دوسرا حصہ پڑھتا ہے (اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ تا آخر)

۸۔ اس کے بعد امام ہاتھ اٹھائے بغیر تیسری تکبیر "اَللّٰہُ اَکْبَرُ" کہتا ہے اور اپنے علم کے مطابق موزوں الفاظ میں رحم کی دعا کرتا ہے۔ عموماً یہ دُعا ان الفاظ میں کی جاتی ہے۔

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِحَیِّنَا وَ مَیِّتِنَا وَ شَاھِدِنَا وَ غَائِبِنَا وَ ذَکَرِنَا وَ اُنْثَانَا وَ صَغِیْرِنَا وَ کَبِیْرِنَا ۔ اَللّٰھُمَّ مَنْ اَحْیَیْتَہٗ مِنَّا فَاَحْیِہٖ عَلَی الْاِسْلَامِ وَ مَنْ تَوَفَّیْتَہٗ مِنَّا فَتَوَفَّہٗ عَلَی الْاِسْلَامِ۔ اَللّٰھُمَّ لَا تَحْرِمْنَا اَجْرَہٗ وَلَا تَفْتِنَّا بَعْدَہٗ۔

الٰہی بخش دے ہمارے ہر زندہ کو اور ہمارے ہر متوفّی کو اور ہمارے ہر حاضر کو اور ہمارے ہر غائب کو اور ہمارے ہر مرد کو اور ہماری ہر عورت کو اور ہمارے ہر چھوٹے کو اور ہمارے ہر بڑے کو۔ الٰہی تُو ہم میں سے جس کو زندہ رکھے تو اُس کو اسلام پر زندہ رکھ اور ہم میں سے جس کو موت دے تو اُس کو

اسلام پر موت دے۔ الٰہی تو ہمیں (اُس کی موت پر صبر کے) اُجر سے محروم نہ رکھ اور اُس کے بعد ہمیں آزمائش میں نہ ڈال۔

۹۔ اس کے بعد چوتھی تکبیر (اَللّٰهُ اَکۡبَرُ) ہاتھ اُٹھائے بغیر کہی جاتی ہے۔ پھر دوسری نمازوں کی طرح پہلے دائیں طرف اور پھر بائیں طرف سلام پھیرا جاتا ہے۔ خیال رہے کہ امام کی پچھلی صفوں کے مقتدیوں کو امام کی ہر حرکت کی مرحلہ بہ مرحلہ پیروی کرنی چاہیے اور جو کچھ امام پڑھے مقتدیوں کو بھی وہی کچھ زیر لب پڑھنا چاہیے۔

۱۰۔ نماز مکمل ہونے پر میّت کو تدفین کے لیے قبر میں اُتارا جاتا ہے۔ ایسا کرتے وقت میّت کا چہرہ قبلہ کی طرف رکھا جاتا ہے۔ میّت کو قبر میں اُتارتے وقت یہ کلمات کہے جاتے ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰهِ وَ بِاللّٰهِ وَعَلٰى مِلَّةِ رَسُوۡلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ

"اللہ کے نام سے اور اللہ کے ساتھ اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سنّت کے مطابق۔"

ان دعاؤں کے علاوہ کوئی بھی دوسری موزوں دُعا پڑھی جا سکتی ہے۔

اگر متوفی بچہ ہے یعنی وہ ابھی بلوغت کی عمر کو نہیں پہنچا تو اُس کی نمازِ جنازہ بھی اسی طرح پڑھی جائے گی لیکن تیسری تکبیر کے بعد اوپر دی ہوئی لمبی دعا کی بجائے یہ مختصر دُعا پڑھی جائے گی۔

اَللّٰهُمَّ اجۡعَلۡهُ لَنَا فَرَطًا وَّاجۡعَلۡهُ لَنَا اَجۡرًا وَّ ذُخۡرًا وَاجۡعَلۡهُ لَنَا شَافِعًا وَمُشَفَّعًا۔

"الٰہی اس لڑکے (یا لڑکی) کو ہمارے لیے پیش رو بنا اور اُس کو ہمارے لیے اجر اور ذخیرہ بنا اور اس کو ہماری سفارش کرنے والا بنا اور اُس کی سفارش قبول فرما۔"

پوری نمازِ جنازہ اقامت کی حالت میں یعنی کھڑے ہوکر پڑھی جاتی ہے۔

جب بھی قریب سے کوئی جنازہ گزرے خواہ مسلمان کا ہو یا غیر مسلم کا ہر مسلمان کو میت کے احترام میں اُٹھ کھڑے ہونا چاہیے۔

مرد کی میت کو مرد اور عورت کی میت کو عورت غسل دیتی ہے۔ عورت اپنے شوہر کی میت کو غسل دے سکتی ہے اور مرد یا عورت میں سے کوئی بھی چھوٹے بچے کی میت کو نہلا سکتا ہے۔ غسل کے دوران غسّال (نہلانے والے) کے ہاتھ دستانے یا کپڑے سے ڈھکے ہوئے ہونے چاہئیں اور میت کے ستر کے حصّوں کو بغیر دیکھے دھونا چاہیے۔

قبر بنانے اور اس پر نشان لگانے میں سادگی اختیار کی جانی چاہیے۔ میت کو اوسط درجے کی سفید سوتی چادروں میں ڈھانپنا چاہیے۔ قبر کی تعمیر میں اسراف کرنا یا میت کو نفیس قسم کے پارچہ جات میں ملبوس کرنا یا اس طرح کی کوئی اور فضول خرچی کرنا ایک غیر اسلامی فعل ہے۔ یہ محض ایک جھوٹی شان اور سرمائے کا ضیاع ہے۔ اس رقم کو کئی دوسرے مفید کاموں میں خرچ کیا جا سکتا ہے۔

شمالی امریکہ کے بعض مسلمانوں کا دستور ہے کہ وہ متوفی کی تدفین پر ایک عظیم الشان پر تکلف اور خرچیلی دعوت کا اہتمام کرتے ہیں۔* یہ بھی ایک غیر اسلامی فعل اور دولت اور انسانی توانائی کا غیر ذمہ دارانہ ضیاع ہے۔ اگر اس دولت اور انسانی محنت کا کوئی مثبت مصرف منتخب کر لیا جائے تو لامحدود فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔

---

* پاکستان میں بھی یہ رواج عام ہے کہ غریب سے غریب گھرانوں میں بھی کسی عزیز کی وفات پر پُرتکلف دعوتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو تھوڑے تھوڑے دنوں کے وقفے سے کئی ماہ تک جاری رہتا ہے۔ اس کے بعد ہر سال برسی کے نام پر دعوتیں برپا کی جاتی ہیں اور یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ (از مترجم)

نماز سے متعلق عام ہدایات

جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے مسلمان کا ذہن ہمیشہ اللہ کی یاد سے معمور اور اس کی زبان اللہ کی حمد و ثنا اور اُس کی پاکیزگی کے ذکر میں مصروف رہنی چاہیے۔ اوپر مذکور نمازوں کے مدد اور بھی بہت سے مواقع ہیں جن پر نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے نماز پڑھنے کی پُرزور سفارش کی ہے۔ یہ مواقع حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ بارش کی کثرت کے موقع پر۔

۲۔ خشک سالی اور بارش کی کمی کے موقع پر

۳۔ سورج گرہن کے موقع پر

ایسے مواقع پر مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ جتنی رکعات چاہیں اور جب تک چاہیں پڑھتے رہیں۔

ان کے علاوہ بعض دوسرے مواقع بھی ہیں جب مسلمان عام مجوزہ نمازیں پڑھے بغیر کچھ مخصوص دعائیہ کلمات کہتا ہے۔ ان دعائیہ کلمات میں وہ اللہ کا شکر ادا کرتا ہے اور اُس کی نعمتوں کی قدر کرتا ہے، اس سے امید رکھتا ہے اور اُس کی مدد پر بھروسا کرتا ہے، اُسے یاد کرتا ہے اور اُس کی رحمت کا طالب ہوتا ہے۔ یہ مواقع حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ بچے کی پیدائش کے موقع پر۔

۲۔ شادی کے موقع پر۔

۳۔ سوتے وقت اور بستر سے اُٹھتے وقت۔

۴۔ گھر سے نکلتے وقت اور گھر میں داخل ہوتے وقت۔

۵۔ بیت الخلاء میں جاتے وقت اور باہر آتے وقت۔

۶۔ سفر شروع کرتے وقت اور کسی شہر میں داخل ہوتے وقت۔

۷۔ گھوڑے پر سواری کرتے وقت یا گاڑی چلاتے وقت۔

۸۔ کشتی میں سوار ہوتے وقت۔

۹۔ مصیبت کے وقت۔

۱۰۔ آئینہ دیکھتے وقت۔

۱۱۔ غسل یا وضو کے بعد۔

۱۲۔ فصل کا پہلا پھل پاکر۔

۱۳۔ قبرستان میں سے گزرتے وقت۔

ان میں سے ہر موقع پر مسلمان کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اللہ کو مناسب اور موزوں کلمات سے یاد کرے جن سے یاد کرنے والے کے احساسات اور اس کی سوچ کی ترجمانی ہوتی ہو۔

اِن مواقع کے لیے ذیل میں چند ایک دعائیں لکھی جا رہی ہیں۔ تاہم اللہ کی تعریف اور اُس کی یاد میں جو کلمات بھی ذہن میں محفوظ ہوں انہیں پڑھا جا سکتا ہے۔ یہاں ہم کچھ خصوصی دعائیں نقل کر رہے ہیں جو موقع محل کی موزونیت کے لحاظ سے پڑھی جا سکتی ہیں۔

۱۔ کھانے پینے سے قبل کی دُعا

بِسْمِ اللّٰهِ وَعَلٰى بَرَكَةِ اللّٰهِ

"شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے اور اللہ کی برکت سے۔"

کھانا کھانے سے پہلے فاتحہ پڑھنا بھی ایک اچھی روایت ہے۔

۲۔ کھانا کھانے کے بعد کی دُعا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔

تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں کھانے پینے کو دیا اور ہمیں مسلمان بنایا۔"

بیمار پرسی کے وقت کی دُعا

اَذْهِبِ الْبَأْسَ رَبَّ النَّاسِ وَاشْفِ اَنْتَ الشَّافِي لَا شِفَاءَ اِلَّا شِفَاؤُكَ شِفَاءً لَا يُغَادِرُ سَقَمًا.

"اے سب لوگوں کے رب، بیماری دُور کر اور صحت عطا فرما۔ تو ہی شفا دینے والا ہے۔ تیری دی ہوئی شفا کے سوا کوئی شفا نہیں۔ ایسی شفا دے کہ کوئی بیماری باقی نہ رہے۔

اب ہم فاتحہ، تشہد اور چند مختصر قرآنی سورتوں کی طرف آتے ہیں۔

۱۔ سورہ فاتحہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ○ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ○ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ○ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ○ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ○ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ○ اٰمِيْن

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔ تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام کائنات کا رب ہے، نہایت مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔ روزِ جزا کا مالک ہے۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہمیں سیدھا راستہ دکھا، اُن لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا، جو معتوب نہیں ہوئے، جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں۔

۲- تشہد

(ا) پہلا حصہ

اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوٰتُ وَالطَّيِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصّٰلِحِيْنَ۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔

تمام قولی عبادتیں اور تمام فعلی عبادتیں اور تمام مالی عبادتیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔ اے نبیؐ! آپ پر سلام ہو اور اللہ کی رحمت اور برکتیں ہوں۔ ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر سلام ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نیک بندے اور اُس کے رسول ہیں۔

(تشہد کا یہ پہلا حصہ تین یا چار رکعت پر مشتمل ہر نماز کی دوسری رکعت کے بعد پڑھا جاتا ہے۔ اس کے بعد نمازی تیسری رکعت کے لیے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

(ب) دوسرا حصہ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى سَيِّدِنَا اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا اِبْرَاهِيْمَ وَبَارِكْ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى سَيِّدِنَا اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا اِبْرَاهِيْمَ فِى الْعَالَمِيْنَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ۔

"اے اللہ! حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی

آل پر سلام بھیج جس طرح تو نے صلوٰۃ بھیجی حضرت ابراہیم علیہ السّلام پر اور حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی آل پر۔ بے شک تو تعریف والا بزرگی والا ہے۔
اے اللہ! حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم پر اور اُن کی آل پر برکت نازل فرما جس طرح تُو نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آل پر برکت نازل کی۔ بے شک تو تعریف والا بزرگی والا ہے۔

تشہُّد کے دونوں حصّے ہر نماز کی آخری رکعت میں پڑھے جاتے ہیں۔ دوسرے حصّے کے اختتام پر سلام پھیرا جاتا ہے جس کے ساتھ ہی نماز مکمل ہو جاتی ہے۔ نمازِ جنازہ میں تیسری تکبیر کے بعد تشہُّد کا صرف دوسرا حصّہ پڑھا جاتا ہے۔

قرآن کی مختصر سُورتیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔
قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ○ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ○ لَمْ يَلِدْ ○ وَلَمْ يُوْلَدْ ○ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ○

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔ کہو وہ اللہ ہے یکتا۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اُس کے محتاج ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور کوئی اُس کا ہمسر نہیں ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔
وَالْعَصْرِ ○ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ○ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ○

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔
زمانے کی قسم، انسان در حقیقت خسارے میں ہے، سوائے اُن لوگوں کے

جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے، اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت
اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔

اس طرح کی کوئی ایک مختصر سُورت نماز کی ہر پہلی دو رکعت میں فاتحہ کے بعد پڑھی جاتی ہے۔ تیسری اور چوتھی رکعت میں فاتحہ کے سوا کوئی سُورت نہیں پڑھی جاتی۔

قرآنِ مجید میں بہت سی مختصر اور آسان سورتیں ہیں۔ ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ سورتیں ازبر کرنے کی کوشش کرے۔ علاوہ ازیں اُسے قرآنی ہدایات کا مطالعہ بھی ضرور کرنا چاہیے۔ مطالعۂ قرآن خود ایک عظیم عبادت کا درجہ رکھتا ہے جس کا بڑا ثواب ہے۔

روزہ (صوم)

اسلام کی ایک اور بے مثل اخلاقی اور روحانی خصوصیت روزے کی روایت کو قائم کرنے کا حکم ہے۔ روزے کا لفظی مفہوم ہے اسلامی سال کے ماہِ رمضان کے دوران طلوعِ آفتاب سے ذرا پہلے سے لے کر غروبِ آفتاب تک ہر قسم کی غذاؤں، مشروبات، جنسی اختلاط، تمباکو نوشی وغیرہ سے مکمل اجتناب کرنا۔ لیکن اگر ہم اسلامی روزے کے مفہوم کو ان لفظی معنوں تک محدود رکھیں گے تو ہم غلطی پر ہوں گے۔

اسلام نے اس فقیدالمثال روایت کو قائم کرنے کا حکم دے کر ابدی نیکی کے ایک سدابہار درخت کی بنیاد رکھی اور اس کے بے بہا ثمرات سے نوازا۔ اسلامی روزے کے روحانی مفہوم کی وضاحت کچھ یوں ہے:

۱۔ روزہ انسان کو سچّی محبت کا اصول سکھاتا ہے کیونکہ جب وہ روزہ رکھتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی گہری محبت میں ایسا کرتا ہے اور جس شخص کے دل میں خُدا کی سچی محبت پائی جاتی ہے وہی جان سکتا ہے کہ محبّت کیا ہے۔

۲۔ روزہ انسان کو امید کے تخلیقی مفہوم اور زندگی کے بارے میں رجائیت پسندانہ نقطۂ نظر سے روشناس کراتا ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی امید میں روزہ رکھتا ہے اور اُسی کے فضل کا طالب ہوتا ہے۔

۳۔ یہ انسان کو توانا عبودیت، سچے استغراق اور قربِ الٰہی کے رنگ میں رنگ دیتا ہے کیونکہ جب وہ روزہ رکھتا ہے تو صرف اور صرف اللہ ہی کے لیے رکھتا ہے۔

۴۔ یہ انسان میں ایک بیدار اور صحت مند ضمیر کی آبیاری کرتا ہے کیونکہ روزہ دار باطناً اور ظاہراً اپنے روزے کی حفاظت کرتا ہے۔ روزہ رکھنے میں ایک خاص بات یہ ہے

کہ دنیا کا کوئی با اختیار شخص روزے کے بارے میں انسانی رویّے کی مزاحمت نہیں کر سکتا اور نہ وہ کسی کو روزہ رکھنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ روزہ دار صرف خدا کی خوشنودی کے لیے اور خلوت و جلوت میں اطاعت گزار رہ کر اپنے ضمیر کی تشفّی کے لیے روزہ رکھتا ہے۔ انسان کے ضمیر کو روشن بنانے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور طریقہ نہیں ہو سکتا۔

۵۔ روزہ انسان کو صبر و برداشت اور بے غرضی کی تعلیم دیتا ہے کیونکہ جب وہ روزہ رکھتا ہے تو وہ محرومی کی تکلیف محسوس کرتا ہے لیکن اسے صبر سے برداشت بھی کرتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اس قسم کی محرومی صرف عارضی ہوتی ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تجربہ اسے اُن لوگوں کی تکالیف کے سنگین اثرات کو محسوس کرنے کے قابل بنا دیتا ہے جو دنوں، ہفتوں یا شاید مہینوں تک زندگی کی بنیادی ضروریات سے محروم چلے آ رہے ہوتے ہیں۔ معاشرتی اور انسانی سطح پر اس تجربے کا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہمدردی کرنے اور اُن کی ضروریات پوری کرنے میں کسی بھی دوسرے شخص کے مقابلے میں زیادہ فعال اور سرگرم ہوگا۔ اور یہی اُس کی بے غرضی اور حقیقی ہمدردی کا واضح ثبوت ہے۔

۶۔ روزہ اعتدال پسندی اور قوتِ ارادی کی مؤثر اور عملی تعلیم دیتا ہے۔ جو شخص صحیح طریقے سے روزہ رکھتا ہے وہ یقیناً اپنی منہ زور خواہشات کو لگام دے سکتا ہے اور اپنی ذات کو مادی ترغیبات سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ ایسا شخص ہی صاحبِ شخصیت و کردار، قوتِ ارادی کا مالک اور پُرعزم کہلانے کے لائق ہے۔

۷۔ روزہ انسان کو بلند تر ہونے کے لیے شفّاف روح، غور و فکر کے لیے صاف ستھرا ذہن اور عمل و حرکت کے لیے پھرتیلا جسم عطا کرتا ہے۔ یہ سب لازمی نتیجہ ہے معدے کو ہلکا پھلکا رکھنے کا۔ طبّی ہدایات، حیاتیاتی قوانین اور ذہنی تجربہ اس حقیقت کی

تصدیق کرتے ہیں۔

۸۔ روزہ انسان کو دانشمندانہ بچت اور صحیح بجٹ بنانے کی نئی راہ سُجھاتا ہے کیونکہ جب وہ باقاعدگی سے کم مقدار میں کھانا کھاتا ہے تو وہ کم رقم خرچ کرتا ہے اور کھانے پر اُس کی کم محنت صرف ہوتی ہے۔ اس طرح روزہ گھریلو حساب کتاب اور بجٹ سازی کا ایک روحانی نصاب اور اس کی عملی تربیت ہے۔

۹۔ روزہ انسان کو شعوری مطابقت پذیری کا فن سکھاتا ہے۔ ہم یہ بات اُس وقت آسانی سے سمجھ سکتے ہیں جب ہم محسوس کر لیتے ہیں کہ روزہ رکھ کر انسان کو اپنی روزمرہ زندگی کے طور طریقوں میں تبدیلی لانی پڑتی ہے۔ پھر جب وہ تبدیلی لاتا ہے تو قدرتی طور پر اپنے آپ کو ایک نئے نظام کے مطابق ڈھالتا ہے اور نئے ضابطوں کی تکمیل کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ اس طرح بالآخر اُس میں مطابقت پذیری کا دانشمندانہ شعور اور زندگی کے غیر متوقع آلام کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا ہوتی ہے۔ جو شخص تعمیری مطابقت پذیری اور حوصلہ مندی کی قدر کرتا ہے وہ روزے کے فوائد کا بآسانی ادراک کر سکتا ہے۔

۱۰۔ روزہ انسان کو نظم و ضبط اور صحت مند زندگی کے بنیادی اصول سکھاتا ہے۔ جب انسان رمضان المبارک کے دوران لگاتار اور پھر ہر سال اس مبارک مہینے کے روزے باقاعدگی سے رکھتا ہے تو وہ یقینی طور پر خود کو ایک اعلیٰ قسم کے ضابطے کا پابند بناتا ہے اور اپنے اندر نظم و ضبط کا اعلیٰ شعور پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح جب وہ اپنے معدے کو فراغت اور نظامِ ہضم کو آرام کی مہلت دیتا ہے تو بلاشبہ وہ اپنے جسم کو ان تمام مضرتوں سے محفوظ کر لیتا ہے جو معدے میں خوراک ٹھونسے رکھنے سے پیدا ہو سکتی ہیں۔ معدے کو اس طرح آرام پہنچانے سے اُسے اطمینان ہو جاتا ہے کہ اُس کا جسم عام بیماریوں اور خرابی صحت سے محفوظ رہے گا اور اس کی روح پاکیزگی اور امن و سلامتی کی حالت میں درخشندہ رہے گی۔

۱۱۔ روزہ انسان میں معاشرتی بندھن، اتحاد و اخوت اور اللہ اور قانون کی نظر میں مساوات کا حقیقی جذبہ پیدا کرتا ہے۔ یہ جذبہ اس حقیقت کا فطری نتیجہ ہے کہ جب کوئی شخص روزہ رکھتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک ہی فرض ایک ہی انداز میں ایک ہی وقت میں ایک ہی جذبے سے اور ایک ہی مقصد کے لیے ادا کرنے میں پورے اسلامی معاشرے کے ساتھ شریک ہے۔ کوئی ماہرِ عمرانیات یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ تاریخ کے کسی دور میں کوئی ایسی روایت موجود رہی ہے جس کا موازنہ اسلام کی اس اعلیٰ روایت سے کیا جا سکتا ہو۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں لوگ کسی قابلِ قبول بندھن، اتحاد، اخوت، مساوات ایسی اقدار کے فروغ کے لیے آواز اٹھاتے رہے ہیں لیکن آپ نے دیکھا کہ اُن کی آواز کس طرح بے اثر ثابت ہوئی اور انہیں اس سمت میں کتنی حقیر کامیابی حاصل ہوئی۔ اسلام کے رہنما مینارۂ نور کے بغیر وہ اپنے مقاصد میں بھلا کس طرح کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔

۱۲۔ روزہ اندیشوں کا ازالہ کرنے، ضبطِ نفس پیدا کرنے، انسانی وقار اور آزادی کو برقرار رکھنے اور فتح اور امن و سلامتی کے قیام کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی ہوئی ہدایت ہے۔ یہ وہ ثمرات ہیں جو روزہ رکھنے والے شخص کے دل میں ایک زندہ حقیقت بن کر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ جب کوئی شخص صحیح طریقے سے روزہ رکھتا ہے تو وہ اپنے آپ کو نظم و ضبط میں لاتا ہے، اپنے جذبات پر قابو پاتا ہے، اپنی خواہشات کو منضبط کرتا ہے اور تمام شیطانی ترغیبات کی مزاحمت کرتا ہے۔ اس طریقے سے وہ اپنے اندیشہ ہائے بے جا دُور کرنے، اپنا وقار اور سالمیت بحال کرنے اور خود کو بدی کی گرفت سے آزاد کرانے کے قابل ہو جاتا ہے۔ جب وہ یہ سب کچھ حاصل کر لیتا ہے تو وہ اپنی ذات میں امن و سلامتی قائم کر لیتا ہے۔ انسان کی ذات کا یہی اندرونی امن، خدا کے ساتھ اور پھر پوری کائنات کے ساتھ مستقل امن کے قیام کا ذریعہ ہے۔

اب کوئی بھی شخص معترض ہو سکتا ہے کہ اگر روزے کی اسلامی روایت کی یہی خصوصیات ہیں تو پھر مسلمان ایک مثالی معاشرت کا قیام کیوں ممکن نہیں بنا لیتے۔ اس قسم کے اعتراض کے جواب میں ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان تاریخ کے ایک خاص دور میں اس قسم کی مثالی معاشرت قائم کر چکے ہیں۔ اس مثالی معاشرت کو حقیقت بنانا انسانی تاریخ میں اپنی نوعیت کی ایک منفرد کامیابی تھی۔ ہم اسے منفرد اس لیے کہتے ہیں کہ اسلام کے سوا کوئی مذہب یا معاشرتی نظام کبھی اپنے اصولوں کو حقیقت کا روپ دینے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ دوسرے مذاہب اور معاشرتی نظاموں کی مثالی معاشرت ہمیشہ نظریات، حسرت آمیز تخیلات اور خوابوں تک محدود رہی ہے۔ یہ نظریات اور خواب کبھی واضح، کبھی مبہم، کبھی نزدیک اور زیادہ تر حقیقت سے دور ہی رہے لیکن اسلام کی مثالی معاشرت نے حقیقت کا روپ اختیار کیا اسے پوری طرح عملی سانچے میں ڈھالا گیا اور لوگ اس کے ثمرات سے پوری طرح بہرہ ور ہوئے۔ انسانی اور عملی نقطۂ نظر سے اس کا مطلب ہے کہ مثالی اسلامی معاشرت اسی روئے زمین پر دوبارہ قائم کی جا سکتی ہے اور اسے ٹھوس بنیادوں اور قابلِ عمل اصولوں پر استوار کیا جا سکتا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج کے دور میں مثالی اسلامی معاشرے کا وجود کیوں نہیں ملتا۔ اس کی بہت سی وجوہات ہیں جنہیں بآسانی بیان کیا جا سکتا ہے لیکن اس بحث کو روزے کے ادارے تک محدود رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ بدقسمتی سے مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد روزہ نہیں رکھتی یا اس ضمن میں لاتعلقی کا رویہ اختیار کیے ہوئے ہے۔ دوسری طرف جو لوگ روزہ رکھتے ہیں اُن میں زیادہ تر تعداد ایسے افراد کی ہے جو روزے کے صحیح مفہوم سے آگاہ نہیں ہیں۔ نتیجۃً یہ لوگ روزے سے بہت کم فائدہ اٹھاتے ہیں یا پھر بالکل نہیں اُٹھاتے۔ یہی وجہ ہے کہ مجموعی طور پر آج کے مسلمان روزے کے حقیقی فوائد سے بہرہ ور نہیں ہو رہے۔

کسی طرف سے یہ اعتراض بھی اُٹھایا جا سکتا ہے کہ جو دعوے اسلامی روزے سے متعلق کیے جا سکتے ہیں وہ دوسری قسم کے روزوں مثلاً عید فصح[1] ایسٹر کا چلہ[2] یا گاندھی کی طرز کے روزے سے متعلق بھی درست تصور کیے جا سکتے ہیں تو پھر مسلمان ہی اپنی قسم کے روزے سے متعلق کیوں اتنے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں۔

اس قسم کا اعتراض کرنے والوں پر ہم واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت میں کسی پیغمبرِ خدا کی بدگوئی کرنا یا کسی سچائی کو رد کرنا یا کسی آسمانی مذہب کو جھٹلانا ہمارے مذہبی اصولوں اور اخلاقیات کے خلاف ہے۔ دوسرے لوگ (غیر مسلم) آزادانہ طور پر اسی طرح کی غیر ذمہ دارانہ حرکات کا ارتکاب کرتے ہیں لیکن ہم مسلمان ایسا نہیں کرتے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اگر ہم ایک بار اس طرح کی اخلاقی پستی یا بد اخلاقی کی حالت کو پہنچ گئے تو ہم عملاً دائرہ اسلام سے خارج ہو جائیں گے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ روزے کی روایت اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود انسانی تاریخ۔ نیز اللہ تعالیٰ نے جس طرح مسلمانوں کو روزہ رکھنے کا حکم دیا ہے اسی طرح قبل از اسلام بھی لوگوں کو اس کی ہدایت کی تھی۔ لیکن ہم نہیں جانتے اور ہمیں یقین ہے کہ بہت سے لوگ یہ بات نہیں جانتے ہوں گے کہ دوسری قسم کے روزے جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا ان کی صحیح شکل اور آداب کیا تھے۔ تاہم سچائی تک پہنچنے اور ذوقِ تجسس کی تسکین کیلئے ہم حقائق و دلائل کی روشنی میں اسلام کی اس روایت کا دوسری اقسام کے روزوں سے تقابل

---

[1] عید فصح یہودیوں کی عید ہے جو اُس وقت کی یاد میں منائی جاتی ہے جب حضرت موسیٰؑ مصر میں بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم و ستم سے نجات دلا رہے تھے۔ مصریوں پر بہت سے عذاب نازل ہوتے جبکہ بنی اسرائیل محفوظ رہے تھے۔ (از مترجم)

[2] ایسٹر کا چلہ جو صحرا میں حضرت عیسیٰؑ کے روزہ رکھنے کی یاد میں منایا جاتا ہے اور جس کے دوران حضرت عیسیٰؑ کے پیروکار روزہ رکھتے ہیں (از مترجم)

کر سکتے ہیں۔

روزے کا تقابلی جائزہ

۱۔ دیگر مذاہب وعقائد اور مسالک ونظریات کے تحت روزہ رکھنے والا شخص روزے کے دوران خاص اقسام کی غذا یا مشروبات یا بعض مادی اشیاء سے پرہیز کرتا ہے لیکن ان کی بجائے وہ دوسری قسم کی اشیاء، جو مادی نوعیت ہی کی ہیں، سے اپنا پیٹ بھرنے میں مکمل طور پر آزاد ہوتا ہے۔ اسلام میں روزہ رکھنے والا مادی نوعیت کی تمام اشیاء مثلاً کھانے، پینے، تمباکو نوشی وغیرہ سے مکمل پرہیز کرتا ہے تاکہ اُسے روحانی مسرتیں حاصل ہوں اور اخلاقی تربیت ملے۔ مسلمان اپنے معدے کو تمام مادی اشیاء سے اس لیے خالی رکھتا ہے کہ اُس کا نفس سکون وطمانیت سے مالا مال، دل محبت اور ہمدردی کے جذبے سے لبریز، روح تقویٰ اور ایمان سے سرشار اور ذہن حکمت و عزم سے معمور ہو۔

۲۔ دوسرے مذاہب و مسالک میں روزے کا مقصد ہمیشہ جزوی نوعیت کا ہوتا ہے یعنی یا تو یہ روحانی مقاصد کے لیے ہوتا ہے یا جسمانی ضروریات کے تحت رکھا جاتا ہے یا پھر اس کا اہتمام غور و فکر اور ذہن کی آبیاری کے لیے کیا جاتا ہے۔ یہ تمام مقاصد بحیثیت مجموعی کبھی پیشِ نظر نہیں ہوتے۔ لیکن اسلام میں روزہ ان تمام فوائد اور دیگر کئی مقاصد کا احاطہ کرتا ہے۔ ان میں سماجی واقتصادی، اخلاقی وانسانی، نجی و سرکاری، ذاتی واجتماعی، داخلی وخارجی، مقامی وملی غرض ہر نوع کے مقاصد بیک وقت شامل ہوتے ہیں جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

۳۔ غیر اسلامی روزہ بعض مخصوص مادی اشیاء سے جزوی پرہیز کے سوا کسی اور چیز کا تقاضا نہیں کرتا۔ لیکن اسلامی روزہ صرف مخصوص مادی اشیاء سے پرہیز کا نام نہیں بلکہ یہ

روزہ دار سے معمول سے زاید استغراق و عبادت، زاید خیرات و سخاوت، زاید مطالعۂ قرآن، زاید ملنساری اور زندہ دلی، زاید ضبطِ نفس و بیداریِ ضمیر کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس طرح روزے کی حالت میں ایک مسلمان خود کو ایک مختلف شخص محسوس کرتا ہے۔ وہ اندر سے اتنا ہی پاک صاف ہوتا ہے جتنا باہر سے اور اُس کا نفس اتنا منزہ و شُستہ ہوتا ہے کہ وہ خود کو ملکیّت کے قریب محسوس کرتا ہے کیونکہ اُسے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔

۴۔ ہم اپنے بہترین علم اور روزمرہ کے تجربات کی بنیاد پر کہہ سکتے ہیں کہ دوسرے اخلاقی مسالک و مذاہب انسان کو یہ تعلیم دیتے ہیں کہ وہ اُس وقت تک اپنے اخلاقی مقاصد کی تکمیل نہیں کر سکتا یا خدا کی سلطنت میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک وہ خود کو دنیاوی امور سے مکمل طور پر منقطع نہیں کر لیتا۔ چنانچہ ایسے شخص کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے دنیاوی مفادات سے ہاتھ اُٹھا لے، اپنی انسانی ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہو جائے اور کسی نہ کسی طرح کی خود اذیّتی کا یا ترکِ دنیا کا راستہ اختیار کر لے۔ روزہ اس طرزِ زندگی کا ایک لازمی حصّہ ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے اس قسم کا روزہ دراصل ایک ایسا بہانہ ہے جسے معمولاتِ زندگی سے ذلت آمیز پسپائی اختیار کرنے کے لیے جواز کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے اور کیا جاتا رہا ہے لیکن اسلام جس روزے کا حکم دیتا ہے وہ زندگی سے منقطع ہونا نہیں بلکہ اس کے ساتھ خوشگوار بندھن استوار کرنا ہے۔ یہ پسپائی نہیں بلکہ روحانی قوتوں سے لیس ہو کر کاروبارِ زندگی میں مستعد ہونا ہے۔ یہ تساہل یا غفلت نہیں بلکہ اخلاقی اقدار سے مالا مال ہونا ہے۔ اسلامی روزہ مذہب کو روزمرہ زندگی سے یا روح کو جسم سے الگ نہیں کرتا۔ یہ اُن میں افتراق نہیں بلکہ ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ یہ ان کی توڑ پھوڑ نہیں کرتا بلکہ ایک کو دوسرے میں جاری و ساری رکھتا ہے۔ یہ ان کو منتشر نہیں بلکہ ان کی شیرازہ بندی کرتا ہے اور

انسان کو گوناگوں مشکلات سے نجات دلاتا ہے۔

۵۔ اسلامی روزے کا نظام الاوقات بھی ایک غیر معمولی امر واقعہ ہے۔ دوسری قسم کے روزوں کے نظام الاوقات انتہائی غیر لچکدار انداز میں سال کے ایک خاص حصے میں مقرر ہیں لیکن اسلام میں روزے ماہِ رمضان کی آمد سے شروع ہوتے ہیں جو کہ سال کا نواں مہینہ ہے۔ اسلامی سال قمری تقویم پر مبنی ہے اور مہینے چاند کی مختلف حالتوں کے مطابق ترتیب پاتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ چند برسوں کے محدود عرصہ میں اسلامی روزے سال کے چار بڑے موسموں سے گزرتے ہیں اور موسمِ گرما اور موسمِ سرما کے درمیان خزاں اور بہار میں سے گزرتے ہوئے آگے پیچھے گردش کرتے رہتے ہیں۔ قمری تقویم کی نوعیت کچھ اس طرح کی ہے کہ کسی سال ماہِ رمضان جنوری میں آتا ہے تو دوسرے سال دسمبر میں اور اس طرح بعد کے سالوں میں یہ سال کے ہر حصے میں سے گزرتا ہے۔ روحانی اعتبار سے اس کا مطلب ہے کہ ایک مسلمان مختلف سطحوں پر روزے کے اخلاقی تجربے سے متمتع ہوتا ہے اور سال کے مختلف موسموں میں روزے کا روحانی ذائقہ چکھتا ہے ـــــ کبھی موسمِ سرما کے مختصر اور سرد دنوں میں؛ کبھی موسمِ گرما کے طویل اور گرم دنوں میں اور کبھی ان دونوں کے درمیان معتدل موسم میں لیکن تجربے کا یہ تنوّع ہمیشہ اسلامی روایت کی شگفتگی کی اثر آفرین خصوصیت بنا رہتا ہے۔ مزید برآں یہ تنوّع صاحبِ ایمان مسلمان کی مستعدی، حرکت پذیری اور مطابقت پذیری کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ وہ صفات ہیں جو یقینی طور پر اسلامی تعلیمات کا ایک صحت مند اور نہایت اہم حصہ ہیں۔

روزے کا دورانیہ

قبل ازیں بتایا جا چکا ہے کہ فرض روزوں کا زمانہ ماہِ رمضان ہے۔ اس مہینے میں

روزانہ روزہ رکھنے کا وقت صبح پو پھٹنے سے پہلے شروع ہوتا ہے اور غروبِ آفتاب کے فوراً بعد ختم ہو جاتا ہے۔ عام طور پر ایسے نقشے مل جاتے ہیں جن میں سحری و افطاری کے صحیح اوقات درج ہوتے ہیں لیکن اس قسم کی سہولتوں کی عدم موجودگی میں گھڑی اور سورج کی پوزیشن کے مطالعہ کے علاوہ مقامی اخبارات، محکمہ موسمیات وغیرہ سے استفادہ کرنا چاہیے۔

ماہِ رمضان کے روزے رکھنا ہر ذمہ دار اور عاقل و بالغ (مکلف) مسلمان پر فرض ہے۔ ماہِ رمضان المبارک کے علاوہ بھی کچھ ایام ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی میں روزہ رکھنے کی پرزور سفارش کی جاتی ہے۔ ان ایام میں ہر ہفتے کا سوموار اور منگل، ماہِ رمضان کی آمد سے قبل کے دو مہینوں یعنی رجب اور شعبان میں ہر ماہ چند ایام، رمضان کے اختتام پر عید الفطر کے بعد کے چھ دن شامل ہیں۔ علاوہ ازیں روزے کی قضا ادا کرنے کے لیے سوائے عید الفطر اور جمعہ کے ایام کے جن میں کسی مسلمان کے لیے روزہ رکھنا درست نہیں سال کے کسی مہینے کے کسی بھی دن روزہ رکھا جا سکتا ہے۔ تاہم ہم دوبارہ بتائے دیتے ہیں کہ فرض روزے ماہِ رمضان ہی کے ہوتے ہیں جن کے دنوں کی تعداد چاند کی حالت کے تحت ۲۹ یا ۳۰ ہو سکتی ہے۔ روزہ اسلام کا ستون ہے اور کسی معقول عذر کے بغیر روزہ نہ رکھنا سخت قابلِ سزا گناہ ہے۔

یہ جان لینے کے بعد کہ روزہ انسان کے لیے کیا کرتا ہے اگر کوئی شخص کوئی قسم توڑ دے تو خدا اُسے مسلسل تین دن روزہ رکھنے کا حکم دیتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص یہ اعلان کر بیٹھے کہ اُس کی بیوی اُس پر اسی طرح حرام ہے جس طرح اُس کی ماں (یہ قبل از اسلام زمانۂ جہالت کا رواج تھا) تو اُس کے لیے لازمی ہے کہ وہ اپنے غیر محتاط اور غیر ذمہ دارانہ رویّے کا ازالہ کرے۔ اِس گناہ کے کفارے کے لیے اُسے مسلسل دو ماہ تک روزے رکھنا ہوں گے۔

(حوالے کے لیے دیکھیے قرآن کی سورۃ ۲ : آیات ۱۸۳ تا ۱۸۵، سورۃ ۵ : آیت ۹۲، سورۃ ۵۸ : آیات ۱ تا ۴)

روزے کی فرضیّت

ماہِ رمضان کے روزے ہر اُس مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہیں جو مندرجہ ذیل شرائط پوری کرتا ہو۔

۱۔ دماغی اور جسمانی لحاظ سے صحت مند یعنی عاقل و بالغ ہو۔

۲۔ بلوغت اور ہوشمندی کی عمر کو پہنچ چکا ہو جو عموماً ۱۴ سال کی ہوتی ہے۔ اس سے کم عمر کے بچوں کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے کہ وہ آسان حالات میں اس نیک کام کا آغاز اور اس کی مشق کریں تاکہ جب وہ بلوغت کی عمر کو پہنچیں تو ذہنی اور جسمانی طور پر روزہ رکھنے کے لیے تیار ہو چکے ہوں۔

۳۔ اپنی مستقل جائے سکونت، اپنے شہر، اپنی زرعی اراضی، اپنے کاروباری مرکز وغیرہ کی حدود میں ہو۔ یعنی وہ حالتِ سفر میں نہ ہو۔ سفر سے مراد پچاس میل یا اس سے زیادہ مسافت کا سفر ہے۔

ٹہ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ کسی سنجیدہ قسم کو توڑنے کا کفارہ دس حاجت مندوں کو کھانا کھلانا یا انہیں کپڑے بنا کر دینا ہے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو قصوروار کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک غلام آزاد کرے یا فدیہ دے کر چھڑائے۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو پھر تین دن روزہ رکھنا آخری متبادل راستہ ہے۔ (قرآن کی سورۃ ۱۵: آیت ۹۲)

بیوی کے بارے میں بے سوچی سمجھی بات کرنے، جو کہ قبل از اسلام ایک مکروہ رواج تھا، کی صورت میں قصوروار کا پہلا فرض ایک غلام کو آزاد کرنا یا فدیہ پر چھڑانا ہے۔ اگر وہ اس کی استطاعت نہیں رکھتا تو پھر اس کے لیے ضروری ہے کہ بیوی کا قرب حاصل کرنے سے پہلے مسلسل دو ماہ کے روزے رکھے۔ اگر وہ روزے رکھنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تو اُس کے لیے لازم ہے کہ ساٹھ حاجتمندوں کو کھانا کھلائے یا غربا میں اوسط درجے کا ساٹھ آدمیوں کا کھانا تقسیم کرے۔ اس کے علاوہ کچھ اور مواقع بھی ہیں جب بعض مشکل کاموں کے متبادل کے طور پر روزہ رکھنا ضروری ہو جاتا ہے یا اس کی سفارش کی جاتی ہے۔

۴۔ پُریقین ہو کہ روزہ رکھنے سے اُسے کوئی جسمانی یا ذہنی نقصان پہنچنے کا احتمال نہیں سوائے اُن معمول کے اثرات کے جو بھوک پیاس وغیرہ کے نتیجے میں ظاہر ہوتے ہیں۔

روزے سے استثنا

جو لوگ مندرجہ ذیل میں سے کسی بھی ایک زمرے میں آتے ہیں اُن پر مذکورہ بالا شرائط کا اطلاق نہیں ہوتا لہٰذا وہ روزہ ترک کر سکتے ہیں۔

۱۔ بچے جو ابھی سن بلوغت اور ہوشمندی کی عمر کو نہیں پہنچے۔

۲۔ فاتر العقل افراد جو اپنے اعمال کے لیے جوابدہ نہیں ہیں۔ یہ دونوں قسم کے لوگ روزے کی فرضیت سے مستثنیٰ ہیں۔ اُن کے لیے روزے کی قضا یا کسی اور قسم کا کفارہ ادا کرنے کا حکم نہیں ہے۔

۳۔ وہ مرد اور عورتیں جو اس قدر معمر اور ضعیف ہیں کہ اُن سے روزہ رکھنے کا فرض نہیں نبھ سکتا یا اس کی تکلیف برداشت نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کے لوگ اس فرض کی ادائیگی سے مستثنیٰ ہیں۔ لیکن ان پر لازم ہے کہ وہ ہر روزے کے بدلے فدیہ دیں یعنی کم از کم ایک نادار مسلمان کو ایک وقت کا اوسط درجے کا کھانا کھلائیں یا اس کی قیمت کے مساوی نقد رقم دیں لیکن اگر ایسا شخص روزہ رکھنے کے قابل ہو جائے خواہ وہ مہینے بھر میں ایک روزہ رکھ سکے تو اُسے ضرور رکھنا چاہیے اور باقی قضا روزوں کے بدلے فدیہ دینا چاہیے ورنہ اس غفلت کے لیے اُسے جواب دہ ہونا پڑے گا۔

۴۔ بیمار لوگ جن کی صحت روزہ رکھنے سے شدید متاثر ہو سکتی ہو جب تک بیماری کی حالت میں ہوں روزہ ملتوی کر سکتے ہیں۔ انہیں بعد میں ہر قضا روزے کے بدلے ایک روزہ رکھنا ہوگا۔

۵۔ وہ لوگ جو حالتِ سفر میں ہوں اور اُن کا یہ سفر پچاس میل یا اس سے زاید مسافت کا ہو۔

اس صورت میں مسافر صرف سفر کے دوران عارضی طور پر روزہ ترک کر سکتے ہیں اور بعد کے دنوں میں ہر چھوڑے ہوئے روزے کے بدلے ایک روزہ رکھ کر اس کی تلافی کر سکتے ہیں۔ تاہم قرآنی ہدایت کے مطابق اگر انہیں روزہ رکھنے میں غیر معمولی تکلیف برداشت نہ کرنی پڑے تو اُن کے حق میں یہی بہتر ہے کہ رمضان کے روزے قضا نہ کریں۔

۶۔ حاملہ اور دودھ پلانے والی خواتین بھی جنہیں روزہ رکھنے سے اپنی یا اپنے بچوں کی صحت کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو روزہ ترک کر سکتی ہیں لیکن بعد میں انہیں ہر چھوڑے ہوئے روزے کے بدلے روزہ رکھنا ہوگا۔

۷۔ خواتین جو حیض یا زچگی کی حالت میں ہوں (حیض کی زیادہ سے زیادہ مدت دس دن اور زچگی کی زیادہ سے زیادہ مدت چالیس دن ہے) ایسی خواتین کو روزہ رکھنے کی اجازت نہیں خواہ وہ روزہ رکھنے پر قادر ہوں اور رکھنا بھی چاہتی ہوں۔ اُن کے لیے ضروری ہے کہ وہ صحت یاب ہونے تک روزہ ملتوی کر دیں اور بعد میں ہر قضا روزے کے بدلے ایک روزہ رکھیں۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ دوسرے اسلامی فرائض کی طرح روزے کی نیت بھی واضح ہونی چاہیے کہ یہ فعل خالصتہً اللہ تعالیٰ کی اطاعت، اُس کے حکم کی متابعت اور اُس کی محبت میں انجام دیا جا رہا ہے۔ ماہِ رمضان میں روزے کی حالت میں عمداً کوئی چیز کھانے یا پینے یا تمباکو نوشی کرنے یا مباشرت میں ملوث ہونے یا کوئی چیز حلق سے نیچے اُتارنے سے روزہ فسخ ہو جاتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص بغیر کسی جواز کے جان بوجھ کر روزہ توڑتا ہے تو اُس کا کفّارہ یہ ہے کہ وہ لگاتار ساٹھ روزے رکھے یا دوسری متبادل صورت یہ ہے کہ جس دن کا روزہ توڑا گیا تھا اُس کے بدلے کا ایک روزہ رکھے اور اُس کے علاوہ ساٹھ مسکینوں کو پیٹ بھر کر کھانا کھلائے۔

اگر ماہِ رمضان کے سوا کسی اور دن کا روزہ اُن جائز وجوہات کی بنا پر توڑا جائے جن کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں "روزے سے استثنا" کے ضمن میں ہوا ہے تو روزہ توڑنے والے کو چاہیے کہ اس کی تلافی کے لیے ہر ایک دن کے روزے کے بدلے ایک دن کا روزہ رکھے۔

کوئی ایسا فعل جس سے عام حالات میں روزہ فسخ ہو جاتا ہے اگر روزہ دار سے غلطی یا بھول چوک سے سرزد ہو جائے تو اُس کا روزہ فسخ نہیں ہوگا اور درست حالت میں برقرار رہے گا بشرطیکہ اس فعل کا احساس ہوتے ہی وہ اس سے باز آجائے۔

ماہِ رمضان کے روزے مکمل ہونے پر مسکینوں میں خصوصی امداد جسے صدقۃ الفطر (روزہ چھوڑنے کا صدقہ) کہتے ہیں تقسیم کرنا ضروری ہے۔

عام ہدایات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بالخصوص ماہِ رمضان کے دوران ان ہدایات پر عمل کرنے کی تاکید کی ہے۔

۱۔ صبح صادق سے پہلے (سحور کے وقت) ہلکی غذا کھانا۔

۲۔ غروبِ آفتاب کے فوراً بعد یہ دعا پڑھتے ہوئے تین کھجوریں کھا کر پانی پینا۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّی لَکَ صُمْتُ وَبِکَ اٰمَنْتُ وَعَلَیْکَ تَوَکَّلْتُ وَعَلٰی رِزْقِکَ اَفْطَرْتُ۔

۳۔ جہاں تک ہو سکے ہلکی غذا کھانا کیونکہ جیسا کہ رسولِ خدا نے کہا ہے کہ بدترین چیز جسے انسان بھرتا ہے وہ اس کا معدہ ہے۔

۴۔ رمضان المبارک کی سُنّت نماز (تراویح) ادا کرنا۔

۵۔ سماجی ملاقاتیں کرنا اور انسانی بھلائی کے کاموں میں دلچسپی لینا۔

۶۔ قرآن کے مطالعہ اور تلاوت میں اضافہ کرنا۔

۷۔ تحمل و برداشت اور عجز وانکسار سے کام لینا۔

۸۔ فضول باتوں اور یاوہ گوئی سے اجتناب کرنے اور تمام مشکوک حرکات سے باز رہنے کے لیے حواس، ذہن اور بالخصوص زبان کے استعمال میں غیر معمولی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

زکوٰۃ

اسلام کا ایک اور غیر معمولی طور پر نمایاں ادارہ اور عظیم ستون زکوٰۃ ہے۔ جہاں تک ہمارا علم ہے قرآنی لفظ زکوٰۃ اور اس کے صحیح مفہوم کا مترادف کسی دوسری زبان میں موجود نہیں۔ زکوٰۃ محض خیرات، سخاوت، ٹیکس یا عشر کی کوئی شکل نہیں نہ یہ محض اظہارِ ہمدردی ہی ہے بلکہ یہ ان سب کا امتزاج اور اس کے علاوہ مزید بہت کچھ ہے۔ یہ کسی کی جائداد میں سے ایک خاص شرح سے محض کٹوتی نہیں بلکہ امارتِ کثیر اور روحانی سرمایہ کاری ہے۔ یہ محض کسی شخص کو یا کسی مقصد کے لیے رضاکارانہ طور پر دیے جانے والے حصّے کا نام نہیں نہ یہ سرکاری ٹیکس ہے کہ کوئی شخص اپنی مکاری سے اس سے پیچھا چھڑا لے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ فرض ہے جس کی ادائیگی کی ذمہ داری مسلمانوں نے معاشرے کے مجموعی مفاد کے لیے اٹھائی ہے۔ قرآنی لفظ زکوٰۃ کے مفہوم میں صرف خیرات، سخاوت، عشر، شفقت، سرکاری ٹیکس، رضاکارانہ امداد وغیرہ ہی نہیں بلکہ اس میں خوفِ خدا اور روحانی و اخلاقی محرکات بھی شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی دوسرا لفظ زکوٰۃ کا مترادف نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ خالصتہً اللہ تعالیٰ کی آسمانی کتاب قرآن مجید کا دیا ہوا لفظ ہے۔

زکوٰۃ کے لغوی اور سادہ معنی پاکیزگی کے ہیں۔ اس لفظ کے اصطلاحی معنی جنس یا نقد رقم کی وہ سالانہ مقدار ہے جو ایک مالدار مسلمان کو مستحقین میں تقسیم کرنی پڑتی ہے لیکن زکوٰۃ کی مذہبی اور روحانی اہمیت اس سے کہیں زیادہ ٹھوس اور جاندار ہے۔ اسی طرح انسانی، معاشرتی اور سیاسی سطح پر بھی اس کی اہمیت کسی بھی لحاظ سے کم نہیں ہے۔ یہاں ہم زکوٰۃ کے دُور رس اثرات کی وضاحت کرنے کی کوشش کریں گے۔

۱۔ زکوٰۃ مالدار لوگوں کی جائداد کا تزکیہ کرتی ہے اور اسے اُن حصوں سے پاک کر دیتی ہے جن کا اب اس جائداد سے تعلق نہیں رہا۔ یہ وہ حصے ہیں جن کا مستحقین میں تقسیم کیا جانا ضروری ہے۔ جب زکوٰۃ واجب الادا ہو جائے تو دولت کی ایک خاص شرح بلا تاخیر صحیح طریقے سے تقسیم کر دینی چاہیے کیونکہ اس حصے پر مالک کا قانونی اور اخلاقی قبضہ ختم ہو جاتا ہے۔ اگر وہ زکوٰۃ کی ادائیگی نہیں کرتا تو ظاہر ہے کہ وہ ایسی چیز پر اپنا قبضہ برقرار رکھے ہوئے ہے جو اب اُس کی ملکیت نہیں رہی۔ ایسا کرنا اخلاقی، روحانی اور کاروباری غرضیکہ ہر لحاظ سے بدعنوانی اور ایک سیدھا سادا غصب ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ غیر قانونی طور پر قبضے میں رکھا ہوا حصہ پوری دولت کو ناپاک اور پُرخطر بنا دیتا ہے۔ لیکن دوسری طرف اگر مساکین کے حصوں کو الگ کر کے انہیں مستحقین میں تقسیم کر دیا جائے تو باقی بچ رہنے والی دولت خالص اور پاک صاف ہوگی۔ بے لاگ سرمایہ اور پاک صاف ملکیت ہی دراصل مستقل خوشحالی اور دیانت دارانہ معاملات کی اوّلین شرط ہے۔

۲۔ زکوٰۃ نہ صرف زکوٰۃ دہندہ کے مال کا تزکیہ کرتی ہے بلکہ اس کے دل کو بھی خود غرضی اور دولت کی حرص سے پاک کرتی ہے۔ دوسری طرف یہ وصول کنندہ کے دل کو بھی رشک، حسد اور نفرت کے جذبات سے پاک کرتی ہے اور اُسے بے جا اضطراب سے نجات دلاتی ہے۔ اس کی بجائے اُس کے دل کو زکوٰۃ دہندہ کے لیے خیر سگالی اور محبت کے جذبات سے معمور کر دیتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ معاشرے کی وسیع پیمانے پر تطہیر ہو جائے گی اور یہ طبقاتی کشمکش اور شکوک و شبہات، بدگمانی اور بے اعتمادی، بدعنوانی اور بگاڑ اور اس قسم کی تمام خرابیوں سے پاک ہو جائیگا۔

۳۔ زکوٰۃ معاشرے کے حاجت مند اور غریب افراد کی دشواریوں کو کم سے کم کر دیتی ہے۔ یہ کم خوش نصیب افراد کے لیے اطمینان بخش ڈھارس کا کام دیتی ہے۔ اس کے

باوجود یہ ہر شخص کو جدوجہد کے ذریعے اپنی حالت بہتر بنانے کی ترغیب دیتی ہے۔ زکوٰۃ حاجت مند کے لیے ایک ہنگامی امداد کا درجہ رکھتی ہے اور اس بات کا احساس دلاتی ہے کہ اُسے کلیتہً زکوٰۃ پر انحصار نہیں کرنا چاہیے بلکہ لازماً اپنے لیے ور دوسروں کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ یہ زکوٰۃ دہندہ کو زیادہ کمانے کی تحریک دیتی ہے تاکہ وہ زیادہ فائدہ اُٹھا سکے۔ غرض تمام متعلقہ فریقوں کے لیے زکوٰۃ بلا واسطہ اور بالواسطہ طور پر ایک ایسی روحانی سرمایہ کاری ہے جس کے بدل میں کثیر فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

۴۔ زکوٰۃ ایک ایسا صحت منداداره ہے جو خود غرضی، حرص و آز، نااتفاقی، بے جا مداخلت اور تخریبی نظریات کے خلاف بہترین اندرونی تحفظ فراہم کرتا ہے۔ یہ زکوٰۃ دہندہ میں معاشرتی ذمہ داری کا اور وصول کنندہ کو سماجی تحفظ اور معاشرے کی رکنیت کا احساس دلانے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔

۵۔ زکوٰۃ روحانیت اور بشر دوستی کے ایسے جذبے کا اظہار ہے جس سے فرد اور معاشرے کے مابین باہمی مؤافقتِ عمل کی فضا قائم ہوتی ہے۔ یہ اس حقیقت کی واضح مثال ہے کہ اگرچہ اسلام نجی کاروبار میں رکاوٹ نہیں بنتا یا نجی املاک کی مخالفت نہیں کرتا لیکن یہ خود غرضانہ اور حریصانہ سرمایہ داری کو بھی برداشت نہیں کرتا۔ زکوٰۃ اسلام کے اس عمومی فلسفے کا مظہر ہے جو فرد اور معاشرے کے مابین، شہری اور ریاست کے مابین، سرمایہ داری اور اشتراکیت کے مابین اور مادّیت اور روحانیت کے مابین اعتدال اور میانہ روی کا اصول اپنانے کے ساتھ ساتھ مثبت اور مؤثر راہِ عمل اختیار کرنے کا درس دیتا ہے۔

زکوٰۃ کی شرح

ہر مسلمان مرد اور عورت جس کے پاس سال کے آخر میں تقریباً پندرہ ڈالر یا اس سے

زائد رقم یا اتنی یا اس سے زائد مالیت کا تجارتی مال موجود ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کم از کم اڑھائی فی صد کی شرح سے زکوٰۃ ادا کرے۔ نقد رقم کی صورت میں معاملہ بالکل آسان ہے۔ لیکن اگر کسی شخص کے پاس دولت کاروباری سٹاک یا تجارتی اشیاء کی شکل میں ہو تو اُس کے لیے ضروری ہے کہ سال کے آخر میں ان اشیاء کی رائج الوقت قیمت کے حساب سے اپنی دولت کی تشخیص کرے اور کل مالیت پر زکوٰۃ اِسی اڑھائی فیصد کی شرح سے ادا کرے۔ اگر اُس کی سرمایہ کاری غیر منقولہ جائداد (مثلاً آمدنی دینے والی عمارات اور صنعتوں کی شکل میں ہے تو زکوٰۃ کُل خالص آمدنی پر دینا ہوگی نہ کہ پوری جائداد کی کل مالیت پر۔ لیکن اگر عمارات اور مکانات تجارت یا فروخت کی غرض سے ہیں تو زکوٰۃ تمام جائداد کی کل مالیت پر دینا ہوگی۔ علاوہ ازیں اگر کسی شخص نے کچھ رقم کسی کو قرض دے رکھی ہے اور مقروض قابلِ اعتماد شخص ہے تو اُدھار دی ہوئی رقم پر بھی زکوٰۃ دینی چاہیے کیونکہ یہ رقم بھی اُس کی محفوظ دولت ہی کا حصہ ہے۔

زکوٰۃ کی تمام صورتوں میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ زکوٰۃ دہندہ صرف اپنے خالص میزان پر زکوٰۃ دیتا ہے یعنی ذاتی اخراجات، گھریلو وظیفہ، تمام ضروری اخراجات اور قرضہ جات وغیرہ کی ادائیگی کے بعد جو رقم باقی بچ رہے صرف اُس پر زکوٰۃ دی جائے گی۔

یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ اڑھائی فیصد کی شرح کم سے کم شرح ہے۔ ہنگامی حالات یا ناگہانی ضروریات کے پیدا ہونے پر زکوٰۃ کی شرح کی کوئی حد نہیں۔ کوئی شخص جتنا زیادہ دے گا اتنا ہی متعلقہ افراد کے لیے بہتر ہوگا۔ زکوٰۃ کی تقسیم اُن تمام مقاصد کی تکمیل کرتی ہے جن کے لیے امدادی رقوم اکٹھا کرنے کی متعدد مہمیں چلائی جاتی ہیں۔ زکوٰۃ فنڈ تمام دوسرے فنڈز کا بدل مہیا کرتا ہے۔ یہ بات مستند طور پر بیان کی جاتی ہے کہ اسلامی حکومت کی تاریخ میں ایسے مواقع بھی آئے جب زکوٰۃ وصول کرنے کا اہل کوئی نہیں تھا۔ وسیع و عریض اسلامی قلمرو کی تمام رعایا، جس میں مسلمان، عیسائی، یہودی بھی شامل تھے، کے پاس اتنا کچھ

تھا جس سے وہ اپنی ضروریات پوری کر سکتے تھے۔ یوں حکمرانوں کو زکوٰۃ سے حاصل ہونے والی رقوم سرکاری خزانے میں جمع کرانی پڑتی تھیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر قانون زکوٰۃ صحیح طور پر وضع کیا جائے تو اس سے شہریوں کی ضروریات بہت حد تک پوری ہو جاتی ہیں اور سرکاری خزانے میں اتنا مال جمع ہو جاتا ہے کہ کوئی شخص حاجت مند یا نادار نہیں رہتا اور ہنگامی حالات سے نبٹنے کے لیے اچھی خاصی فاضل رقم ہر وقت خزانے میں محفوظ رہتی ہے۔

مفادِ عامہ کے اس موثر اقدام میں جو قابلِ اعتماد قوت پائی جاتی ہے اس کا سرچشمہ یہ حقیقت ہے کہ زکوٰۃ ایک آسمانی حکم ہے اور ایک ایسا ضابطہ ہے جسے خود اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے لازمی ٹھہرایا ہے۔ یہ کوئی ذاتی معاملہ یا رضاکارانہ امداد نہیں بلکہ ایک ایسا فریضہ ہے جس کی ادائیگی کے لیے انسان براہِ راست اللہ کے سامنے جواب دہ ہوگا۔ چونکہ زکوٰۃ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا قانون ہے اور عام لوگوں کے مفاد کے لیے اس کا نفاذ ضروری ہے اس لیے کسی مسلمان کو اس حکم سے غفلت برتنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر اس کی ادائیگی صحیح طریقے سے نہیں کی جا رہی تو ریاست کے قانونی اربابِ اختیار کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ عام لوگوں کی جانب سے مداخلت کر کے اس ادارے کو ٹھوس بنیادوں پر مستحکم کریں اور اس بات کا اطمینان کر لیں کہ زکوٰۃ کا نفاذ صحیح طور پر عمل میں آچکا ہے۔

زکوٰۃ کے مستحقین

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کے مستحقین کی درجہ بندی اس طرح کی ہے۔

۱۔ نادار مسلمان، تاکہ انہیں آلام و مصائب سے نجات دلائی جا سکے۔

۲۔ حاجت مند مسلمان، تاکہ انہیں ایسے ذرائع مہیا کیے جائیں جن سے وہ اپنی روزی کما سکیں۔

۳۔ نومسلم افراد، تاکہ انہیں آباد ہونے اور اپنی دیگر ضروریات پوری کرنے کے قابل

بنایا جاسکے۔

۴۔ مسلمان جنگی قیدی تاکہ زرِ فدیہ دے کر انہیں رہا کرایا جاسکے۔

۵۔ مقروض مسلمان تاکہ انہیں قرضہ جات سے نجات دلائی جاسکے جن کے بوجھ تلے وہ شدید ضروریات کی وجہ سے دب گئے ہوں۔

۶۔ مسلمان اہلکار، جنہیں کسی مسلمان حاکم نے زکوٰۃ جمع کرنے کے لیے مقرر کیا ہو تاکہ انہیں اس کام کا معاوضہ دیا جاسکے۔

۷۔ مسلمان، جو تحقیق، مطالعہ یا تبلیغِ اسلام کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے مقاصد کی تکمیل کے لیے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انہیں زکوٰۃ میں حصہ دار بنانے کا مقصد ان کے اخراجات پورے کرنے اور انہیں اپنی خدمات جاری رکھنے میں مدد دینا ہے۔

۸۔ مسلمان مسافر جو کسی غیر ملک میں بے یار و مددگار ہوں اور انہیں مدد کی ضرورت ہو۔

زکوٰۃ کا جائز وصول کنندہ وہ شخص ہے جس کے پاس اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے کچھ نہیں یا جس کے پاس سال کے آخر میں بہت کم پونجی یعنی پندرہ ڈالر سے کم رقم محفوظ ہے۔ اگر کسی کے پاس اندازاً پندرہ ڈالر یا اس سے زائد رقم موجود ہے تو وہ زکوٰۃ دینے والوں میں سے ہوگا نہ کہ لینے والوں میں سے۔ اگر کوئی زکوٰۃ لینے والا اپنا حصہ وصول کر لیتا ہے اور دیکھتا ہے کہ یہ رقم اُس کی فوری ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی ہے اور ان ضروریات کی تکمیل کے بعد تقریباً ۱۵ ڈالر یا اس سے زائد رقم بچ رہتی ہے تو اُسے مزید زکوٰۃ وصول نہیں کرنی چاہیے اور جو رقم اُس نے زائد وصول کی ہے وہ دوسرے مستحقین میں تقسیم کر دینی چاہیے۔

زکوٰۃ کی رقم براہِ راست ان افراد کو دی جاسکتی ہے جو اوپر بیان کیے گئے کسی ایک یا زیادہ طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں یا اُن سماجی بہبود کی تنظیموں کو دی جاسکتی ہے جو ان طبقوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہیں۔ زکوٰۃ ذہین اور ہونہار مسلمان طالبانِ علم کو

مستحقین کو وظیفے کی شکل میں بھی تقسیم کی جا سکتی ہے یا سماجی بہبود کی تنظیموں یا رفاہ عامہ کے سرکاری اداروں کو جو ان مقاصد کی سرپرستی کرتے ہیں امداد کی شکل میں دی جا سکتی ہے۔

زکوٰۃ تقسیم کرتے وقت ایک نادار مسلمان کو جو معذور اور اپاہج ہو اس مسلمان پر ترجیح دینی چاہیے جو کچھ نہ کچھ روزی کمانے کے قابل ہو۔ زکوٰۃ دہندہ کو مستحق ترین افراد تلاش کرنے میں اپنے بہترین انداز سے کام لینا چاہیے۔

آج کل جو ٹیکس ہم حکومتوں کو ادا کرتے ہیں وہ اس مذہبی فریضے (زکوٰۃ) کا بدل نہیں ہیں۔ زکوٰۃ کو ایک خصوصی فریضہ سمجھتے ہوئے اسے سرکاری ٹیکسوں کے علاوہ الگ طور پر ادا کرنا ضروری ہے تاہم شمالی امریکہ کے مسلمانوں کو ان ٹیکس قوانین سے فائدہ اٹھانا چاہیے جن کے تحت خیرات کی ہوئی رقم پر چھوٹ دی جاتی ہے۔ انہیں چاہیے کہ وہ زکوٰۃ کی رقم مستحقین کو ادا کریں اور پھر ادا کی ہوئی رقم پر قانونی چھوٹ کا مطالبہ کریں۔

زکوٰۃ دہندہ کو اپنے اس فریضہ کی بجا آوری پر فخر نہیں کرنا چاہیے اور نہ شہرت کا طالب ہونا چاہیے۔ اُسے زکوٰۃ کی ادائیگی کو جہاں تک ممکن ہو مخفی رکھنا چاہیے تاکہ وہ منافقت یا بے جا غرور میں مبتلا نہ ہو جائے کیونکہ منافقت اور غرور سے تمام نیک اعمال ضائع ہو جاتے ہیں۔ تاہم اگر نام کے اظہار یا امداد کے اعلان سے دوسروں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہو اور انہیں بھی نیکی کی ترغیب ملتی ہو تو پھر اس میں کوئی مضائقہ نہیں بلکہ ایسا کرنا درست ہوگا۔

مویشی اور زرعی پیداوار پر بھی زکوٰۃ فرض ہے۔ ان اشیاء پر جو زکوٰۃ دی جاتی ہے اس کی شرح مختلف صورتوں میں مختلف ہے اور اس کے لیے مفصل بحث کی ضرورت ہے۔ چنانچہ قارئین کو ہمارا مشورہ ہے کہ وہ اس ضمن میں معلومات حاصل کرنے کے لیے قانون اور مذہب کے ماخذ کا بالتفصیل مطالعہ کریں۔

حج

اسلام کا آخری ستون اور اعلیٰ ترین اداروں میں سے ایک حج یا زیارتِ مکہ ہے۔ ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے جس کی ذہنی، اقتصادی اور جسمانی حالت مستحکم ہو، زندگی میں کم از کم ایک بار حج کی ادائیگی فرض ہے۔ ہر مسلمان جو پختگی کی عمر کو پہنچ چکا ہے، جس کی صحت اچھی ہے اور جسے اقتصادی تحفظ حاصل ہے اُسے چاہیے کہ وہ اپنی زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور حج کرے۔ اقتصادی تحفظ سے مراد ہے کہ اُس کے پاس اتنا کچھ ہو کہ حج مکمل ہونے تک وہ اپنے اور زیرِ کفالت افراد کے اخراجات پورے کر سکے اور مقروض ہونے کی صورت میں اپنے قرضہ جات نے بے باق کر سکے۔

حج کا عمل اسلام کی ایک اور منفرد خصوصیت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم متعدد مقاصد کی تکمیل کے لیے دیا ہے۔ یہ مقاصد حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ حج ایمان کا سب سے بڑا سالانہ اجتماع ہے جس میں مسلمان ایک دوسرے سے متعارف ہونے، اپنے مشترکہ امور کا جائزہ لینے اور اپنی عمومی فلاح کے فروغ کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ یہ انسانی تاریخ میں امن و سلامتی کی عظیم ترین باقاعدہ سالانہ کانفرنس بھی ہے۔ حج کے دوران "امن و سلامتی" کے موضوع کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ امن و سلامتی سے مراد خالقِ کائنات کے ساتھ اور اپنی روح کے ساتھ امن، ایک دوسرے کے ساتھ اور جانوروں کے ساتھ امن اور پرندوں کے ساتھ حتیٰ کہ حشرات الارض تک کے ساتھ امن و سلامتی کا قیام ہے۔ حج کے دوران کسی بھی شخص یا کسی بھی مخلوق کی امن و سلامتی میں کسی بھی طرح

کا خلل ڈالنے کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔

۲۔ حج کی رسم اسلام کی آفاقیت اور مسلمانوں کے مابین اخوت و مساوات کا ایک صحت مند مظاہرہ ہے۔ مسلمان خواہ وہ زندگی کے کسی بھی شعبہ، کسی بھی پیشہ، کسی بھی طبقہ اور دنیا کے کسی بھی کونے سے تعلق رکھتے ہوں اللہ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے مکہ میں جمع ہوتے ہیں، ایک ہی طرح کے قواعد و ضوابط کی پابندی کرتے ہیں، بیک وقت ایک ہی انداز میں بخشش و رحم کی دعائیں مانگتے ہیں اور ان سب مسلمانوں کے پیشِ نظر ایک ہی مقصد ہوتا ہے۔ ان میں سے کوئی مقتدر نہیں ہوتا بلکہ سب اللہ کے وفادار بندے ہوتے ہیں۔ کسی کا تعلق طبقۂ اشراف سے نہیں ہوتا بلکہ سب عجز و انکسار اور جاں نثاری کا پیکر ہوتے ہیں۔

۳۔ حج اللہ تعالیٰ کے ساتھ مسلمانوں کے عہد کی توثیق اور اللہ کی بندگی میں مادی فوائد سے دستبردار ہونے کے لیے ہمہ وقت تیار رہنے کا عزم ہے۔

۴۔ یہ حجاج کو رسول اللہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے روحانی اور تاریخی ماحول سے متعارف کرانے کا ایک ذریعہ ہے تاکہ اُن کی امنگوں اور ولولوں میں تحریک پیدا ہو اور اُن کے ایمان کو تقویت ملے۔

۵۔ یہ اُن مقدس رسومات کی یاد کا ذریعہ ہے جن کی پیروی حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ نے کی اور جن کے بارے میں یقین کیا جاتا ہے کہ وہ روئے زمین پر اوّلین خانۂ خدا یعنی کعبہ کے اوّلین زائر تھے۔

۶۔ حج روزِ قیامت کے اُس عظیم اجتماع کی یاد دلاتا ہے جب لوگ اللہ تعالےٰ کے رُو برُو اپنے حتمی انجام کے منتظر کھڑے ہوں گے اور جہاں نسلی برتری کا دعویٰ نہیں کیا جا سکے گا۔ حج اس حقیقت کا بھی یاد دہندہ ہے کہ پوری دنیا میں صرف مکہ ہی ایک ایسی جگہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے زمانۂ ابراہیم سے مرکزِ توحید ہونیکا شرف

بخشا اور جو آخر وقت تک اسلام (جو کہ خالص توحید کا مذہب ہے) کا مرکز بنا رہیگا۔

ادائیگیِ حج کے دوران بآسانی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ ایک ایسا عمل ہے جس سے روحانی امارت اور اخلاقی بالیدگی حاصل ہوتی ہے، درجۂ منتہا کی جان نثاری اور نظم و ضبط کا تجربہ حاصل ہوتا ہے اور انسانی مفادات اور ولولہ انگیز علم کا حصول ممکن ہوتا ہے یہ سب کچھ اسلام کے واحد ادارہ یعنی حج میں سمو دیا گیا ہے۔

ادائیگیِ حج کے اصول و ضوابط اور مرحلہ وار اقدامات کی تفصیل قدرے طویل ہے اسی لیے یہاں ان کو زیرِ بحث نہیں لایا جائے گا۔ قارئین مزید تفصیلات کے لیے اس موضوع پر لکھی جانے والی مفصل کتابوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ تاہم یہ بتا دینا ضروری ہے کہ حج کے پورے عمل کے دوران حجاج کی مدد اور اُن کی صحیح رہنمائی کے لیے معلمین حج ہمیشہ موقع پر موجود ہوتے ہیں۔

یہاں اس بات کا ذکر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس عبادت (حج) کا پورا عمل صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے ہے۔ مسلمان صرف اللہ کی تحمید و تہلیل کے لیے مکہ جاتے ہیں نہ کہ کسی پتھر کو بوسہ دینے یا کسی انسان یا اللہ کی مقرب ہستی کی پرستش کے لیے۔ خانۂ کعبہ میں حجرِ اسود کو بوسہ دینا یا چھونا ایک اختیاری فعل ہے۔ یہ کوئی فرض یا حکم نہیں ہے۔ جو لوگ حجرِ اسود کو بوسہ دیتے ہیں یا اسے چھوتے ہیں وہ ایسا اس لیے نہیں کرتے کہ وہ اس خاص پتھر پر اعتقاد رکھتے ہیں یا توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی کی بنا پر اس کے ساتھ کچھ خصوصیات منسوب کرتے ہیں۔ ان کا اعتقاد صرف خدائے واحد کی ذات پر ہے۔ وہ تو صرف رسول اللہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احترام یا محبت کی علامت کے طور پر اسے بوسہ دیتے ہیں یا چھوتے ہیں کیونکہ خانۂ کعبہ کی تعمیرِ نو کے وقت آپؐ نے یہ پتھر اپنے دستِ مبارک سے اس مقدس عمارت کی بنیاد میں رکھا تھا۔ اس واقعہ کی ایک خاص اہمیت ہے اور اس سے آنحضرتؐ کی ذاتِ گرامی ایک ایسی ہستی کے طور پر اُبھر کر سامنے

آتی ہے جس کا کام امن و سلامتی قائم کرنا تھا۔ طلوعِ اسلام سے چند سال قبل جب کعبہ زیرِ تعمیر تھا حجرِ اسود کو اس کی بنیاد میں نصب کیا جانا تھا۔ جس شخص کو اس پتھر کے نصب کرنے کا اعزاز ملنے والا تھا اس کی شخصیت متنازعہ تھی جس کی وجہ سے قبائلی سرداروں میں ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ یہ ایک نہایت سنجیدہ مسئلہ بن گیا اور اس مقدس مقام پر خانہ جنگی کے سائے منڈلانے لگے۔ اگرچہ حجرِ اسود کی حیثیت ایک پتھر کے ٹکڑے سے زیادہ نہ تھی لیکن قبائلی سردار اُسے خاص عزت و احترام کا درجہ دیتے تھے جسکی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس پتھر کو عربوں کے جدِ امجد اور اللہ کے عظیم الشان پیغمبر حضرتِ ابراہیمؑ سے نسبتِ خاص رہ چکی تھی اور یہ پتھر شاید یہ واحد ٹھوس پتھر تھا جو کعبہ کی مقدس عمارت کے قدیم ڈھانچے کے باقیات میں سے محفوظ رہ گیا تھا۔ لیکن کچھ بھی ہو جہاں تک اسلام اور مسلمانوں کا تعلق ہے اس پتھر کی اپنی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

جب قبائلی سردار آپس میں جھگڑے کا تصفیہ کرنے میں ناکام ہو گئے تو بالآخر سب اس بات پر متفق ہوئے کہ جو شخص سب سے پہلے اندر داخل ہو گا وہ اس تنازعہ کا فیصلہ کرے گا۔ سب سے پہلے جو شخص اندر داخل ہوا وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی تھی۔ آپؐ نے فیصلہ دیا کہ پتھر کو ایک کپڑے کے ٹکڑے پر رکھ دیا جائے اور شریکِ نزاع افراد مل کر اسے پکڑیں اور اسے اس طریقے سے معینہ جگہ پر رکھیں کہ اس کام میں ہر سردار برابر کا شریک ہو۔ لوگ آپ کے اس دانشمندانہ فیصلے سے بہت خوش ہوئے اور انہوں نے آپؐ کے بتائے ہوئے طریقے پر فوراً عمل کیا۔ یوں یہ جھگڑا ختم ہو گیا اور امن و سکون کی فضا بحال ہو گئی۔ یہ ہے حجرِ اسود کے قصے کا لبِ لباب۔ چنانچہ زائرینِ کعبہ جب حجرِ اسود کو بوسہ دیتے ہیں یا از روئے احترام اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو وہ دانشمند اور صلح جو پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یاد میں ایسا کرتے ہیں۔ اس نکتہ کی مزید وضاحت سطورِ ذیل میں دیئے گئے واقعات کے تقابل سے ہو سکتی ہے۔

کوئی اچھا محبِ وطن جب جلاوطنی سے لوٹتا ہے یا جنگجو سپاہی جب میدانِ جنگ

سے فتحیاب واپس آتا ہے تو اپنے محبوب وطن کے حدود میں داخل ہوتے ہی دفورِ جذبات میں اُس سے کچھ مخصوص حرکات سرزد ہو جاتی ہیں مثلاً سرحد پر قدم رکھتے ہی زمین کو بوسہ دیتا ہے یا سب سے پہلے ملنے والے ہموطنوں سے گرمجوشی کے ساتھ لغلگیر ہوتا ہے یا تزئینِ وطن کے مناظر کی توصیف و ستائش کرتا ہے۔ اُس کے اس فعل کو حسبِ معمول اور لائقِ تعریف سمجھا جاتا ہے اور کوئی شخص یہ خیال دل میں نہیں لاتا کہ لوٹنے والا محبِ وطن یا سپاہی اپنے دیس کی مٹی کو معبود ٹھہرا رہا ہے یا اپنے ہموطنوں کی پرستش کر رہا ہے یا اپنی سرزمین کے مناظر کو مقدّس اوصاف سے منسوب کر رہا ہے۔ زائرینِ مکّہ کے رویّے کا مطلب بھی یہی لینا چاہیے۔ مکّہ میں کعبہ کی عمارت اسلام کا روحانی مرکز اور ہر مسلمان کا روحانی وطن ہے۔ جب کوئی زائر مکّہ پہنچتا ہے تو اس کے احساسات بھی جلا وطنی سے واپس گھر آنے والے محبِ وطن یا کسی فیصلہ کن جنگ سے لوٹنے والے فتحیاب سپاہی کے سے ہوتے ہیں۔ یہ بات کوئی تصوّراتی تاویل نہیں ہے بلکہ تاریخی حقائق کے عین مطابق ہے۔ قدیم مسلمانوں کو اپنے گھروں سے نکال باہر کیا گیا تھا اور انہیں کئی برسوں تک جلا وطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ انہیں اللہ کے مقدس ترین گھر کعبہ میں عبادت کرنے سے روک دیا گیا تھا۔ جب وہ جلا وطنی کی زندگی گزار کر واپس آئے تو کعبہ ہی اُن کی اصل منزلِ مقصود تھی۔ وہ مسرّت و انبساط کے عالم میں اس مقدس زیارت گاہ میں داخل ہوئے تو انہوں نے اس میں رکھے ہوئے بُتوں اور باطل معبودوں کو پاش پاش کر دیا اور پھر حج کی رسومات مکمل کیں۔

اس تاویل کی وضاحت بعض اہم افراد کے غیر معمولی تجربات سے بھی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جب ایک بار ہنگری پر حملہ ہوا تو وہاں کا ایک مشہور ادیب فرار ہوتے وقت اپنے وطن کی مٹھی بھر خاک اپنے ساتھ لے گیا۔ تاریخِ ادب کے وقائع بتاتے ہیں کہ ادیب کو اُس مٹھی بھر خاک سے بڑی تسکین اور بدرجۂ اتم مسرّت حاصل ہوتی تھی۔ یہی خاک اس کی تخلیقی تحریک کا سرچشمہ اور اُس کی اس امید کی علامت تھی کہ وہ ایک نہ ایک

دن ضرور اپنے آزاد وطن پر دوبارہ قدم رکھے گا۔ ؎

اسی طرح ادارہ سی۔ بی۔ ایس نے ایک دستاویزی فلم "اہلِ فلسطین" تیار کی جسے ۱۵ر جون ۱۹۷۴ء کو ٹیلی ویژن پر نشر کیا گیا۔ اس فلم میں ایک دولت مند تاجر کا انٹرویو دکھایا گیا تھا جو صیہونی دہشت گردی کے باعث فلسطین چھوڑنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ یہ انٹرویو بیروت کے ایک نہایت پُرتکلف مکان میں لیا گیا تھا۔ جب اُس تاجر کو جلا وطنی میں اُس کی امارت یاد دلائی گئی تو اُس نے مُسکرا کر ایک چھوٹی سی بوتل کی طرف اشارہ کیا جو مٹی سے نصف بھری ہوئی تھی۔ اُس نے بتایا کہ یہ ہے وہ چیز جو وہ یروشلم سے بھاگتے وقت اپنے ساتھ لایا ہے اور یہ اُس کے لیے ہر اُس چیز سے زیادہ قیمتی ہے جو اُس کے پاس موجود ہے اور وہ اپنے وطن فلسطین واپس جانے کے لیے اپنی ہر چیز قربان کر دے گا۔ اس انٹرویو کے بارے میں اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اُس شخص کے خاندان کے افراد اُس سے بھی زیادہ جوشیلے تھے اور انہوں نے اُس سے بڑھ کر شدتِ جذبات میں اپنے احساسات بیان کیے۔ اگر اس سے یہ مراد لی جائے کہ یہ شخص اپنے جیسے بہت سے دوسرے لوگوں کی نمایندگی کرتا ہے اور اگر یہ مُشتِ خاک آیندہ برسوں میں ایک خاص اہمیت اختیار کرے حتیٰ کہ مقدس ٹھہرائی جانے لگے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہوگی۔

ایسوسی ایٹڈ پریس نے ۱۴ر اکتوبر ۱۹۷۳ء کو غیر مبہم انداز میں ایک خبر دی کہ "نہر سویز کے مشرقی کنارے پر آخری اسرائیلی مورچوں نے ہتھیار ڈال دیے ..... اور سینتیس[۳۷] تھکے ماندے اور کیچڑ میں لتھڑے ہوئے اسرائیلی فوجیوں کو گرفتاری سے قبل ڈونگیوں کے

؎ میں نے یہ واقعہ ۱۹۵۰ء کے عشرہ میں کہیں پڑھا تھا۔ مجھے ازحد افسوس ہے کہ میں اس کا صحیح ماخذ نہیں بتا سکتا اور نہ مجھے اُس ادیب کا نام ہی یاد ہے۔

ذریعے ایک آبی گزرگاہ سے گزرنا پڑا۔ بعض مصری سپاہیوں نے جب اس آخری مورچے (دی بارلیولائن) کو آزاد کرایا تو وہ جذبات میں اس قدر وارفتہ ہوئے کہ انہوں نے لپک کر مٹھی مٹھی بھر خاک اُچک لی اور اسے اپنے منہ میں ڈال لیا جبکہ دوسرے سپاہیوں نے زمین کو بوسہ دیا۔ (ڈیسپیچ آبزرور۔ پی۔ ۲۔ اے)

بعد ازاں اسی خبر رساں ایجنسی نے شامی جنگی قیدیوں کی واپسی سے متعلق خبر دیتے ہوئے کہا کہ جہاز سے اُترنے والا پہلا شخص سٹریچر پر اپنی کٹی ہوئی ٹانگوں کے ٹنڈ پر سیدھا بیٹھا تھا۔ اس نے چیخ کر کہا: "ٹانگیں تو کیا ہم اپنی جانیں تک قربان کرنے کو تیار ہیں۔ پھر اُس نے اصرار کیا کہ اُسے سٹریچر سے اُتار کر زمین پر لایا جائے تاکہ وہ جھک کر اپنے وطن کی مٹی کو بوسہ دے سکے۔ (ڈیسپیچ آبزرور ۲، جون ۱۹۷۴ء پی۔ ۲۔ اے)

حجرِ اسود کی داستان کا جائزہ بھی اسی انسانی پس منظر میں لیا جانا چاہیے۔ اس نوع کے انسانی تجربات جو غیر معمولی حالات کی پیداوار ہوں حجرِ اسود کی حقیقت کو بہتر انداز میں سمجھنے میں مدد دے سکتے ہیں۔

اختتام

مدینہ میں روضۂ رسولؐ کی زیارت حج کی صحت اور تکمیل کے لیے فرض نہیں ہے۔ اس کے بغیر بھی حج درست ہو سکتا ہے لیکن یہ بات قرینِ مصلحت اور مناسب معلوم ہوتی ہے اور اس کی پُرزور سفارش کی جاتی ہے کہ جس شخص کو جب بھی مدینہ جانے کا موقع ملے اُسے عالمِ انسانیت کے عظیم ترین ہادیؐ کو خراجِ تحریم پیش کرنے کے لیے روضۂ رسولؐ کی زیارت ضرور کرنی چاہیے۔

خیال رہے کہ حج کا نقطۂ عروج اللہ کے راستے میں ذبیحہ کی قربانی دینا ہے۔ قربانی کا مقصد اس عبادت (حج) کی تکمیل کرنا اور غربا میں کھانا تقسیم کرنا ہے تاکہ وہ یومِ عید کی اجتماعی مسرتوں کو محسوس کر سکیں۔ قربانی صرف حجاج کے لیے ہی فرض نہیں بلکہ یہ

فرض تمام صاحبِ ثروت مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے خواہ وہ دنیا کے کسی گوشے میں بستے ہوں۔

بعض مسلمانوں نے ایک نہایت سنجیدہ سوال اٹھایا ہے۔ وہ یہ کہ ایامِ حج کے دوران اتنی زیادہ تعداد میں جانوروں کی قربانی دی جاتی ہے کہ گوشت کا بے پناہ ضیاع ہوتا ہے۔ گرمی، برودت کی سہولتوں کی کمی، ناکافی سفری وسائل اور صرف چند دنوں میں گوشت کی ضرورت سے زیادہ رسد کی بنا پر زیادہ تر گوشت استعمال نہیں ہو پاتا یا ناقابلِ استعمال ہو جاتا ہے۔ یہ ایک نئی صورتِ حال ہے جو اپنے ساتھ نئے مسائل لے کر آئی ہے۔ ایک دیانت دار مسلمان جاننا چاہتا ہے کہ اسے اس صورتِ حال میں کیا کرنا چاہیے۔

ہم اس مسئلہ پر قابلِ احترام مذہبی علماء (خواہ وہ متقدمین میں سے ہوں یا معاصرین میں سے) کی فاضل آراء پر کوئی فقہی بحث چھیڑنا ضروری نہیں سمجھتے۔ لیکن ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اسلام میں ضیاع کی کوئی گنجائش نہیں خواہ یہ کسی بھی قسم کا یا کسی بھی سطح پر ہو۔ مزید براں جب ضرورتیں زیادہ ہوں اور وسائل کم تو اسلام سب سے پہلے بڑی ضرورت کا خیال رکھتا ہے۔ اسی طرح جب برائیوں سے کُلّی طور پر مفر ممکن نہ ہو تو کم سے کم تر درجے کی برائی اختیار کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اسلام میں اوّلیتوں کا ایک باقاعدہ نظام ہے جس کے تحت سب سے بڑی ضرورت سے چھوٹی ضرورت کی طرف اور چھوٹی ناپسندیدگی سے بڑی ناپسندیدگی کی طرف پیش قدمی کی جاتی ہے۔ یہ طریقۂ کار با تدبیر بھی ہے اور مطابقت پذیر بھی۔ ان اصولوں کو بنیاد بنا کر زیرِ بحث مسئلے کا حل بآسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ یہ حل درحقیقت روحِ اسلام سے ہی ماخوذ ہوگا خواہ اس میں بظاہر احکامِ اسلام کی لفظی تاویلات سے قدرے انحراف ہی پایا جاتا ہو۔ اس حل پر عمل درآمد مرحلہ وار اور مختلف سطحوں پر ہوگا۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ گوشت منجمد کرنے کی کافی سہولتیں مہیا کرنے کے

لیے مسلمانوں کو ہر ممکن عملی اقدام کرنا چاہیے تاکہ فاضل گوشت محفوظ کیا جا سکے اور مقدس مقامات کے نواح میں رہنے والے غریب لوگ اسے سارا سال استعمال کر سکیں۔ دوسرے یہ کہ فاضل گوشت حاجت مند مسلمانوں تک خواہ وہ کہیں بھی رہتے ہوں پہنچانے کی کوششیں کی جانی چاہیں۔ قربانی کے جانوروں کو مکہ میں ذبح کر کے گوشت کو ڈبوں میں بند اور منجمد کیا جا سکتا ہے اور پھر اسے دنیا کے کسی بھی حصے میں جہاں حاجت مند مسلمان رہتے ہوں پہنچایا جا سکتا ہے۔ تیسرے یہ کہ فاضل گوشت فروخت کیا جا سکتا ہے اور یوں حاصل ہونے والی رقم مقامی، علاقائی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر خیراتی مقاصد کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے۔ یہ ہیں چند ایک قابلِ عمل اقدامات جو مسلمانوں کو مشترکہ طور پر کرنے چاہیں۔ سرِدست اور جب تک اس طرح کے اقدامات عمل میں نہیں آتے ہر وہ مسلمان جو محسوس کرے کہ فاضل گوشت کے ضائع ہونے کا امکان موجود ہے وہ قربانی پیش کرنے میں تاخیر یا تقدیم کر سکتا ہے۔ ضیاع کے امکانات کو روکنے کے لیے وہ مناسب وقت اور جگہ کا انتخاب کر سکتا ہے یا پھر ایامِ حج کے دوران مکہ میں وہ جس جانور کی قربانی دینے کا ارادہ رکھتا ہے اُس کی قیمت کے مساوی رقم کسی جائز مقصد کے لیے خیرات کے طور پر دے سکتا ہے۔[۹]

---

۹ امامِ اعظم محمود شلتوت نے اپنی تالیف "الفتاویٰ" (قاہرہ یونیورسٹی پریس ۱۹۵۹ء) میں (صفحات ۱۵۲ تا ۱۶۰) اس موضوع پر نہایت عالمانہ بحث کی ہے۔ ہمیں ان کا احترام ملحوظِ خاطر ہے لیکن ہم ان کے بیان کے بعض نکات سے اتفاق نہیں کرتے۔ ہم یہ دعوٰے بھی نہیں کرتے کہ صرف ہمارا نقطہ نظر ہی صحیح اسلامی حیثیت کا حامل ہے کیونکہ اس قسم کا رویّہ گستاخانہ اور غیر ذمہ دارانہ ہوگا۔ لیکن ہم کہہ سکتے کہ حج کا ادارہ جس حد تک انسان کی سماجی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے؛ وہاں تک اس کا تعلق شریعت (اسلامی قانون) کی اُس

(باقی اگلے صفحہ پر)

حج کے ضمن میں آخری نکتہ جو ہم آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں اس کا تعلق قربانی کے مسئلے سے بھی ہے اور اس بات سے بھی کہ یہ (قربانی) درحقیقت کس چیز کی علامت ہے۔ جیسا کہ عیدین کے بارے میں بحث کے دوران کہا گیا ہے کہ یہ گوشت اور خون نہیں جس سے اللہ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے بلکہ یہ دراصل اللہ کے سامنے اظہارِ تشکر اور اُس کی ذات پر پختہ ایمان کی شہادت ہے اور اُس تاریخی واقعہ کا اعادہ ہے جب حضرت ابراہیمؑ کو اللہ کی راہ میں اپنے بیٹے کو قربان کرنے کا حکم دیا گیا۔ حکم کے ملتے ہی باپ اور بیٹا بلا چون وچرا اس کی تعمیل کے لیے تیار ہو گئے لیکن بیٹے کی زندگی بچالی گئی اور اس کی بجائے ایک مینڈھے کی قربانی دی گئی۔ قربانی کا پیش کرنا اس واقعہ کو یاد کرنے اور اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے لیے ایک سالانہ مذہبی رسم بن گئی ہے۔ یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے بیٹوں میں سے کس بیٹے کو قربانی کے لیے پیش کیا گیا۔ اس بارے میں دو روایات پائی جاتی ہیں۔ ایک روایت کے مطابق یہ حضرت اسمٰعیلؑ تھے جبکہ دوسری روایت کے مطابق یہ حضرت اسحٰقؑ تھے۔

(بقیہ صفحہ ۱۹۶ سے آگے)

شاخ سے ہے جسے معاملات (انسانی لین دین) کا نام دیا جاتا ہے۔ اسلامی قانون کی یہ شاخ شریعت کی ایک دوسری شاخ عبادت (جس میں نماز و رسومات وغیرہ شامل ہیں) کی تکمیل کرتی ہے۔ ایک عام عقیدے کے مطابق حج کا تعلق شریعت کی موخرالذکر شاخ یعنی عبادات و رسومات سے ہے۔ تاہم ان دو شاخوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور کہہ سکتے ہیں کہ حج بایں ہمہ معنوں میں معاملات کا حصہ ہے۔ حج کے اس سماجی پہلو کو تسلیم کرتے ہوئے اور خوراک، دولت اور انسانی محنت کے ضیاع کے عملی مسئلے کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں قربانی کے قوانین کی ازسرِنو ایسی تاویل کرنی چاہیے جو روحِ اسلام سے ہم آہنگ ہو جس سے ہوشمندی، تعقل اور حقیقت پسندی کی سطح مناسب حد تک قائم رہ سکے۔ لہٰذا ہم یہ تاویل اس دعا کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ اللہ اسے قبول کرے اور اس سے اُمتِ مسلمہ کو فائدہ پہنچے۔

مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق یہ حضرت اسمٰعیلؑ تھے نہ کہ حضرت اسحٰقؑ جنہیں اللہ کے حکم کے مطابق قربان کیا جانا تھا۔ لیکن جب حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کے والد اس حکم کی تعمیل کے لیے بالکل تیار ہو گئے تو انہیں بچا لیا گیا۔ اس عقیدے کی تائید میں کم از کم بیس دلائل پیش کیے جا سکتے ہیں۔ تاہم ان میں سے کسی ایک بھی دلیل کا یہ مطلب نہیں نکلتا کہ بنی اسرائیل کے تاریخی کردار کی اہمیت کو کم کیا جائے یا ان کی ذہانت اور دانائی جو انہیں حضرت موسیٰؑ کی وساطت سے اُن تک پہنچی سے انکار کیا جائے۔ اس کے برعکس قرآن کی متعدد آیات میں اس سے متعلق وضاحت موجود ہے۔

(دیکھیے سورہ ۲ : آیات ۴۰ و ۴۷، سورہ ۷ : آیت ۱۳۷، سورہ ۱۷ : آیت ۲، سورہ ۴۰ : آیت ۵۳، سورہ ۴۵ : آیت ۱۶)

ان دلائل میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں۔

۱۔ واقعہ کی تمام تفصیل جو قرآن میں بیان کی گئی ہے (سورہ ۳۷ : آیات ۱۰۱ تا ۱۱۳) اُس سے اس ضمن میں کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ یہ حضرت اسمٰعیلؑ ہی تھے جنہیں اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں اُن کے والد کے ہاتھوں قربان کیا جانا تھا۔

۲۔ دستیاب عہد نامہ عتیق (Gen. 21 : 5) کے مطابق جب حضرت اسحاقؑ تولد ہوئے تو اُن کے والد حضرت ابراہیمؑ کی عمر سو (۱۰۰) سال تھی جبکہ حضرت اسمٰعیلؑ کی پیدائش کے وقت اُن کی عمر چھیاسی (۸۶) سال تھی (Gen. 21 : 16)۔ اس کا مطلب ہوا کہ حضرت اسمٰعیلؑ ۱۴ برس تک اپنے والد کے اکلوتے بیٹے رہے جبکہ حضرت اسحٰق کسی بھی زمانے میں اکلوتے نہیں رہے۔ اس کے باوجود عہد نامہ عتیق (Gen. 22 : 2) میں ذکر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا گیا۔ ”اب اپنا بیٹا ـــــ اپنا اکلوتا بیٹا اسحٰقؑ لے جاؤ اور سرزمین موریہ میں داخل ہو جاؤ اور اُسے وہاں جلانے کے لیے پیش کر دو۔“ اس سیاق و سباق سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں حضرت اسحٰقؑ کا نام خواہ مخواہ شامل

کر دیا گیا ہے۔ اور پھر یہ بھی واضح نہیں کہ سرزمینِ موریہ کہاں واقع تھی۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ موریہ سے مراد مکہ میں واقع مروا کی پہاڑی ہے تو پھر اس سے اسلامی نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے۔

۳۔ یہ سارا واقعہ مکہ کے نواح میں ظہور پذیر ہوا اور ہم جانتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کے ہمراہ حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی والدہ مکہ گئیں۔ یہ لوگ وہاں آباد ہو گئے۔ حضرت ابراہیمؑ نے خانہ کعبہ کا حرم تعمیر کیا اور اس کام میں حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی والدہ نے مدد کی۔

(سورہ ۲ : آیات ۱۲۴ تا ۱۳۰، سورہ ۱۴ : آیات ۳۵ تا ۴۰)

۴۔ زیرِ بحث موضوع سے متعلق اسلامی عقیدے کے حق میں شاید سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ یہودی وعیسائی نقطۂ نظر سے کچھ ایسے نتائج اخذ ہوتے ہیں جو انتہائی قابلِ اعتراض ہیں مثلاً

(ا) دو بھائیوں کے درمیان محض اس بنیاد پر امتیازی سلوک روا رکھنا کہ ان میں سے ایک کی والدہ لونڈی اور دوسرے کی ایک آزاد عورت تھی۔

(ب) لوگوں کے درمیان نسل، عقیدے اور رنگ کی بنیاد پر امتیاز کرنا۔

(ج) آباؤ اجداد کے نام پر ایک کی روحانی برتری کا دعویٰ کرنا اور

(د) لونڈی کے بطن سے پیدا ہونیوالے بچے کو قانونی استحقاق سے محروم کرنا۔

اس قسم کے نتائج اسلام کی روح کے منافی ہیں۔ مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ کوئی بھی بات جس سے اس طرح کے نتائج اخذ ہوتے ہوں مسترد کر دے۔ کسی کے اجداد کی حیثیت، والدہ کا اعلیٰ یا اَدنیٰ ہونا، معاشرتی مقام، رنگ و نسل وغیرہ کا انسان کی روحانی اور انسانی خصوصیات پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کم از کم خدا کی نظر میں تو ایسا ہرگز نہیں ہے۔[۱۰]

---

[۱۰] ان آراء کے علاوہ دیکھیے "قرآن، متن، ترجمہ اور شرح" از اے۔ یوسف علی (طبع ۱۹۴۶) کے صفحات ۱۲۰۴ تا ۱۲۰۶، ابن قیم الجوزیہ، زاد المعاد (بیروت ایڈیشن) جلد اول صفحات ۱۵ تا ۱۷۔

باب چہارم

اسلام کا اطلاق روزمرّہ زندگی پر

مسلمان بجا طور پر یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اسلام کسی موہوم تصور کا نام نہیں جسے محض عبادت کے لیے برائے نام قائم کیا گیا ہو اور نہ یہ کوئی جامد و ساکت بُت ہے جس کے پاس لوگ وقتاً فوقتاً پرستش کے لیے آتے ہوں۔ اسلام ایک ضابطۂ حیات ہے۔ یہ ایک ایسی زندہ قوت ہے جس کا اظہار انسانی زندگی کے ہر پہلو میں ہوتا ہے۔ مسلمانوں کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ فرد کو مرکزی اہمیت حاصل ہے اور وہ ایک ایسی متحرک قوت ہے جو اسلام کو یا اسلام کے کسی بھی نظام کو بہ تمام و کمال عمل میں لا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کا نقطۂ آغاز ہمیشہ فرد ہوتا ہے اور یہ ہر حال میں معیار کو مقدار پر ترجیح دیتا ہے۔

آئیے! ہم بحث کا آغاز فرد سے کریں جہاں سے اسلام کرتا ہے۔ کیوں نہ ہم پہلے فرد کی فطرت کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ اسلام اس فطرت کو کس زاویے سے دیکھتا ہے۔ بات کو زیادہ سے زیادہ واضح کرنے کے لیے فلسفیانہ مباحث یا تصوراتی اختلافات میں اُلجھے بغیر ہم انسان کی تعریف ایک ایسی مخلوق کے طور پر کر سکتے ہیں جس کی دو تکمیلی فطرتیں ہیں۔ ان دونوں فطرتوں کا ایک دوسرے کے ساتھ گہرا تعلق ہے اور یہ مسلسل ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک انسان کی باطنی فطرت ہے اور دوسری ظاہری فطرت۔ بالفاظِ دیگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی صرف ایک ہی فطرت ہے جس کے دو حصے ہیں جو باہمدگر متصل ہیں اور جنہیں ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس فطرت کا

یک حصہ باطنی ہے اور دوسرا ظاہری۔ انسان کی باطنی فطرت کا تعلق روح (ذات یا قلب) اور عقل (ذہن، قوت استدلال یا ذہانت) سے ہے۔

انسان کی باطنی فطرت کی وضاحت کرتے ہوئے ہمیں اس کے دو پہلوؤں کا خیال رکھنا ہوگا۔

۱۔ روحانی یا اخلاقی پہلو

۲۔ عقلی پہلو۔

انسان کی باقی تمام سرگرمیاں اور افعال اُس کی ظاہری یا خارجی فطرت کے زمرے میں آئیں گے۔ آخر یہ ایک مسلّمہ اخلاقی حقیقت ہے کہ انسان صرف روٹی پر زندہ نہیں رہ سکتا۔

فطرتِ باطنی

رُوحانی زندگی

اسلام انسان کی روحانی یا اخلاقی زندگی اس انداز سے منظم کرتا ہے کہ اُسے وہ تمام روحانی غذا مل سکے جو تقویٰ، نیکی، تحفظ اور امن کے پنپنے کے لیے ضروری ہے۔ انسان کی روحانی زندگی کے لیے اسلام جو ہدایات دیتا ہے اگر اُن کی کما حقّہٗ پیروی کی جائے تو جہاں تک روحانی بالیدگی اور پختگی کا تعلق ہے زیادہ سے زیادہ مثبت نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ روح کی نشوونما کے لیے اسلامی ہدایت کے چیدہ چیدہ نکات یہ ہیں۔

۱۔ نماز (صلوٰۃ)

۲۔ زکوٰۃ (خیرات)

۳۔ روزہ (صوم)

۴۔ حج (زیارتِ کعبہ)

۵۔ اللہ اور اُس کے رسولؐ سے محبت۔ اللہ کے لیے سچائی اور انسانیت سے محبت۔

۶۔ ہر حال میں خدا سے امید رکھنا اور اُسی پر بھروسہ کرنا۔

۷۔ ہر قسم کی خود غرضی سے ماوراء ہو کر صرف اللہ کی خاطر قربانی پیش کرنے کا جذبہ۔

ان نکات کے بہت سے پہلو قدرے تفصیل کے ساتھ پہلے ہی زیرِ بحث آ چکے ہیں۔ یہاں ہم صرف اتنا بتائیں گے کہ جہاں تک ایمان کا تعلق ہے ان بنیادی عناصر کے بغیر ایمان درست اور مکمل نہیں ہو سکتا۔ قارئین سے التماس ہے کہ ان بنیادی نکات کو ذہن نشین کرنے کے لیے اس کتاب کے گذشتہ حصوں کا مطالعہ کریں۔

عقلی زندگی

انسان کی عقلی فطرت جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، شعور، فہم و فراست یا قوتِ استدلال سے ترتیب پاتی ہے۔ اسلام انسانی ذات کے اس پہلو پر غیر معمولی توجہ دیتا ہے اور انسان کے عقلی ڈھانچے کی تعمیر نہایت مضبوط اور ٹھوس بنیادوں پر کرتا ہے۔ ان بنیادوں کی گروہ بندی ہم اس طرح کر سکتے ہیں۔

۱۔ سچا اور حقیقی علم جو واضح ثبوت اور غیر متنازعہ شہادتوں پر مبنی ہوتا ہے عمل سے یا تجربے سے یا ان دونوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات ہر قسم کے شکوک و شبہات سے بالاتر ہو کر اور بڑے یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ قرآن پہلی مسلم الثبوت کتاب ہے جو عمل، تجربے، غور و فکر اور مشاہدے کے ذریعے علم حاصل کرنے کی پُر زور سفارش کرتی ہے۔ دراصل ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ وہ لفظ کے وسیع تر معنوں میں علم حاصل کرے اور حقیقت کا سراغ لگائے فطرت اور یہ پوری کائنات ہمارے سامنے علوم و حقائق کے بیش بہا خزانے کھولے

ہوئے ہے اور قرآن پہلی کتاب ہے جس نے علم و حکمت کے ان سرچشموں کی نشان دہی کی ہے۔ قرآن ان موروثی "سچائیوں" یا مبینہ حقائق کو جن کی بنیاد کسی ثبوت یا شہادت پر نہ ہو تسلیم نہیں کرتا۔ جہاں تک ہمارا علم ہے قرآن وہ پہلا آسمانی صحیفہ ہے جس نے "کیوں" کہہ کر عقل و ذہانت کے استعمال کی دعوت دی اور کسی یقین یا حُجّت کی تائید میں ثبوت طلب کیا۔

(قرآن کا سورہ ۲ : آیت ۱۱۱ ، سورہ ۲۱ : آیت ۲۴)

قرآن خود عقل کی بنیاد پر ایک واضح چیلنج ہے۔ یہ انسانی عقل کو چیلنج کرتا ہے کہ وہ قرآن کی سچائی کے خلاف کوئی دلیل لائے یا قرآن سے ملتی جُلتی کوئی تحریر پیش کرے۔ قرآن کا کوئی بھی باب کھول لیجیے آپ کو فطرت کے لامحدود سرچشموں سے تحصیل علم کرنے کی پُرجوش تاکید ملے گی۔ اسلام حقیقی علم کی تلاش کو اجر کے تمام تر مفہوم میں اللہ کی عبادت کا درجہ دیتا ہے۔

۲۔ اس نکتے کا دوسرا حصہ اللہ پر ایمان ہے جس کی ذات علم کا سرمدی سرچشمہ اور فکر کے لاتعداد میدانوں میں روحانی بصیرت کا ذریعہ ہے۔ اسلام میں اللہ پر ایمان پوری مذہبی عمارت کا سنگِ بنیاد ہے۔ لیکن اسلام ایمان باللہ کو مؤثر و موثق بنانے کے لیے اسے یقینِ کامل اور اطمینانِ کُلّی کی بنیاد پر مستحکم کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ یقینِ کامل اور اطمینانِ کُلّی کا حصول عقل کو بروئے کار لائے بغیر ممکن نہیں۔ کوئی جامد یا بے حس ذہن یا کوئی محدود تصور کائنات کی سب سے بڑی صداقت یعنی اللہ کی رفعت تک نہیں پہنچ سکتا اور نہ یہ ایمان کی حقیقی گہرائی کو پا سکتا ہے۔

اسلام اس ایمان کو تسلیم نہیں کرتا جس کی بنیاد کورانہ تقلید پر ہو یا جب اسے اندھا دھند بغیر سوچے سمجھے قبول کر لیا گیا ہو۔ انسان کی عقلی زندگی میں اس بات کی بڑی اہمیت ہے۔ اسلام ایمان باللہ کا تقاضا کرتا ہے اور قرآن اپنی متعدد

آیات میں ایمان باللہ کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن ان آیات کی اہمیت یہ نہیں کہ ہم ان کو مطالعہ کے کمرہ میں سجا دیں یا اپنے ذہن میں محفوظ کر لیں۔ ان کی اصل اہمیت یہ ہے کہ یہ عقل و فہم کو بیدار کرنے، غور و خوض کرنے اور یکسوئی سے سوچنے کی دعوت دیتی ہے۔ یہ درست ہے کہ قرآن اللہ کے بارے میں بنیادی سچائی اور بعض حقائق کی نقاب کشائی کرتا ہے لیکن بعینہٖ یہ بھی درست ہے کہ قرآن ہرگز نہیں چاہتا کہ انسان اللہ کی سلطنت کا اتنا سست وارث بنے کہ وہ حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اپنی سی کوئی کوشش ہی نہ کرے۔ قرآن چاہتا ہے کہ انسان سنجیدہ کوشش اور دیانت دارانہ اکتساب سے علم و حکمت کے خزانے میں اضافہ کرے تاکہ وہ عقل و فہم کے اعتبار سے محفوظ ہو جائے۔ ضرب المثل ہے کہ "آسانی سے آیا ہوا مال آسانی سے جاتا ہے۔" اسلام آسانی سے قبول کیے ہوئے ایمان کو مسترد کرتا ہے کیونکہ یہ جائے گا بھی اتنی ہی آسانی سے۔ اسلام چاہتا ہے کہ اللہ پر ایمان مؤثر اور مستقل ہو جو قلب انسانی کے ہر گوشے کو منور کر دے اور اس کی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہو۔ آسانی سے لائے ہوئے ایمان میں اغلباً یہ استعداد نہیں ہوتی اور اس سے کم اسلام کے لیے قابلِ قبول نہیں ہے۔

جب اسلام تقاضا کرتا ہے کہ ایمان باللہ کی بنیاد علم و تحقیق پر ہو تو گویا یہ انسانی ذہن کے آگے علم و حکمت کے وسیع میدان کھول دیتا ہے تاکہ اُس کی عقل و فہم زیادہ سے زیادہ حد تک رسائی حاصل کر سکے۔ اسلام ایک آزاد مفکر پر جو کہ وسعتِ فکر و نظر کے لیے تحصیل علم میں مگن ہے کوئی پابندی عائد نہیں کرتا۔ یہ اُسے تحریک دیتا ہے کہ وہ حصولِ علم کے تمام ذرائع تک رسائی حاصل کرے خواہ یہ ذرائع فکری نوعیت کے ہوں یا تجرباتی نوعیت کے۔ اس انداز میں عقل و فہم کے استعمال کی دعوت دے کر اسلام انسان کی ذہنی صلاحیتوں کا احترام اور اُن پر اعتماد کرتا ہے اور اُس کے ذہن کو ظواہر کی زنجیروں اور حد بندیوں سے آزاد

کرنا چاہتا ہے۔ یہ فرد کو فکر و نظر کی بلندی، خود اعتمادی کی قوت اور الوہی اختیارات سے لیس کرنا چاہتا ہے تاکہ اُس کے ذہن کا اُفق وسعت حاصل کر کے فکری میدانوں کا احاطہ کر سکے خواہ یہ فکری میدان مادی ہوں یا مابعد الطبیعاتی، سائنسی ہوں یا فلسفیانہ، وجدانی ہوں یا تجرباتی، نامیاتی ہوں یا غیر نامیاتی۔

آپ نے دیکھ لیا کہ ایمان باللہ کس طرح ذہن کی آبیاری کرتا ہے اور عقلی زندگی کو کامیاب اور تخلیقی بناتا ہے۔ جب انسان کی روحانی اور عقلی سرگرمیوں کو متذکرہ اسلامی تعلیمات کے مطابق منظم کیا جاتا ہے تو انسان کی باطنی فطرت کو تقویت و سالمیت حاصل ہوتی ہے اور جب انسان اندرونی یا باطنی طور پر محفوظ اور قوی ہو تو اُس کی ظاہری زندگی بھی ایسی ہی ہوگی۔

فطرتِ ظاہری

انسان کی ظاہری فطرت بھی اتنی ہی پیچیدہ، دقیق اور وسیع ہے جتنی کہ اُس کی باطنی فطرت۔ یہاں ہم اس بات کا پھر اعادہ کریں گے اور زور دے کر کہیں گے کہ انسان کی ظاہری فطرت کا انحصار بڑی حد تک اُس کی باطنی فطرت پر اور اسی طرح باطنی فطرت کا انحصار ظاہری فطرت پر ہے کیونکہ اُس کی مکمل فطرت ان دونوں پہلوؤں سے عبارت ہے۔ بغرضِ وضاحت ہمیں ایک بار پھر انسان کی ظاہری فطرت کو مختلف حصوں اور پھر ان حصوں کو مزید کئی حصوں میں تقسیم کرنا ہوگا لیکن یہ بات ہمیں اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ فطرتِ انسانی کے نظام میں کسی بھی قسم کا عدمِ توازن تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان کی فطرتِ ظاہری اور فطرتِ باطنی دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں اور اسلام زندگی کے باطنی اور ظاہری دونوں پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔

شخصی زندگی

اسلام انسان کی شخصی یا نجی زندگی سے اس طرح تعلق قائم کرتا ہے کہ اس کی پاکیزگی اور صفائی ستھرائی کو یقینی بناتا ہے، صحت بخش غذا مہیا کرتا ہے اور لباس، برتاؤ، زینت و زیبائش، کھیل کود اور اس نوع کی دیگر سرگرمیوں کے آداب سکھاتا ہے۔

۱۔ پاکیزگی اور صفائی

اسلامی حکم کے مطابق مسلمان کے لیے صلوٰۃ (نماز) ادا کرنے سے پہلے وضو کرنا لازم ہے۔ البتہ اگر اُس نے پہلے سے وضو کر رکھا ہے اور ابھی تک برقرار ہے تو وہ تازہ وضو کیے بغیر صلوٰۃ ادا کر سکتا ہے۔ یہ فرضِ وضو مرد یا عورت کی حالت کے مطابق جزوی بھی ہو سکتا ہے اور کُلّی بھی۔ اب اگر ہمیں یاد ہے کہ مسلمان پر روزانہ پانچ بار صلوٰۃ ان شرائط کے ساتھ فرض ہے کہ اس کی ادائیگی کے وقت اُس کے خیالات و جذبات پاکیزہ ہوں، جسم اور کپڑے پاک صاف ہوں، جگہ صاف ہو اور نیت صاف ہو تو ہم بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ واحد عمل (صلوٰۃ) کس قدر قوی الاثر اور مفید نتائج کا حامل ہے۔

(قرآن کا سورہ ۴ : آیت ۴۳ ، سورہ ۵ : آیت ۷)

۲۔ خوراک

دِل کی پاکیزگی، ذہن کی پختگی، روح کی بلندی اور جسم کی صفائی و صحت کے لیے ضروری ہے کہ خوراک پر خاص توجہ دی جائے جس پر ہم زندہ ہیں اور اسلام ایسا ہی کرتا ہے۔ بعض عام

سطح کے اور خود فریبی میں مبتلا لوگ سوچ سکتے ہیں کہ جو شخص باقاعدگی سے کھانا کھاتا ہے اُس کی عام حالت پر کھانے پینے کی اشیاء کا کوئی براہِ راست یا اہم اثر مرتب نہیں ہوتا لیکن اسلام کا یقیناً یہ نقطۂ نظر نہیں ہے۔ اسلام کے نزدیک یہ مسئلہ بہت سنجیدہ اور اہم ہے۔ اس ضمن میں اسلام کا ایک عام سا اصول یہ ہے :

وہ تمام اشیاء جو پاکیزہ ہیں اور انسان کے لیے مفید ہیں اُن کو خورک کے طور پر استعمال کرنا جائز ہے بشرطیکہ انہیں اعتدال میں یا مناسب مقدار میں استعمال کیا جائے۔ اور وہ تمام اشیا جو ناپاک یا خراب یا نقصان دہ ہیں ان کا استعمال عام حالات میں ناجائز ہے انتہائی مجبوری کی حالت میں استثنا کی ہمیشہ گنجائش اور لچک رکھی گئی ہے۔

(قرآن کا سورہ ۷ : آیت ۱۵۷، نیز باب دوم کے "تصورِ اخلاقیات" کے حصے کا مطالعہ فرمائیں)

اس عام اصول کے علاوہ کچھ اشیائے خورد و نوش ایسی ہیں جن کو اللہ تعالےٰ نے تخصیص کے ساتھ انسان کے لیے ممنوع قرار دیا ہے۔ ان میں مُردہ جانوروں یا پرندوں کا گوشت، خنزیر کا گوشت اور ہر اُس چیز کا گوشت شامل ہے جسے اللہ کے سوا کسی اور نام سے ذبح کیا گیا ہو۔

(قرآن کا سورہ ۲ : آیت ۱۷۳، سورہ ۵ : آیت ۴)

اسی طرح قرآن کی ایک آیت میں تمام نشہ آور اشیا اور جوا اور لاٹری کی قسم کی تمام کھیلوں کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اس حکم میں وہ تمام مشروبات شامل ہیں جن کو اسلام انسان کی روحانی و اخلاقی زندگی، جسمانی صحت اور بلندیِ کردار کے لیے نقصان دہ اور تباہ کن خیال کرتا ہے۔ (قرآن کا سورہ ۵ : آیات ۹۳ تا ۹۴)

ان اغذیہ اور مشروبات کی حُرمت کسی طرح بھی اللہ کی کوئی ستمگرانہ کارروائی یا اُس کا آمرانہ فیصلہ نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ایسی مداخلت ہے جو خود انسان کے

بہترین مفاد میں ہے۔ جب قرآن ان ممنوع چیزوں کو بُرا، ناپاک اور نقصان دہ کہتا ہے تو یہ انسان کی اخلاقیات، عقل ودانش، صحت، دولت، تقویٰ اور اس کے عام رویے پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہے۔ انسانی زندگی کے یہ تمام پہلو اسلام کی نظر میں بے بہا اثاثہ ہیں۔ اس الُوہی مداخلت کی بہت سی وجوہات ہیں جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے عقلی بھی ہیں اور ذہنی بھی، جسمانی بھی ہیں اور معاشی بھی۔ مقصد انسان کی رہنمائی کرنا ہے کہ وہ کس طرح اپنے خاندان میں، معاشرے میں اور بالآخر پوری انسانی برادری میں ایک مفید اور صحت مند اکائی بننے کے لیے راست طرزِ عمل اختیار کر کے اپنی شخصیت کی تعمیر کر سکتا ہے۔ طب اور عمرانیات کے ماہرین ان اسلامی قوانین کے فوائد کی توثیق بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔

اسلام انسان کی جسمانی نشوونما کے معیار کے سلسلے میں اتنا ہی راسخ اور غیر مصالحانہ طرزِ عمل اختیار کرتا ہے جتنا کہ اس کی روحانی صحت اور ذہنی نشوونما کے لیے کرتا ہے۔ اس نکتے کی وضاحت اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ بعض غذائی اشیاء بلحاظِ جنس ممنوع ہیں جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے اور بعض بلحاظ مقدار ممنوع ہیں۔ جن اشیاء کو مسلمانوں کے لیے جائز قرار دیا گیا ہے ان کو اعتدال میں استعمال کرنا چاہیے اور ان میں اسراف نہیں برتنا چاہیے۔

(قرآن کا سورہ ۷ : آیت ۳۱)

مسلمان جب تمام ممنوعہ اشیاء سے پرہیز کرتا ہے خواہ یہ اشیا بلحاظ جنس ممنوع ہوں یا بلحاظِ مقدار، تو اللہ تعالیٰ اُسے حلال اشیا سے لطف اندوز ہونے اور رحیم وکریم پروردگار کا شکر گزار ہونے کی دعوت دیتا ہے۔

قرآن کا سورہ ۲ : آیات ۱۶۸، ۱۷۲، سورہ ۵ : آیات ۹۰ تا ۹۱) [۱]

---

[۱] اس جزوی اعادے کا مقصد نکتے کی اہمیت واضح کرنا ہے۔ لہٰذا ہمیں لائق اعتذار سمجھیں۔
(بقیہ اگلے صفحہ پر)

۳۔ لباس اور زیب و زینت

اسلام مردوں کے لباس اور زیب و زینت کے معاملے میں شائستگی، شرافت، پاکدامنی اور مردانگی کے اصولوں کا بطورِ خاص خیال رکھتا ہے اور ہر اُس بات سے روکتا ہے جو ان معیاروں کے حصول اور انہیں برقرار رکھنے میں رکاوٹ بنتی ہو یا ان کی تعمیر و ترقی سے متصادم ہوتی ہو۔ ایسے لباس یا پہننے کے ایسے انداز کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے جس سے غرور، تکبر اور جھوٹی انا کو تحریک ملتی ہو۔ اسی طرح ایسے سامانِ زینت کی بھی ممانعت ہے جس سے مرد کے کردار پر حرف آتا ہو یا اُس کی مردانہ وجاہت کو نقصان پہنچتا ہو۔ مرد کو اپنی مردانہ فطرت سے جو اللہ نے اُس کے لیے منتخب کی ہے مخلص رہنا چاہیے اور اُن تمام چیزوں سے اجتناب کرنا چاہیے جن سے اُس کے کردار کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام مرد کو زیب و زینت کے لیے بعض قسم کے لباس مثلاً خالص ریشم اور بعض قیمتی دھاتوں مثلاً سونا وغیرہ کے استعمال کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ وہ اشیاء ہیں جو صرف فطرتِ نسوانی کے لیے موزوں ہیں۔ مرد کی وجاہت قیمتی جواہرات کی نمود و نمائش یا خالص ریشم کے بنے ہوئے لباس کی لہلہاہٹ میں نہیں بلکہ اس بات میں ہے کہ وہ

اس پوری بحث کے سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے اسی کتاب کے ذیلی موضوع "تصورِ اخلاقیات (باب دوم) کا مطالعہ کریں۔ اس کے علاوہ ابراہیم کاظم ایم۔ ڈی کی تصنیف "اسلام میں حرام غذاؤں کے طبی مضمرات" (MEDICAL ASPECTS OF FORBIDDEN FOODS IN ISLAM) "الاتحاد" (مسلم سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن آف یونائیٹڈ سٹیٹس اینڈ کینیڈا) ۱۳۹۱ھ/ ۱۹۷۱ء جلد ۸ نمبر ا صفحات ۴ تا ۶ بھی مطالعہ فرمائیں۔

بلند اخلاق، شگفتہ مزاج اور نیک اطوار ہو۔

جب اسلام عورت کو ایسی چیزوں کے استعمال کی اجازت دیتا ہے جو مردوں کے لیے ممنوع ہیں اور جو صرف فطرتِ نسوانی کے لیے موزوں ہیں تو اسلام عورت کو شترِ بے مہار نہیں ہونے دیتا یا اُسے آزادانہ گھومنے پھرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام اُسے ایسی چیزوں کے استعمال کی اجازت دیتا ہے جو اُس کی فطرت سے مطابقت رکھتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اُسے ہر اُس بات سے متنبہ کرتا ہے جس سے اُس کی فطرت میں نقص یا خلل واقع ہونے کا امکان ہو۔ عورت کو لباس پہننے، سنگھار کرنے، چلنے اور دیکھنے میں کیا انداز اختیار کرنا چاہیے؛ یہ بڑا نازک سوال ہے اور اسلام اس مسئلے پر خاص توجہ دیتا ہے۔ اس ضمن میں اسلام کا نقطۂ نظر خواتین کی عام بہبود پر مرکوز ہے۔ اسلام نے مردوں اور عورتوں دونوں کو بالخصوص عورتوں کو ایسا انداز اختیار کرنے کی ہدایت کی ہے جس سے وہ فضول باتوں، بُری افواہوں اور مشکوک خیالات کا موضوع نہ بن سکیں تاکہ اُن کی خصوصاً عورتوں کی عزت اور پاکدامنی برقرار رہے اور اس میں اضافہ ہو۔ یہ ہدایت قرآن کی ان آیات میں موجود ہے۔

> اے نبیؐ! مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ اُن کے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے، جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اُس سے باخبر رہتا ہے۔ اور اے نبیؐ! مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے، اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔ وہ اپنا بناؤ سنگھار ظاہر نہ کریں مگر ان لوگوں کے سامنے۔ شوہر، باپ، شوہروں کے باپ، اپنے بیٹے، شوہروں کے بیٹے، بھائی، بھائیوں کے بیٹے، بہنوں کے بیٹے،

اپنے میل جول کی عورتیں، اپنے لونڈی غلام، وہ زیردست مرد جو کسی اور قسم
کی غرض نہ رکھتے ہوں، اور وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی واقف
نہ ہوئے ہوں۔ وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت
انہوں نے چھپا رکھی ہو اُس کا لوگوں کو علم ہو جائے۔ (سورہ ۲۴: آیات ۳۰ تا ۳۱)

اسلام لباس اور زیورات کے آداب میں بہت حسّاس ہے اور غیر مبہم انداز میں
کہتا ہے کہ مرد اور عورت دونوں کو اپنی فطری جبلتوں کی حفاظت کرنے، باحیا بننے اور اعلیٰ اخلاق و
کردار سے متصف ہونے کے لیے اپنی فطری حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ ایک
روایت کے مطابق رسول اللہ حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نسوانی
انداز اپنانے یا عورتوں جیسی حرکات کرنے والے مردوں اور مردانہ انداز اپنانے یا مردوں جیسی
حرکات کرنے والی عورتوں کی مذمت کرتا ہے۔ بایں ہمہ یہ بات
ذہن میں رہے کہ اسلام ملبوسات اور زیورات کی بے ضرر اور مناسب اقسام پر کوئی پابندی
نہیں لگاتا بلکہ قرآن ایسی اشیاء کو اللہ تعالیٰ کی نعمتیں گردانتا ہے اور اُن لوگوں کی ملامت
کرتا ہے جو ان کو اپنے اوپر حرام کر لیتے ہیں۔ (قرآن کا سورہ ۷: آیات ۳۲ تا ۳۳)

۴۔ کھیل اور تفریحات

یہ بات باعثِ طمانیت ہے کہ اسلامی عبادات مثلاً نماز، روزہ حج وغیرہ اگرچہ بنیادی
طور پر اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے روحانی مقاصد لیے ہوئے ہیں اس کے باوجود ان میں
کچھ خوش طبعانہ خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں۔ بھلا اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے
کہ انسان کی جسمانی اور روحانی ہر دو کیفیات ایک دوسرے پر مسلسل اثر انداز ہوتی رہتی ہیں تاہم
کچھ نہیں جو کھیلوں اور تفریحات کے موضوع پر اسلام کہنا چاہتا ہے۔ اسلام ہر

اُس چیز کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور دعوت دیتا ہے جو صحت مند فکر کو تحریک دیتی ہے، یا ذہن کو تروتازہ کرتی ہے اور انسان کو صحت مند حالت میں رکھنے کے لیے جسم کو توانائی عطا کرتی ہے۔ یہ حوصلہ افزائی اور دعوت اُس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک انسان کے کسی گناہ میں ملوث ہونے کا اندیشہ نہ ہو یا دوسرے فرائض کی تکمیل میں رکاوٹ یا تاخیر کا باعث نہ بنے۔ اس ضمن میں ایک عمومی اصول رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا وہ بیان ہے جس میں انہوں نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے والے تمام افراد میں اچھی خصوصیات پائی جاتی ہیں لیکن طاقت ور شخص کمزور شخص سے بہتر ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپؐ نے ان تمام کھیلوں اور تفریحات کو پسند فرمایا جن سے جسمانی صحت کی تعمیر ہوتی ہو اور ہمت و حوصلہ کو تقویت ملتی ہو۔

کھیلوں اور تفریحات سے ایسی سرگرمیوں کو وابستہ کرنا جن میں فی الواقعہ تفریحِ طبع کا سامان موجود نہ ہو ایک افسوسناک غلطی ہے۔ بعض لوگ قمار بازی اور شراب نوشی کو بھی کھیلوں اور تفریحات میں شمار کرتے ہیں لیکن اسلام کا نقطۂ نظر یہ نہیں ہے۔ زندگی کا تقاضا ہے کہ اسے زندہ رہ کر گزارا جائے۔ یہ ہمیں ایک خاص مقصد کے لیے عطا ہوئی ہے۔ کسی سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ لااُبالی پن میں اور مکمل طور پر قسمت اور اتفاقات پر توکل کر کے اس کا غلط استعمال کرے۔ لہٰذا اسلام زندگی کو منظم کرنے کے لیے جب انسان کے انتہائی ذاتی یا نجی پہلوؤں تک کے لیے ہدایت جاری کرتا ہے تو یہ کوئی بے جا مداخلت یا انسان کے شخصی حقوق کی خلاف ورزی ہرگز نہیں ہے۔

چونکہ زندگی انسان کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے اور یہ نیک مقاصد کی تکمیل کے لیے وجود میں آئی ہے اس لیے اسلام نے انسان کو صحیح اور پُرلطف انداز میں زندگی گزارنے کا طریقہ بتایا ہے۔ اس سلسلے میں جو اقدامات کیے گئے ہیں اُن میں ایک قمار بازی یا جوا کھیلنے کی ممانعت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قماربازی ذہنی تناؤ کو اتنا کم نہیں کرتی جتنا اس میں اضافہ کرتی ہے۔ یہ زندگی کا نہایت غلط استعمال ہے کہ اسے محض قسمت یا اتفاق کے داؤ پر لگا دیا جائے۔ اگر کوئی شخص اپنے مقدر کو کسی کھیل کے بے طرح گھومتے ہوئے پہیے کے حوالے کر دیتا ہے اور اپنی صلاحیتیں جُوئے کی میز پر ایسی چالوں پر صرف کرتا ہے جن کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی تو ایسا شخص زندگی کے معمول کے راستے سے انحراف کرتا ہے۔ انسان کو ان غیر ضروری ذہنی کشیدگیوں اور اُس کے اعصاب کو صدمے سے محفوظ رکھنے اور اُسے ذرائع اور مقاصد کے حصول میں فطری زندگی گزارنے کے قابل بنانے کے لیے اسلام نے جُوئے کی ممانعت کر دی ہے خواہ یہ کسی بھی شکل میں یا کسی بھی قسم کا ہو۔

اسی طرح خود کو نشے کی پُرپیچ بھول بھلیوں میں اُلجھا لینا یا الکوحل کے خبیث بھنور میں پھنس کر رہ جانا اصل میں حقیقت سے شرمناک فرار اور انسان کی بہترین صفت یعنی ذہانت کی غیر ذمہ دارانہ اہانت ہے۔ نشے کے خطرات اور المیے اس قدر واضح ہیں کہ ان کے ذکر کی ضرورت نہیں۔ اس کے باعث بہت سی جانیں ضائع ہو جاتی ہیں اور بہت سے خاندان اُجڑ جاتے ہیں۔ ہر سال اربوں ڈالر کی رقم شراب نوشی کی نذر ہو جاتی ہے۔ لاتعداد گھرانے اس کی لت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی زبوں حالی اور غم واندوہ سے تباہ حال ہو جاتے ہیں۔

صحت کی بربادی، ذہنی تناؤ، رُوح کی افسردگی، دولت کے ضیاع، خاندانوں کے انتشار، انسانی وقار کی بے حرمتی، اخلاقی اصولوں کی تباہی اور حقائق سے ذلت آمیز فرار کے علاوہ ہر مے نوش خواہ وہ مجلسی رکھ رکھاؤ کے تحت مے نوشی کرتا ہے الکحل کا بہت بُری طرح عادی بن جاتا ہے۔ اسلام ان خطرات کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتا نہ اسلام کسی انسان کو یہ اجازت دیتا ہے کہ وہ اس قدر المناک طریقے سے زندگی کے مفہوم کی بے حُرمتی کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام صحت مند کھیلوں اور تفنّنِ طبع کی

سرگرمیوں میں قمار بازی اور شراب نوشی کو شامل نہیں کرتا بلکہ ان پر مکمل اور مستقل پابندی عائد کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اسلام کا نقطۂ نظر سمجھنے کے لیے آپ صرف اتنا کریں کہ کسی بھی ذریعۂ ابلاغ سے خبریں سُن لیں، طبی رپورٹوں کا مطالعہ کر لیں، کسی سماجی بہبود کے ادارے میں چلے جائیں یا کوئی عدالتی کارروائی سُن لیں، آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ معاشرے کے تمام تکلیف دہ مسائل میں شراب نوشی کی لعنت سب سے زیادہ تشویشناک ہے۔ ہر سال پانچ لاکھ امریکی باشندے اس بُری عادت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ پہلی بار شراب نوشی کرنے والے ہر دس یا بارہ افراد میں سے ایک فرد ضرور عادی شراب نوش بن جاتا ہے۔ یہ تمام تکلیف دہ المیے اور حقیقی نقصانات کسی بھی مذہبی یا پیشہ ورانہ دلائل سے جو شراب نوشی کے خلاف دیے جاتے ہیں زیادہ شدید اور خوفناک ہے۔

خاندانی زندگیؒ

لفظ "خاندان"، کی بہت سی تعریفیں اور وضاحتیں موجود ہیں۔ ہم اپنے مقصد کے لیے اس کی آسان سی تعریف کیے دیتے ہیں۔ وہ یوں کہ خاندان انسانوں کا ایک سماجی گروہ ہے جس کے ارکان خون کے رشتوں اور/یا ازدواجی تعلق کے بندھن میں ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔

خاندانی بندھن کے نتیجے میں باہمی حقوق و فرائض کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ مذہب

ؒ یہ بحث مصنف کی ایک اور جامع تصنیف "اسلام میں خاندان کی تشکیل" (THE FAMILY STRUCTURE IN ISLAM) کا ایک اجمالی خاکہ ہے۔ یہ کتاب امریکن ٹرسٹ پبلی کیشنز کے زیرِ اہتمام عنقریب زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آئے گی۔

ان حقوق و فرائض کا حکم دیتا ہے، قانون ان کو نافذ کرتا ہے اور خاندان کے افراد ان پر عمل کرتے ہیں۔ چنانچہ ارکانِ خاندان کو باہمی طور پر اپنی اپنی ذمہ داریاں نبھانا ہوتی ہیں۔ ان ذمہ داریوں کا تعلق شناخت اور کفالت، وراثت اور مشورے، چھوٹوں سے شفقت اور بڑوں کے تحفظ اور خاندان کے تسلسل کو بخیر و خوبی قائم رکھنے سے ہے۔

اس سے عیاں ہوتا ہے کہ اسلام میں خونی رشتے اور ازدواجی ذمہ داریاں یا صرف ازدواجی ذمہ داریاں خاندان کی بنیادیں ہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق متبنیٰ بنانے، باہمی معاہدے، کلائینٹیج (Clintage) جنسی تعلق کے لیے نجی رضامندی اور "رواجی قانون" یا "آزمائشی شادیوں" سے خاندان تشکیل نہیں پاتا۔ اسلام خاندان کی تعمیر ٹھوس بنیادوں پر کرتا ہے تاکہ اسے معقول تسلسل حاصل ہو سکے، حقیقی تحفظ مل سکے اور ازدواجی تعلق میں پختگی آسکے۔ خاندان کی بنیادیں اس قدر مستحکم اور فطری ہونی چاہئیں کہ افرادِ خانہ کے باہمی تعلقات میں خلوص اور اخلاقی تسکین پروان چڑھے۔

اسلام کے نزدیک انسانوں کے مابین کوئی تعلق خون کے رشتے سے بڑھ کر فطری نہیں ہو سکتا اور جنسی ارتباط کی کوئی شکل اُس جنسی تعلق سے بڑھ کر صحت مند نہیں ہو سکتی جس میں اخلاقیات اور طمانیت دونوں بیک وقت موجود ہوں۔

اسلام شادی کی سماجی ضرورت اور اس کے اخلاقی فوائد کو تسلیم کرتا ہے اور ازدواجی تعلق کو مذہبی طور پر پاکیزہ قرار دیتا ہے۔ ایک مسلمان فرد کے لیے مثالی طرزِ عمل یہ ہے کہ اُس کا جھکاؤ خاندان کی طرف ہو اور وہ اپنا علیحدہ خاندان تشکیل دینے کی کوشش کرے۔ اسلامی نظام میں شادی اور خاندان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ قرآن مجید میں بہت سی آیات اور پیغمبرِ اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متعدد احادیث میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ مسلمان جب شادی کر لیتا ہے تو گویا اُس کا نصف دین مکمل ہو جاتا ہے۔ پس اُسے چاہیے کہ باقی نصف دین کی حفاظت کے لیے خدا ترسی اور تقویٰ اختیار کرے۔

علمائے اسلام نے شادی سے متعلق قرآنی آیات کی تاویل اس طرح کی ہے کہ شادی ایک مذہبی فریضہ، اخلاق و کردار کی سالمیت کے لیے حفاظتی اقدام اور ایک معاشرتی ذمہ داری ہے۔ چونکہ یہ ایک مذہبی فریضہ ہے اس لیے اس کی تکمیل ضروری ہے لیکن دوسرے اسلامی فرائض کی طرح شادی کے فریضے کی انجام دہی کا حکم بھی اُن لوگوں کے لیے ہے جو متعلقہ تمام ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

۱۔ شادی کا مفہوم

لوگ شادی کو کچھ بھی معنی پہنائیں، اسلام کے نزدیک یہ ایک مضبوط بندھن (میثاقِ غلیظ) اور اپنے تمام تر مفاہیم کے ساتھ ایک ٹھوس ذمہ داری ہے۔ اس ذمہ داری کا تعلق خود زندگی سے بھی ہے، معاشرے سے بھی اور نسلِ انسانی کی بقا سے بھی —— ایسی بقا جس کی بدولت مستقبل کی نسلِ انسانی باوقار اور بامعنی زندگی بسر کر سکے۔ یہ ایک عہد و پیمان ہے جو شادی کرنے والے فریقین ایک دوسرے کے ساتھ اور خدا کے ساتھ باندھتے ہیں۔

یہ ایک ایسا عہد ہے جس کی مشترکہ طور پہ پاسداری کر کے فریقین اپنی ذات کی تکمیل کرتے ہیں، اس کی بدولت انہیں خود آگاہی حاصل ہوتی ہے، محبت اور سلامتی کا احساس اُجاگر ہوتا ہے، وہ جذبۂ ترحم و طمانیت سے سرشار رہتے ہیں اور جمعیتِ خاطر اور امید کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ اسلام میں شادی کو سراسر ایک نیک اور پاکیزہ عمل تصور کیا جاتا ہے، ایک ایسا عمل جسے ذمہ دارانہ عبادت کا درجہ حاصل ہے۔ نفسانی خواہشات پر قدرت و اختیار کو اخلاقی فتح سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، افزائشِ نسل کو ایک معاشرتی ضرورت یا سماجی خدمت قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور اچھی صحت کو ذہنی آسودگی کا نام دیا جا سکتا ہے لیکن شادی کی ان اقدار اور مقاصد کو اگر اللہ کے تصور

سے جوڑ دیا جائے، ان کو مذہبی ذمہ داریاں تصور کر لیا جائے اور اللہ کی رحمت جان کر اپنے باطن میں سمو لیا جائے تو ان (اقدار و مقاصد) کو بالکل نئے معنی مل جاتے ہیں اور مزید استحکام حاصل ہو جاتا ہے۔ اسلام میں شادی کو بھی مرکزی مقام حاصل ہے۔ یہاں چند قرآنی آیات کا مفہوم بیان کیا جاتا ہے۔

لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اُسی جان سے اُس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیے۔ (سورہ ۴: آیت ۱)

اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اُس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم اُن کے پاس سکون حاصل کرو۔ اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

(سورہ ۳۰: آیت ۲۱)

متاہل زندگی کے انتہائی آزمائشی لمحات، قانونی تنازعات اور مقدمہ بازی کے دوران بھی قرآن فریقین کو اللہ کے قانون کی یاد دلاتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ، ایک دوسرے کے ساتھ فیاضانہ سلوک کرو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کے اطاعت شعار رہو۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ شادی سے متعلق اسلامی احکامات کا اطلاق مردوں اور عورتوں پر یکساں ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر اگر تجرد کی زندگی مردوں کے لیے ناپسندیدہ قرار دی گئی ہے تو یہ اتنی ہی ناپسندیدہ عورتوں کے لیے بھی ہے۔ یہ اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ عورت کی ضروریات بھی قانوناً اتنی ہی جائز ہیں جتنی کہ مرد کی اور ان کا سنجیدگی سے خیال رکھا جانا

ضروری ہے۔ درحقیقت اسلام شادی کو عورتوں کے لیے بھی اتنا ہی معمول اور فطرت کے مطابق خیال کرتا ہے جتنا کہ مردوں کے لیے۔ بلکہ عورت کے لیے شادی ایک لحاظ سے زیادہ اہم ہے کیونکہ یہ دوسری چیزوں کے علاوہ اُسے مالی تحفظ کی ضمانت بھی دیتی ہے۔ تاہم اس سے عورت کو جو خصوصی اضافی فائدہ حاصل ہوتا ہے اُس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ شادی خالصتاً ایک اقتصادی معاملہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقتصادی عنصر خواہ کتنا ہی قوی کیوں نہ ہو اسلام شادی کے اس پہلو کو سب سے کم مرکزی اہمیت دیتا ہے۔ ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ عورت کو عام طور پر اُس کی دولت، اُس کے حسن، اُس کی اعلیٰ نسبی یا اُس کی مذہبی خوبیوں کی وجہ سے زوجہ کے طور پر قبول کیا جاتا ہے لیکن مبارک اور خوش نصیب ہے وہ شخص جو اپنی زوجہ کے انتخاب میں اُس کے تقویٰ کو باقی سب چیزوں پر ترجیح دیتا ہے۔ قرآن ہر غیر شادی شدہ حتیٰ کہ صاحبِ تقویٰ افراد کو بھی شادی کا حکم دیتا ہے خواہ وہ مفلس اور غلام ہی ہوں (قرآن کا سورہ ۲۴ : آیت ۳۲)

دوسری طرف مرد اپنی ہونے والی بیوی کو جہیز میں جو کچھ دیتا ہے وہ چیز اُس (بیوی) کی ملکیت ہو جاتی ہے اور جو چیز بھی وہ شادی سے قبل یا اُس کے بعد وصول کرتی ہے وہ اس کی بلا شرکتِ غیرے مالک ہوتی ہے۔ اسلام کسی چیز پر شوہر اور بیوی دونوں کی مشترکہ ملکیت کو لازمی قرار نہیں دیتا۔ مزید برآں خاندان کے نان نفقہ اور معاشی تحفظ کی ذمہ داری شوہر پر عائد ہوتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ بیوی کو وہی معیارِ زندگی مہیا کرے جس کی وہ شادی سے قبل عادی تھی اور بعض علماء کے نزدیک تو وہ گھر کا روزمرہ کا کام کاج کرنے کی بھی قانوناً پابند نہیں اگرچہ وہ اپنی مرضی سے ہر قسم کا گھریلو کام کرسکتی ہے اور عام طور پر کسی نہ کسی وجہ سے مثلاً باہمی تعاون یا اقتصادی وجوہ کی بنا پر گھر کا کام خود ہی کرتی ہے۔

۲۔ شادی کی مداومت

اسلام چونکہ شادی کو ایک نہایت سنجیدہ ذمہ داری تصور کرتا ہے اس لیے ازدواجی رشتے کو انسانی حد تک زیادہ سے زیادہ مستحکم بنانے کے لیے بعض اقدامات کا حکم دیتا ہے۔ فریقین کے لیے لازمی ہے کہ وہ شادی کی چند بنیادی شرائط پوری کرتے ہوں مثلاً وہ مناسب عمر کو پہنچ چکے ہوں، دونوں میں عام (جسمانی و ذہنی) ہم آہنگی پائی جاتی ہو، معقول جہیز کا انتظام کر سکتے ہوں، ایک دوسرے کے لیے خیر خواہی کا جذبہ رکھتے ہوں، رضامندی میں کسی قسم کا جبر واکراہ شامل نہ ہو، ایک دوسرے کی بے غرضانہ محافظت کر سکتے ہوں، آبرومندانہ عزائم رکھتے ہوں اور معاملہ فہم اور دور اندیش ہوں وغیرہ۔ ازدواجی معاہدے میں داخل ہوتے وقت فریقین کی نیت واضح ہونی چاہیے کہ وہ ایک مستقل رشتے میں منسلک ہو رہے ہیں جس میں کسی قسم کی اتفاقی یا عارضی حیثیت کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں آزمائشی شادیاں، میعادی شادیاں اور شادی کی وہ تمام اقسام جن سے اُن کا تجرباتی، بے ضابطہ اور عارضی ہونا ظاہر ہوتا ہو ممنوع قرار دی گئی ہیں[۱]۔

---

[۱] جہاں تک نام نہاد متعہ شادی کا تعلق ہے ہم اس بارے میں بعض شیعہ مسلمانوں کے پیچیدہ اور الجھے ہوئے دلائل سے واقف ہیں۔ اس مسئلے کو جو عالمانہ رُخ دیا گیا ہے ہمیں اس کا پوری طرح احساس ہے لیکن ہم یہاں اس پر بحث کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ جو حضرات اس مسئلے میں دلچسپی رکھتے ہیں اُن کو ہمارا مشورہ ہے کہ راقم کی قریب الاشاعت کتاب "اسلام میں خاندان کی تشکیل" (THE FAMILY STRUCTURE IN ISLAM) کا مطالعہ فرمائیں جس میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا ارشاد ہے "لائقِ ملامت ہیں وہ مرد اور عورتیں جو اپنے ازدواجی فریق کی تبدیلی کا شوق رکھتے ہیں۔ یہ لوگ مزہ چشش ہیں۔ وہ کچھ عرصہ کے لیے ایک ساتھی سے حظ اٹھاتے ہیں پھر کوئی دوسرا ساتھی تلاش کر لیتے ہیں، پھر تیسرا اور اس طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

تاہم شادی کی صفتِ مداومت یعنی اس کے مستقل ہونے کی خصوصیت پر زور دینے کا یہ مطلب نہیں کہ نکاح کلی طور پر ناقابلِ تنسیخ معاہدہ ہے۔ قرآنِ حکیم نے مسلمانوں کو اُمّتِ وسطیٰ کہہ کر پکارا ہے اور اسلام حقیقی معنوں میں ایک شاندار میانہ روی کا مذہب ہے۔ یعنی یہ ہر لحاظ سے ایک متوازن اور مربوط نظام ہے۔ شادی کے معاملے میں بالخصوص اس کے متوازن ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ اسلام میں شادی نہ تو کلیتہً ایک مذہبی رسم ہے اور نہ یہ محض معاشرتی معاہدہ ہی ہے بلکہ اسے ایک منفرد مقام حاصل ہے جس میں مذہبی اور معاہداتی دونوں قسم کی خصوصی صفات شامل ہیں۔ یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ بے ضابطہ اور عارضی شادی اگر ایک انتہا ہے تو اسلام کے نزدیک اس کی متبادل صورت یعنی نکاح دوسری انتہا نہیں جو مکمل طور پر ناقابلِ تنسیخ ہو۔ اسلام کا راستہ منصفانہ اور حقیقت پسندانہ اعتدال کا راستہ ہے۔ یہ ہمیں سکھاتا ہے کہ شادی کو سنجیدہ اور مستقل رشتہ تسلیم کیا جائے لیکن اگر کسی وجہ سے یہ چل نہیں پا رہا تو اسے رحمدلی، عزت و تکریم، انصاف اور امن و سلامتی سے ختم کر دیا جائے۔

۳۔ شوہر اور بیوی کے تعلقات

اگر شادی کی غرض سے رفیقِ حیات کا انتخاب تقویٰ کی بنیاد پر کیا گیا ہے اور شادی کی تمام بنیادی شرائط واقعی پوری کی گئی ہیں تو بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ فریقین پُرمسرت اور مطمئن متاہل زندگی کا راستہ اختیار کر چکے ہیں۔ تاہم اسلام شوہر اور بیوی کے لیے ایک دوسرے

کے ساتھ برتاؤ کا طریق کار مقرر کرنے میں مزید پیش قدمی کرتا ہے۔ متعدد قرآنی آیات اور احادیث نبوی میں فریقین کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے رفیق حیات کے ساتھ مہربانی وانصاف سے، زندگی محبت سے، ہمدردی و مروت سے، صبر و برداشت سے اور خیر اندیشی کے جذبے سے پیش آئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہاں تک ارشاد فرمایا کہ بہترین مسلمان وہ ہے جو اپنے خاندان کے ساتھ بہترین سلوک کرتا ہے اور زندگی میں عظیم ترین اور مبارک ترین مسرت ایک اچھی اور نیک زوجہ ہے۔

شادی کی تکمیل متعلقہ فریقین کے لیے نئے کردار متعین کرتی ہے۔ ان میں سے یہ کردار منصفانہ اور متناسب حقوق و فرائض کا ایک مجموعہ ہے۔ شوہر کا کردار یہ اخلاقی اصول وضع کرتا ہے کہ اپنی بیوی کے ساتھ شفقت، عزت اور صبر و برداشت سے پیش آنا، اُسے عزت و وقار سے رکھنا یا باعزت طریقے سے اُس سے علیحدگی اختیار کرنا اور اُسے کوئی تکلیف یا رنج نہ پہنچانا ایک ایسا مقدس فرض ہے جو خدا کی طرف سے اُس پر عائد ہوتا ہے۔

(قرآن کا سورہ ۲: آیات ۲۲۹ تا ۲۳۲)

بیوی کا کردار ایک آیت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ "عورتوں کے جس طرح فرائض ہیں اسی طرح ان کے حقوق بھی ہیں جو منصفانہ ہیں لیکن مرد اُن پر ایک درجہ بلند ہیں"۔

(سورہ ۲: آیت ۲۲۸)

اس ایک درجے کی تاویل عام طور پر مسلم علما ایک دوسری آیت کے ساتھ ملا کر کرتے ہیں جس سے دوسری باتوں کے علاوہ کہا گیا ہے کہ "مرد عورتوں کے امین اسرپرست اور محافظ ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اُن میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور اس لیے بھی کہ مرد اپنے وسائل میں سے خرچ کرتے ہیں"۔ (قرآن کا سورہ ۴: آیت ۳۴)

اس درجے کو اس چیز سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جسے ماہرین علم انبات ' دستاویزی قیادت' کا نام دیتے ہیں یا جسے گھر میں خارجی حاکمیت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو تقسیم کار یا

مرد اور عورت کے کردار میں فرق کے باعث وجود میں آتی ہے۔ تاہم اس سے مرد اور عورت کے درمیان کوئی حتمی امتیاز لازم نہیں آتا یا ایک جنس کی دوسری پر برتری ثابت نہیں ہوتی۔[1]

(ا) بیوی کے حقوق: شوہر کے فرائض

بیوی کے حقوق اور ان حقوق کے بدلے اُس کے فرائض کا تعیّن چند اخلاقی اصولوں کے تحت کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ اخلاقی اصول شوہر اور بیوی کے مابین باہمی طرزِ عمل کے ضوابط کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چونکہ قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی احادیث میں عورتوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس لیے شوہر کا فرض ہے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ منصفانہ اور مشفقانہ رویہ اپنائے۔ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی ایک خاص اہمیت یہ ہے کہ مرد اپنی بیوی کے نان نفقے کا مکمل طور پر ذمّہ دار ہے۔ یہ ایک ایسا فریضہ ہے جو شوہر کو ہر حالت میں بخوشی سرانجام دینا چاہیے اور اس کی انجام دہی میں کوئی ایسی بات سرزد نہیں ہونی چاہیے جس سے بیوی کو خفّت، جذباتی صدمے یا فروتنی کے احساس کا سامنا کرنا پڑے۔

نان نفقہ کے مشمولات

نان نفقہ یا خرچہ سے مراد بیوی کو رہائش، لباس، خوراک، عام نگہداشت اور بھلائی کی سہولتیں مہیّا کرنا ہے۔ بیوی کو ان سہولتوں کے حصول کا ناقابلِ تردید حق حاصل ہے۔ بیوی کی جائے رہائش

---

[1] قرآن میں مردوں کا عورتوں پر ایک درجہ بلند ہونے کا جو ذکر آیا ہے اُس سے مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں نے یکساں طور پر غلط مطلب اخذ کیا ہے۔ ہم نے اپنی کتاب "اسلام میں خاندان کی تشکیل" میں اس مسئلے پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ ہم نے استنباط کیا ہے کہ اس آیت میں مردوں کو عورتوں سے بہتر یا کمتر نہیں کہا گیا نہ اس میں فی الواقعی کسی فضیلت کا حوالہ دیا گیا ہے۔ لہٰذا یہاں پر درجے سے مراد صرف مرد کی مردانگی بمقابلہ عورت کی نسوانیت لی جانی چاہیے۔

ایسی ہونی چاہیے جس میں اُسے معقول حد تک تخلیہ، آرام اور آزادی میسر آ سکے۔ وہیں، ہمیت بیوی کی بھلائی اور شادی کے استحکام کو دخل ہے۔ رہائش کی طرح اُسے لباس، خوراک اور عام نگہداشت کی کافی سہولتیں دی جانی بھی ضروری ہیں۔ یہ بیوی کا حق ہے کہ اُس کا شوہر اپنے وسائل اور اُس کی طرزِ زندگی کے مطابق اُسے لباس پہنائے، خوراک کھلائے اور اس کی دیکھ بھال کرے۔ بیوی کے یہ حقوق بغیر اسراف کے یا بغیر بخل کے پورے کیے جانے چاہئیں۔

غیر مادی حقوق

صرف مادی حقوق ہی بیوی کو تحفظ فراہم نہیں کرتے۔ اُسے اخلاقی نوعیت کے حقوق بھی حاصل ہیں اور وہ بھی مادی حقوق کی طرح لازمی اور قطعی ہیں۔ شوہر کے لیے اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ وہ اپنی بیوی سے منصفانہ سلوک کرے، اُس کے جذبات کا احترام کرے اور اُس کے ساتھ رحمدلی اور مروت سے پیش آئے۔ شوہر کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنی بیوی سے بیزاری ظاہر کرے، اُسے تشویش میں ڈالے یا کسی غیر یقینی حالت میں رکھے۔ اس قانون کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کوئی مرد اپنی بیوی کو تکلیف پہنچانے یا اُس کی آزادی کو مسدود کرنے کی نیت سے اُسے اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ اگر اُسے اپنی بیوی سے محبت یا ہمدردی نہیں تو بیوی کو رشتہ ازدواج سے آزادی کا مطالبہ کرنے کا حق حاصل ہے اور کوئی شخص اُسے نئی زندگی شروع کرنے سے نہیں روک سکتا۔

(ب) بیوی کے فرائض: شوہر کے حقوق

رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کی حیثیت میں بیوی کا ایک اہم فریضہ یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو شادی کو کامیابی اور سعادت سے ہمکنار کرنے میں اپنا حصہ ادا کرے۔ اُس کے

لیے لازم ہے کہ اپنے شوہر کے آرام اور اُس کی بھلائی کا خیال رکھے۔ کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے اُس کا شوہر آزردہ خاطر ہو یا اُس کے جذبات کو ٹھیس پہنچے۔ شاید اس نکتے کی وضاحت قرآن مجید کی اس آیت سے بہتر نہیں ہو سکتی جس میں اُن لوگوں کو نیک کہا گیا ہے جو یہ دُعا کرتے ہیں:

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا۔

"اے ہمارے رب، ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا۔

(قرآن کا سورہ ۲۵: آیت ۷۴)

یہ ہے وہ بنیاد جس پر بیوی کے تمام فرائض کا انحصار ہے۔ اس بنیادی فریضے کی انجام دہی کے لیے بیوی کا وفادار، قابلِ اعتماد اور دیانت دار ہونا ضروری ہے۔ خصوصاً اُسے حمل سے دانستہ اجتناب کر کے اپنے شوہر کو دھوکا نہیں دینا چاہیے کیونکہ ایسا کرنے سے وہ اپنی جائز اولاد سے محروم رہ سکتا ہے۔ بیوی کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ کسی دوسرے شخص کو اُس مقام تک نہ پہنچنے دے جو صرف اُس کے شوہر کا حق ہے یعنی وہ کسی اور سے جنسی اختلاط میں ملوّث نہ ہو۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُسے اپنے شوہر کے علم اور مرضی کے بغیر اجنبی مردوں کو گھر میں نہیں آنے دینا چاہیے یا اُن کی مہمان نوازی نہیں کرنی چاہیے نہ اُسے شوہر کی اجازت کے بغیر اُن کے تحائف قبول کرنے چاہئیں۔ اس کا مقصد غالباً حسد، شکوک و شبہات، بے مقصد بات چیت وغیرہ کے امکانات کو ختم کرنا اور تمام متعلقہ فریقوں کی سالمیتِ کردار کو برقرار رکھنا ہے۔ شوہر کی املاک بیوی کے پاس بطورِ امانت ہوتی ہیں۔ اگر ان املاک کا کوئی حصّہ اُس کی دسترس میں ہو یا شوہر اُس کی تحویل میں کوئی رقم دے تو اُسے اپنا فرض بڑی دانشمندی اور کفایت شعاری سے انجام دینا چاہیے۔ اُسے اپنے شوہر کی مرضی

کے بغیر کوئی چیز کسی کو مستعار نہیں دینی چاہیے۔

جہاں تک شوہر سے قربت کا تعلق ہے بیوی کو چاہیے کہ وہ اس کے لیے خود کو پسندیدہ اور پرکشش بنائے۔ اُس کی محبت کا جواب محبت سے دے اور اُس سے ہر ممکن تعاون کرے۔ بیوی کو چاہیے کہ جب بھی شوہر کی خواہش ہو خود کو پیش کرنے سے انکار نہ کرے کیونکہ قرآن کا ارشاد ہے کہ شوہر اور بیوی ایک دوسرے کے لیے آسائش و آرام کا باعث ہیں۔ اسلام صحت اور خوش سلیقگی کو پوری اہمیت دیتا ہے۔ مزید برآں بیوی کو کسی ایسی بات کی اجازت نہیں جس سے اُس کی رفاقت کی کشش اور اُس کی قربت سے حاصل ہونے والی طمانیت میں کمی واقع ہو۔ اگر اُس سے کوئی ایسی بات سرزد ہوتی ہے یا وہ اپنے آپ کو صحت مند اور پرکشش رکھنے میں غفلت سے کام لیتی ہے تو شوہر کو اس صورتِ حال کی اصلاح کے لیے اُس کی آزادی میں مداخلت کرنے کا حق حاصل ہے۔ فریقین کی زیادہ سے زیادہ تشفی کو یقینی بنانے کے لیے شوہر کو کسی ایسی بات کی اجازت نہیں جس سے بیوی کی تسکین میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوتی ہو۔

والدین اور بچے کا رشتہ

(ا) بچے کے حقوق : والدین کے فرائض

بچوں سے متعلق اسلام کے طرزِ عمل کو چند ایک اصولوں کی شکل میں ملخص کیا جا سکتا ہے
سب سے پہلی بات یہ کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ کوئی بچہ والدین کے لیے تکلیف دہ نہیں ہونا چاہیے
(سورہ ۲ : آیت ۲۳۳)

دوسرے یہ کہ اس کے بدلے میں والدین کو بھی بچے کے حق میں ایسا ہی ہونا چاہیے یعنی وہ بھی بچے کے لیے تکلیف کا باعث نہ بنیں۔ قرآن واضح انداز میں تسلیم کرتا ہے کہ بچوں کی دیکھ بھال میں والدین کا طرزِ عمل ہمیشہ ایک سا نہیں ہوتا۔ وہ بعض اوقات بچے کی حد سے زیادہ حفاظت کرتے ہیں اور بعض اوقات اُن سے غفلت برتتے ہیں۔ تیسرے اس مسلمہ حقیقت کی بنیاد پر اسلام نے کچھ رہنما اصول مقرر کیے ہیں اور بچوں کے سلسلے میں بعض حقائق کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ بچے زندگی کی خوشیاں ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہی بچے بعض اوقات والدین کے لیے فخر و مباہات، بے جا غرور، جھوٹے تحفظ، زبوں حالی اور حرص و آز کا سبب بھی بنتے ہیں لیکن اسلام بلند تر روحانی مسرتوں پر زور دیتا ہے اور والدین کو متنبہ کرتا ہے کہ کہیں بچوں کی وجہ سے وہ حد سے زیادہ خود اعتمادی اور بے جا غرور میں مبتلا اور جرائم میں ملوث نہ ہو جائیں۔ اس صورتِ حال میں مذہب اور اخلاق کا سبق یہ ہے کہ ہر فرد خواہ وہ والدین میں سے ہو یا بچہ ہو اُس کا تعلق براہِ راست اللہ سے ہے اور وہ اپنے اعمال کے لیے بلا شرکتِ غیرے خود ذمہ دار ہے۔ روزِ حساب کوئی بچہ والدین کو بخشوا نہیں سکتا، نہ والدین ہی بچے کی شفاعت کر سکتے ہیں۔ آخری بات یہ کہ اسلام اس معاملے

میں بہت حسّاس ہے کہ بچہ مکمل طور پر اپنے والدین کا متوسّل یا دست نگر ہوتا ہے۔ اسلام بچے کی شخصیت کی تعمیر میں والدین کے کردار کو واضح انداز میں تسلیم کرتا ہے۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ایک نہایت معنی خیز ارشادِ گرامی ہے کہ ہر بچہ صحیح فطرت (یعنی اسلام کی خالص فطری حالت) لے کر پیدا ہوتا ہے۔ بعد میں اُس کے والدین اُسے یہودی، عیسائی یا ملحد بنا دیتے ہیں۔

ان رہنما اصولوں کے پیشِ نظر ہم زیادہ قطعیت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام میں بچوں کے ناقابلِ انتقال حقوق میں سے ایک حق زندہ رہنے اور زندگی کے مساوی مواقع حاصل کرنے کا ہے۔ بچے کی زندگی کی حفاظت اسلام کا تیسرا حکم ہے۔

(سورہ ٦: آیت ١٥١، سورہ ١٧: آیت ٣٣)

بچے کے حقوق کے سلسلے میں اس کا ایک اور ناقابلِ انتقال حق اُس کے جائز اولاد ہونے کا حق ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہر بچے کا لازمی طور پر ایک اور صرف ایک باپ ہوگا۔ بچے کے حقوق کے تیسرے مجموعے کا تعلق معاشرے میں اُس کی رکنیت، پرورش اور عام نگہداشت سے ہے۔ بچے کی اچھی طرح نگہداشت کرنا اسلام میں سب سے زیادہ پسندیدہ اعمال میں سے ایک ہے۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو بچوں سے محبت تھی اور آپ نے یقین ظاہر کیا تھا کہ امتِ مُسلمہ بچوں کے ساتھ مشفقانہ رویّہ اپنانے کی وجہ سے دوسری اُمتوں سے ممتاز ہوگی۔ بچوں کی روحانی بہبود، تعلیمی ضروریات اور عام بھلائی کا خیال رکھنا ایک افضل تر کارِ خیر ہے۔ بچے کی بہبود کے کاموں میں دلچسپی لینا اور اس سلسلے میں اپنی ذمّہ داری نبھانا ایک ایسا مسئلہ ہے جسے باقی تمام مسائل پر اوّلیت حاصل ہے۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ہدایات کے مطابق بچے کی پیدائش کے ساتویں روز تک اُس کا ایک اچھا سا نام رکھ دینا چاہیے اور اُس کی صحت مند نشوونما کے لیے حفظانِ صحت کے دوسرے اقدامات عمل میں لانے کے علاوہ اُس کا سر منڈوا دینا چاہیے۔ اس موقع کو ایک پُرمسرت تقریب کا درجہ

دے کر خوشی منانی چاہیے اور خیرات تقسیم کرنی چاہیے ۔

بچے کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری پوری کرنا اور اُس پر رحم کھانا ایک ایسا معاملہ ہے جس کی مذہبی اہمیت بھی ہے اور معاشرتی بھی ۔ بچے کے والدین خواہ زندہ ہوں یا انتقال کر چکے ہوں، حاضر ہوں یا غائب، معلوم ہوں یا نامعلوم، بچے کو ہر حالت میں بہترین نگہداشت ملنی چاہیے ۔ اگر وصی (وصیت پر عملدرآمد کرانے والا) یا قریبی رشتے دار جنہیں بچے کی بہبود کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکے موجود ہوں تو انہیں ہدایت کی جانی چاہیے کہ وہ بچے کی نگہداشت کا فرض بطریقِ احسن انجام دیں ۔ لیکن اگر کوئی قریبی رشتہ دار موجود نہ ہو تو بچے کی نگہداشت پورے مسلم معاشرے بشمول سرکاری اہلکار اور عام افراد سب کی مشترکہ ذمہ داری قرار پاتی ہے ۔

(ب) بچے کے فرائض، والدین کے حقوق

والدین اور بچے کا آپس میں جو تعلق ہے وہ ایک دوسرے کی ذات کے لیے تکمیل کنندہ کا درجہ رکھتا ہے ۔ اسلام میں والدین اور بچہ دونوں باہمی فرائض اور جوابی ذمہ داریوں کے بندھن میں ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں لیکن بعض اوقات عمر کا فرق اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ والدین جسمانی لحاظ سے ضعیف اور ذہنی طور پر کمزور ہو چکے ہوتے ہیں جس کے باعث وہ اکثر صبر و برداشت کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتے ہیں ۔ اُن کے قویٰ مضمحل ہوتے ہیں، حساسیت بڑھ جاتی ہے، مزاج میں چڑچڑاپن آجاتا ہے اور اندازہ کرنے میں اکثر غلطی کر بیٹھتے ہیں ۔ اس کے نتیجے میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ والدین اپنے اختیارات کا غلط استعمال کرنے لگتے ہیں اور یوں دو نسلوں کے مابین کشیدگی اور بے چینی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ۔ یہ وہی کیفیت ہے جسے عام طور پر دو نسلوں کے درمیان بُعد یا خلا (Generation Gap) کا نام دیا جاتا ہے ۔ شاید انہی حقائق کے پیشِ نظر اسلام نے

بعض بنیادی باتوں پر توجہ دی اور فرد اور والدین کے تعلق کو ایک ضابطے میں لانے کے لیے بنیادی اصول وضع کر دیے۔

یہ درست ہے کہ والدین عمر میں بڑے ہوتے ہیں اور عام طور پر انہیں زیادہ تجربہ کار خیال کیا جاتا ہے لیکن اس سے اُن کے نظریات کو قانونی حیثیت حاصل نہیں ہوتی اور نہ اُن کے قائم کردہ معیاروں کی تصدیق ہی ہوتی ہے۔ اسی طرح صرف نوجوان ہی توانائی، شائستگی اور عقل و دانش کا منبع نہیں ہوتے۔ قرآن مجید متعدد مقامات پر ایسی مثالیں پیش کرتا ہے جہاں والدین اپنی اولاد کے بالمقابل غلطی پر تھے۔ اسی طرح بہت سے مواقع پر اولاد نے اپنے والدین کے بارے میں غلط اندازے قائم کیے۔ (سورہ ۶: آیت ۷۴، سورہ ۱۱: آیات ۴۲ تا ۴۶، سورہ ۱۹: آیات ۴۲ تا ۴۸)

غالباً زیادہ اہم حقیقت یہ ہے کہ رسومات، عوامی طور طریقے، روایات یا والدین کا نظامِ اقدار اور اُن کے قائم کردہ معیار بذاتِ خود سچائی یا حق و انصاف کی دلیل نہیں۔ بہت سی آیات میں قرآن مجید نے اُن لوگوں کی مذمت کی ہے جو محض اس لیے راہِ حق سے بھٹک جاتے ہیں کہ یہ راستہ اُن کے لیے نیا اور اُن کے جانے پہچانے راستے سے مختلف ہوتا ہے یا اُن کے بزرگوں کی اقدار سے ہم آہنگ نہیں ہوتا۔ مزید برآں قرآن اس بات پر زور دیتا ہے کہ اگر والدین کی اطاعت و فرماں برداری سے کسی فرد کے راہِ حق سے منحرف ہونے کا احتمال ہو تو اُسے والدین کی بجائے اللہ کا ساتھ دینا چاہیے۔ یہ درست ہے کہ اولاد کی طرف سے مروّت، محبت، ہمدردی اور رحمدلی کا سلوک والدین کا حق ہے لیکن اگر والدین حق سے تجاوز کر کے اللہ کے حقوق میں مداخلت کرنے لگیں تو پھر حقوق اللہ اور حقوقِ والدین کے درمیان حدِ فاصل کھینچنا اور اسے ہر حالت میں برقرار رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔

قرآن اس پورے مسئلے کو احسان کے عظیم تصور میں سمیٹ دیتا ہے۔ یہ تصور سچائی، نیکی اور حُسن سے عبارت ہے۔ والدین سے احسان کی عملی تعبیر یہ ہے کہ اولاد اپنے والدین

کا ہر طرح سے خیال رکھے اُن کے سامنے صبر و برداشت کا مظاہرہ کرے، اُن کی احسان مند رہے، اُن کے ساتھ نرمی سے پیش آئے، اُن کا احترام کرے، اُن کی ارواح کے لیے دُعا کرے، ان کے جائز حقوق کا پاس کرے اور بوقتِ ضرورت اپنا پُر خلوص مشورہ پیش کرے۔

احسان کا ایک بنیادی پہلو ادب ہے۔ والدین کا یہ حق ہے کہ جو کچھ انہوں نے اپنی اولاد کے لیے کیا ہے اُس کے صرف جزوی بدلے میں وہ اُن سے اطاعت و فرماں برداری کی توقع رکھیں۔ لیکن اگر والدین اُن سے کسی غلط بات کا تقاضا کرتے ہیں یا کوئی ناجائز کام کرنے کو کہتے ہیں تو ایسی صورت میں اُن کی نافرمانی نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہو جاتی ہے۔ فرماں برداری اور نافرمانی ہر دو صورتوں میں اولاد کا اپنے والدین کے ساتھ رویّہ نہ تو قطعی اطاعت شعاری کا ہونا چاہیے اور نہ غیر ذمّہ دارانہ نافرمانی کا۔

احسان کا ایک آخری اور لازمی جزو جس کا ذکر یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ اولاد پر اپنے والدین کی اعانت اور اُن کے نان نفقے کی ذمّہ داری عائد ہوتی ہے۔ بوقتِ ضرورت والدین کی مالی امداد کرنا اور اُن کی زندگی کو ممکن حد تک آرام دہ بنانا ایک مذہبی فریضہ ہے۔

۵۔ خاندانی زندگی کے دیگر پہلو

انسانی زندگی کا ایک اور پہلو جس کا خاندانی زندگی سے نہایت قریبی تعلق ہے : ملازمین، خاندان کے دیگر افراد، رشتہ داروں اور ہمسایوں سے برتاؤ ہے۔ جو لوگ گھروں میں مستقل ملازم رکھتے ہیں اُن کے لیے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ہدایت ہے۔ "مالکوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ملازمین سے بھائیوں جیسا سلوک کریں اور انہیں اپنا غلام نہ سمجھیں کیونکہ جو شخص اپنے ملازم سے اچھا سلوک کرتا ہے آپؐ کے ارشاد کے مطابق اللہ

تعالیٰ اُس کی موت کو آسان اور خوشگوار کرے گا ورنہ عام حالات میں موت ایک نہایت تکلیف دہ مرحلہ ہوتا ہے۔ ملازمین اپنے مالکوں سے انصاف، لطف و کرم، رحمدلی، خوراک، لباس، رہائش اور دیگر اخراجات کے حصول کے حقدار ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو یہاں تک فرما دیا کہ غلام کو وہی خوراک کھانے کو دی جائے جو مالک خود کھاتا ہے اور اُسے اسی کپڑے کا لباس پہنایا جائے جو مالک خود پہنتا ہے۔ مالک کے لیے ضروری ہے کہ وہ یہ چیزیں اپنے ملازم کو از خود اور اپنا فرض جان کر مہیا کرے اور اس کے بدلے میں اپنے کسی ملازم کو زچ نہ کرے نہ اُس کی تحقیر کرے اور نہ اُس پر فالتو کام کا بوجھ ڈالے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام طبقاتی جنگ کی دعوت دیے بغیر اور محنت کش طبقے کو تشدد پر اکسائے بغیر کس طرح انسانیت کو وقار اور محنت کشوں کو عزت بخشتا ہے۔ ملازمت یا مزدوری کرنے سے کوئی شخص اپنے حقوق سے محروم نہیں ہوتا یا بحیثیت انسان اُس کی عزت مجروح نہیں ہوتی۔ اسلام محنت کش طبقے کو اس نشے کا عادی بھی نہیں بناتا جس میں صنعتی مزدور اپنے حالات کو مثالی بنانے کا خواب دیکھتا ہے۔ ایک حقیقی اسلامی معاشرے کے تمام شہری مساوی بنیادوں پر کھڑے ہیں کیونکہ اسلام ذات پات کے نظام یا دوسرے درجے کی شہریت کو تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کے نزدیک ایک انسان کی دوسرے انسان پر برتری یا فضیلت کا واحد معیار تقویٰ اور نیک اعمال ہیں۔

(سورہ ۹: آیت ۱۰۵، سورہ ۴۹: آیت ۱۳)

اللہ تعالیٰ انسان کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ اپنے خاندان کے دوسرے افراد اور رشتہ داروں کی مدد کرے، اُن کے ساتھ شفقت سے پیش آئے اور اُن کے لیے محبت کے سچے جذبات کا اظہار کرے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عربی زبان میں رشتہ داری کے معنوں میں مستعمل لفظ ایک ایسے مادہ سے مشتق ہے جس کے معنی رحم کے ہیں (رحیم، رحمان)

اپنے رشتہ داروں کے ساتھ شفقت و رحمدلی کا سلوک جنت کی طرف جانے کا ایک آسان اور مختصر راستہ ہے۔ یہ راستہ اُن لوگوں کے لیے مسدود کر دیا گیا ہے جو رشتہ داروں کے

ساتھ اپنے فرائض سے غفلت برتتے ہیں۔ ارشادِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ جو شخص اپنے رشتہ داروں کے ساتھ مشفقانہ سلوک کرتا ہے اللہ اُس کی زندگی اور رزق میں برکت دیتا ہے۔ اگر کوئی رشتہ دار اچھے سلوک کا جواب اُسی طرح کے اچھے سلوک سے نہ دے تب بھی اس کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنا ایک مقدس فرض ہے۔ یہ ایک ایسا فرض ہے جس کا حکم اللہ نے دیا ہے اور اسے اللہ ہی کے لیے پورا کرنا چاہیئے اور اس بات کی پروا نہیں کرنی چاہیے کہ اس سلوک کے جواب میں رشتہ دار اُس سے کیا سلوک کرتا ہے۔

سورہ ۲ : آیت ۱۷۷ ، سورہ ۴ : آیت ۳۶ ، سورہ ۱۶ : آیت ۹۰ ، سورہ ۱۷ : آیات ۲۳ تا ۲۶)

اسلام کے نقطۂ نظر سے ہمسایوں کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اسلام نے ہر قسم کے ہمسایوں کو بہت سی مراعات سے نوازا ہے۔ ایک روایت کے مطابق اس موضوع پر قرآنی تعلیمات کی صراحت کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی شخص اُس وقت تک صحیح مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک اُس کے ہمسائے اُس کی طرف سے خود کو ہر قسم کے گزند سے محفوظ نہ سمجھیں۔ مزید برآں وہ شخص سچا مسلمان نہیں جس کے ہمسائے رات کو بھوکے رہیں اور وہ خود پیٹ بھر کر سوئے۔ ارشادِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ جس شخص کا اپنے ہمسایوں کے ساتھ اچھا سلوک ہے اُسے قیامت کے روز اللہ کا قُرب حاصل ہوگا۔ ہمسایوں کو چاہیے کہ وہ آپس میں تحائف کا تبادلہ کریں اور ایک دوسرے کی خوشیوں اور غموں میں شریک ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک اور جگہ ارشاد ہے :

کیا تم جانتے ہو کہ ہمسائے کے کیا حقوق ہیں ؟ اگر وہ مدد کیلئے پکارے تو اُس کی مدد کرو۔ اگر وہ کوئی رعایت مانگے تو اُسے رعایت دو۔ اگر قرض مانگے تو اُسے قرض دو۔ وہ تکلیف میں ہو تو اُس کا دُکھ بٹاؤ۔ وہ بیمار ہو جائے تو

اُس کی تیمارداری کرو۔ اگر وہ مرجائے تو اُس کے جنازے میں شرکت کرو۔
اگر اُس کے حق میں کوئی اچھی بات ہو جائے تو اُسے مبارک باد دو۔ اگر وہ کسی
مصیبت میں گرفتار ہو جائے تو اُس سے ہمدردی کرو۔ اُس کی اجازت کے بغیر
اپنے مکان کی دیواریں بلند کر کے اُس کی ہوا نہ روکو۔ اُسے ہراساں نہ کرو۔ جب
پھل خریدو تو اُس میں سے کچھ اُسے دو اور اگر تم اُسے حصہ نہیں دینا چاہتے
تو خریدی ہوئی چیزیں چھپا کر خاموشی سے اپنے گھر لے جاؤ اور بچوں کو یہ چیزیں
باہر نہ لے جانے دو مبادا اُن کو دیکھ کر ہمسایوں کے بچوں کا دل للچائے۔
مزید برآں ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک فرمایا کہ
حضرت جبرائیل نے ہمسایوں کے حقوق کی اتنی تاکید کی ہے کہ آپؐ کو خیال گزرا کہ انہیں شاید
وراثت میں بھی حصہ دار ٹھہرایا جائے۔

(گذشتہ پیراگراف میں جن قرآنی آیات کا حوالہ دیا گیا ہے اُن کا بھی مطالعہ کیجیے)

معاشرتی زندگی

ایک سچے مسلمان کی معاشرتی زندگی اعلیٰ اصولوں کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے اور وہ اُسے
اس نہج سے گزارتا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی ہر دو سطح پر مسرت و کامیابی یقینی ہو جاتی ہے۔
اسلام کی معاشرتی زندگی میں طبقاتی جنگ، ذات پات کی بنیاد پر سماج کی تقسیم اور فرد کا
معاشرے پر غلبہ یا معاشرے کا فرد پر غلبہ وغیرہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ قرآن یا حدیثِ نبویؐ
میں کسی جگہ طبقے، نسل یا دولت کی بنیاد پر ایک کی دوسرے پر برتری کا کوئی ذکر نہیں۔ اس کے
برعکس ایسی متعدد قرآنی آیات اور احادیثِ نبویؐ موجود ہیں جن میں بنی نوع انسان کی توجہ زندگی
کے نہایت اہم اور بنیادی حقوق کی طرف مبذول کرائی گئی ہے۔ یہ ایسے حقائق ہیں جو اسلامی

زندگی کے معاشرتی ڈھانچے کے اصول بھی قرار پاتے ہیں۔ ان میں سے ایک حقیقت یہ ہے کہ عالمِ انسانیت ایک خاندان کے مترادف ہے جو ایک باپ اور ایک ماں سے معرضِ وجود میں آیا ہے اور جس کے افراد کے حتمی مقاصد بھی ایک ہی ہیں۔

عالمِ انسانیت کے اتحاد کا نظریہ اس عقیدے سے ماخوذ ہے کہ آدمؑ اور حوّا سب انسانوں کے مشترکہ والدین ہیں۔ ہر انسان عالمی خاندان کا ایک رکن فرد ہے۔ اس عالمی خاندان کی بنیاد ایک اوّلین باپ اور ایک اوّلین ماں یعنی آدم و حوّا نے رکھی۔ اس لیے ہر انسان معاشرے سے یکساں فوائد حاصل کرنے کا مجاز ہے کیونکہ اُسے مشترکہ طور پر معاشرتی ذمہ داریاں نبھانے کی ہدایت کی گئی ہے۔ جب لوگ محسوس کرتے ہیں کہ تمام انسانوں کا رشتہ آدم و حوّا سے ہے جو خدا کی تخلیق تھے تو پھر نسلی عصبیت، سماجی ناانصافی یا دوسرے درجے کی شہریت کی سرے سے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ لوگ جس طرح فطری طور پر مشترکہ والدین کی اولاد ہونے کے رشتے میں منسلک ہیں اسی طرح انہیں اپنے معاشرتی رویّے میں بھی ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ قرآن اور احادیثِ نبویؐ میں یہ اہم حقیقت بار بار یاد دلائی گئی ہے کہ تمام بنی نوع انسان اپنی فطرت اور اصلیت میں یکساں ہیں۔ اس یاد دہانی کا مقصد نسلی تفاخر اور قومی و خاندانی برتری کے دعووں کو یکسر ختم کرنا اور حقیقی اخوّت کے لیے راہ ہموار کرنا ہے۔

(سورہ ۴: آیت ۱، سورہ ۷: آیت ۱۸۹، سورہ ۴۹: آیت ۱۰ تا ۱۳)

عالمِ انسانیت کی وحدت صرف اُس کی تخلیق میں ہی نہیں بلکہ اُس کے حتمی مقاصد میں بھی ہے۔ اسلام کے مطابق عالمِ انسانیت کی منزلِ مقصود اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بزرگ و برتر ہے۔ وہی ہمارا مبداء ہے، اُسی کے لیے ہم زندگی گزارتے ہیں اور اُسی کی طرف ہم رجوع کرنے والے ہیں۔ درحقیقت ارشادِ قرآنی کے مطابق انسان کی تخلیق کا مقصد وحید اللہ کی عبادت اور اُس کے منشاء کی تکمیل ہے۔ منشائے الٰہی کی تکمیل سے مراد صداقت و

انصاف، محبّت، درحمدلی اور اخوت حُسنِ اخلاق کا قیام ہے۔

(سورہ ۵۱ : آیات ۵۶ تا ۵۸)

انسان کی تخلیق اور اس کی منزلِ مقصود میں پائی جانے والی یہی یکسانی اسلام کی معاشرتی زندگی کا پس منظر ہے جو فرد اور معاشرے کے درمیان تعلقات کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ فرد کا کردار معاشرے کی تکمیل کرنا ہے۔ فرد اور معاشرے کے درمیان ایک سماجی بندھن اور باہمی ذمّہ داری کا عنصر پایا جاتا ہے۔ ایک فرد اپنے معاشرے کی عام بہبود اور خوشحالی کا ذمّہ دار ہوتا ہے۔ یہ ذمّہ داری صرف معاشرے کی طرف سے نہیں خدا کی طرف سے بھی اُس پر عائد ہوتی ہے۔ اس طرح فرد پختہ سماجی شعور اور ناگزیر ذمّہ داری کے سچے احساس کے ساتھ سرگرمِ عمل ہوتا ہے۔ اُس کا کام معاشرے کی حتی المقدور خدمت کرنا اور اس کی عام بہبود کے لیے اپنا بھرپور کردار ادا کرنا ہے۔ دوسری طرف معاشرہ بھی فرد کی بہبود کے لیے خدا کے آگے جواب دہ ہے۔ جب فرد باصلاحیت ہوتا ہے تو وہ معاشرے کو فائدہ پہنچاتا ہے اور معاشرہ اُس سے فائدہ حاصل کرتا ہے۔ اس کے بدلے معذور ہو جانے کی صورت میں فرد معاشرے سے ہر قسم کے تحفّظ اور نگہداشت کے حصول کا حق رکھتا ہے۔ اس صورت میں فرد فائدہ حاصل کرنے والا اور معاشرہ فائدہ پہنچانے والا ہوتا ہے۔ اس طرح فرد اور معاشرے کے فرائض اور حقوق میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ذمّہ داری اور فکرمندی کا عُنصر ہر دو جانب کارفرما ہوتا ہے۔ اسلامی ریاست فرد پر غلبہ حاصل نہیں کرتی نہ فرد کے شخصی وجود کو ختم کرتی ہے۔ بعینہٖ نظامِ اسلام میں کوئی فرد یا افراد کا گروہ ایسا نہیں ہوتا جو معاشرے کا استحصال کر سکے یا ریاست کو بدعنوان بنا سکے۔ دونوں میں ایک قسم کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے جو امن اور باہمی تحفّظ کی فضا کو قائم رکھتی ہے۔ اس طرح فرد اور معاشرے کے مابین ایک تعمیری ردِّعمل کارفرما رہتا ہے۔

تخلیقِ انسانیت اور اُس کی حتمی منزل میں جو ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور فرد اور معاشرے

پر ایک دوسرے کے لیے جو ذمّہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور اس طرح اُن کے مابین جو تعلق استوار ہوتا ہے ان سب عوامل کے علاوہ اسلام کی معاشرتی زندگی کی ایک اور بہت بڑی خصوصیّت نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرنا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرت فرد کو اور اُس کی جان، مال اور عزت کے حقوق کو پوری طرح تسلیم کرتی ہے اور یہ بھی تسلیم کرتی ہے کہ فرد معاشرے کے اخلاقی اصولوں اور ضابطوں کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اسلامی معاشرے میں فرد غیر جانب دار نہیں رہ سکتا۔ اُسے اللہ کی طرف سے حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے تمام تر قانونی وسائل کو جو اُس کی دسترس میں ہیں بروئے کار لاکر نیکی کی دعوت دے اور بدی کی مزاحمت کرے اور اس طرح معاشرے میں صحت مند اخلاقی اصولوں کے قیام میں اپنا بھرپور کردار ادا کرے۔ ایسا کر کے وہ نہ صرف خود بُرائی کو روکتا اور نیکی کو اختیار کرتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی ایسا کرنے میں مدد دیتا ہے۔ جو فرد معاشرے میں خود کو غیر جانب دار سمجھتا ہے، وہ خود غرضی کے گناہ میں ملوّث ہے۔ اُس کے اخلاقی اصول نادرست، اُس کا ضمیر انتشار کا شکار اور اُس کا ایمان نامکمل ہے۔

اسلام میں معاشرتی زندگی کا ڈھانچہ بہت اعلیٰ، مضبوط اور جامع ہے۔ دوسرے انسانوں سے سچی محبت رکھنا، چھوٹوں کے ساتھ شفقت اور رحمدلی سے پیش آنا، بڑوں کا احترام کرنا، مصیبت زدگان کی دلجوئی کرنا اور اُن کی ڈھارس بندھانا، بیماروں کی عیادت کرنا، دل گرفتگان کی دستگیری کرنا، اخوّت اور معاشرتی وحدت کے حقیقی جذبات رکھنا، دوسرے لوگوں کی جان، مال اور آبرو کا احترام کرنا، فرد اور معاشرے کی طرف سے ایک دوسرے پر عائد ہونے والی ذمّہ داریوں کی پاسداری کرنا یہ سب اسلام کے معاشرتی ڈھانچے کے حقیقی عناصر ہیں۔ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اپنی متعدد احادیث میں اُمتِ مُسلمہ کو اس قسم کی ہدایات جاری فرمائی ہیں۔ مثلاً

جو شخص اس دنیا میں کسی کو تکلیف سے نجات دلاتا ہے اللہ اُسے

قیامت کے روز پریشانی سے محفوظ رکھے گا۔

جو شخص چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور بڑوں کا احترام نہیں کرتا وہ ہم مسلمانوں میں سے نہیں ہے۔

کوئی شخص اُس وقت تک صاحبِ ایمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ دوسرے انسانوں کے لیے بھی وہی کچھ پسند نہیں کرتا جو وہ اپنے لیے کرتا ہے۔

جو شخص دوسروں کو نیکی کی دعوت دیتا ہے وہ نیکی کرنے والے کی مانند ہے اور اُسے اس کی جزا ملے گی، اور جو شخص دوسروں کو بدی کی ترغیب دیتا ہے وہ بدی کرنے والے کی مانند ہے اور اُسے اس کی سزا ملے گی۔

اسی طرح قرآن مجید میں اسی قسم کے متعدد احکامات موجود ہیں:

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو جیسا کہ اُس سے ڈرنے کا حق ہے۔ تُم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔ سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔ اللہ کے اُس احسان کو یاد رکھو جو اُس نے تم پر کیا ہے۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اُس نے تمہارے دل جوڑ دیے اور اُس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، اللہ تعالیٰ نے تم کو اُس سے بچا لیا۔ اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے سامنے روشن کرتا ہے شاید کہ ان علامتوں میں سے تمہیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آئے۔ تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہونے چاہییں جو نیکی کی طرف بُلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔ (سورہ ۳: آیات ۱۰۲ تا ۱۰۴)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو بندشوں کی پوری پابندی کرو..... جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں اُن میں کسی سے تعاون نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو، اُس کی سزا بہت سخت ہے۔ (سورہ ۵: آیات ۱ تا ۲)

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اُس کے علاوہ اسلام کے معاشرتی ڈھانچے کی مثالیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے آخری خطبہ میں جو آپ نے حج کے موقع پر دیا ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ آپ نے اس موقع پر ہزاروں حجاج سے خطاب کرتے ہوئے دوسری باتوں کے علاوہ ارشاد فرمایا:

اے لوگو! میری باتیں غور سے سنو کیونکہ مجھے معلوم نہیں کہ پھر کسی سال مجھے اس مقام پر آپ کے درمیان آنے کا موقع ملے گا یا نہیں۔

تمہاری جانیں اور تمہارے مال ایک دوسرے کے لیے مقدس اور لائقِ حرمت ہیں جب تک تم اپنے مالک کے سامنے حاضر نہیں ہوتے کیونکہ اس مہینے کا یہ دن سب کے لیے مقدس ہے اور یاد رکھو کہ نہیں ایک دن اپنے اللہ کے سامنے پیش ہونا پڑے گا اور اللہ تم سے تمہارے اعمال کا حساب لے گا۔

اے لوگو! تمہاری بیویوں پر تمہارے اور تم پر تمہاری بیویوں کے حقوق ہیں۔ اپنی بیویوں کے ساتھ محبت اور نرمی کا برتاؤ کرو۔ بے شک تم نے انہیں اللہ کی امانت کے طور پر قبول کیا ہے اور خدا کے حکم سے اُن کو اپنے لیے جائز قرار دیا ہے۔ جو امانت تمہیں سونپی گئی ہے اُس سے ہمیشہ وفادار رہو اور گناہ سے بچو۔

آج سے خونیں انتقام جو زمانۂ جہالت و کفر میں رائج تھا کی ممانعت

کر دی گئی ہے اور تمام نسلی تفرقے ختم کر دیئے گئے ہیں۔

اپنے غلاموں کا خیال رکھو۔ انہیں وہی کھانا کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو اور وہی لباس پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو۔ اور اگر وہ کوئی ایسی غلطی کر بیٹھیں جسے تم معاف کرنا نہیں چاہتے تو انہیں آزاد کر دو۔ وہ اللہ کے بندے ہیں اور وہ سخت برتاؤ کے سزاوار نہیں۔

اے لوگو! میری باتوں پر کان دھرو اور ان کو اچھی طرح سمجھ لو۔ جان لو کہ تمام مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ تم سب اخوت کے ایک رشتے میں منسلک ہو۔ کوئی چیز جو دوسرے کی ملکیت ہے وہ اُس کے بھائی کے لیے جائز نہیں جب تک کہ اُس چیز کا مالک نیک نیتی سے اُسے خود نہ دیدے۔ خبردار! کسی ناانصافی کے مرتکب نہ ہونا۔

اللہ تعالیٰ نے جس طرح اس جگہ اس مہینے کا یہ دن مقدس ٹھہرایا ہے اُسی طرح اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ہر ایک کی جان، مال اور عزت کو مقدس بنا دیا ہے۔ حتیٰ کہ قیامت کے دن تم اپنے رب سے ملو گے۔

اس جگہ جو شخص بھی حاضر ہے وہ یہ بات اُس شخص کو بتا دے جو یہاں موجود نہیں۔ ممکن ہے جس کو یہ بات بتائی جائے وہ سننے والے سے بہتر طور پر یاد رکھ سکے۔

یقیناً میں نے اپنا مشن پورا کر لیا ہے اور میں تمہارے درمیان ایک سیدھی سادی ہدایت یعنی اللہ کی کتاب (قرآن مجید) اور واضح احکامات چھوڑے جا رہا ہوں۔ اگر ان پر مضبوطی سے قائم رہو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔

اقتصادی زندگی

اسلام کی اقتصادی زندگی کا ڈھانچہ بھی احکاماتِ الٰہی کی ٹھوس بنیادوں پر استوار کیا گیا ہے۔ معقول محنت سے روزی کمانا نہ صرف انسان کا فرض بلکہ ایک بہت بڑی نیکی بھی ہے۔ کسی باصلاحیت شخص کا روزی کے حصول کے لیے دوسروں پر انحصار کرنا ایک مذہبی گناہ، موجبِ ذلت و رسوائی اور پورے معاشرے کے لیے کلنک کا ٹیکہ ہے۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو خود کفیل ہونے اور کسی دوسرے پر بوجھ نہ بننے کا حکم دیتا ہے۔ اسلام روزی کمانے کے لیے اختیار کیے جانے والے تمام پیشوں کا احترام کرتا ہے بشرطیکہ ایسے کسی پیشے میں ناشائستگی یا بُرائی کا کوئی پہلو نہ نکلتا ہو۔ مسلمان اپنی اور اپنے متوسلین کی معاشی کفالت کے لیے پاک صاف ضمیر کے ساتھ اور معاشرے میں اپنی عزت کو برقرار رکھتے ہوئے کسی بھی کام کے لیے کمربستہ ہو سکتا ہے۔ ایک روایت کے مطابق ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ اگر کوئی شخص صرف رسّی لے کر گھر سے نکلتا ہے، لکڑیاں کاٹتا ہے، ان کا گٹھا بناتا ہے اور بیچتا ہے تاکہ وہ اس سے حاصل ہونے والی رقم سے خود پیٹ بھر سکے اور اس کا کچھ حصہ خیرات کر سکے تو یہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ دوسروں سے بھیک مانگے خواہ وہ اُسے کچھ دیں یا نہ دیں۔ اسلام کے مطابق دیانت دار محنت کش افراد کا مرتبہ کسبِ رزق کے لیے اُن کے کام کی نوعیت کی وجہ سے کم نہیں ہو سکتا۔ اس کے باوجود تمام محنت کش طبقوں کے لیے اپنی قسمت سنوارنے اور اپنا معیارِ زندگی زیادہ سے زیادہ بلند کرنے پر کوئی حد نہیں ہے۔ انہیں اپنی کاروباری سرگرمیاں آزادانہ طور پر جاری رکھنے اور ان کو ترقی دینے کے مساوی مواقع دیے گئے ہیں۔

فرد جائز ذرائع سے جو کچھ بناتا یا کماتا ہے وہ اُس کی ذاتی ملکیت ہے جس پر ریاست

یا کوئی اور شخص اپنا حق نہیں جتا سکتا۔ نجی ملکیت کے اس حق کے بدلے میں اُسے معاشرے کی طرف سے عائد ہونے والی کچھ ذمہ داریاں پوری کرنا ہوتی ہیں اور ریاست کے کچھ محاصل ادا کرنا ہوتے ہیں جس کے بعد اُسے ریاست کی طرف سے تحفظ حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ کوئی بھی کاروبار آزادانہ طور پر کر سکتا ہے اور اس آزادی کی اُسے حکومت کی طرف سے ضمانت مل جاتی ہے۔ اسلامی نظام میں جارحانہ سرمایہ داری اور تباہ کن اشتراکیت کا خطرہ کبھی پیدا نہیں ہوتا۔ کاروبار کرنے والا فرد ریاست کی خوشحالی میں حصہ لیتا ہے اور اس کے بدلے ریاست فرد کے تحفظ کی ذمہ داری اُٹھاتی ہے۔ اس طرح طبقاتی اختلافات کی جگہ باہمی تعاون اور ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ احساسِ تحفظ اور اعتماد کی فضا میں خوف و ہراس اور شکوک و شبہات کے بادل چھٹ جاتے ہیں۔

اسلام کا اقتصادی نظام صرف حسابی اندازوں اور پیداواری صلاحیتوں پر ہی مبنی نہیں ہے بلکہ اسے اخلاقیات اور ٹھوس اصولوں کے ایک جامع نظام کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے۔ ایک شخص جو کسی دوسرے شخص، کاروبار یا ادارے کے لیے کام کرتا ہے اُس کے لیے اللہ کا حکم ہے کہ وہ مستعدی اور دیانت داری سے کام کرے۔ ارشادِ نبویؐ ہے کہ "اگر تم میں سے کوئی شخص کسی کام کی ذمہ داری قبول کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے اپنا کام احسن طریقے اور مستعدی سے سرانجام دیتے ہوئے دیکھنا پسند کرتا ہے۔ کام کے اختتام پر مزدور اپنے کام کے بدلے معقول معاوضہ وصول کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اگر آجر منصفانہ معاوضہ ادا نہیں کرتا یا اس میں کٹوتی کرتا ہے یا ادائی میں ٹال مٹول سے کام لیتا ہے تو ایسا کرنا اللہ کے قانون کے مطابق قابلِ سزا جُرم ہے۔

اسلام کاروباری معاملات کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دیانتدارانہ تجارت کی نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ اسے سراہا ہے۔ تجارت افراد، کمپنیوں، ایجنسیوں یا کسی اور قسم کے ادارے کی وساطت سے کی جا سکتی ہے لیکن تمام کاروباری معاملات

صاف گوئی اور دیانت داری سے نمٹائے جانے چاہییں۔ دھوکا دینا، ڈیلروں پر مال کے نقائص ظاہر نہ کرنا، گاہکوں کی ضروریات سے ناجائز فائدہ اُٹھانا، اپنی قیمتیں برقرار رکھنے کے لیے مال پر اجارہ داری قائم کرنا وغیرہ یہ سب گنہگارانہ افعال ہیں اور اسلام کے نزدیک قابلِ تعزیر ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنا معیارِ زندگی عمدہ بنانا چاہتا ہے تو اس مقصد کے لیے اُسے جائز ذرائع اختیار کرنے چاہییں اور سخت جدوجہد کرنی چاہیے۔ اگر وہ ایسا کیے بغیر کسی اور طریقے سے اپنا معیارِ زندگی بلند کرلیتا ہے تو اُس پر "مالِ مفت دلِ بے رحم" والی ضرب مثل صادق آئے گی۔ صرف یہی نہیں بلکہ ارشادِ نبویؐ کے مطابق جس شخص کی پرورش ناجائز کمائی پر ہوگی وہ روزِ قیامت جہنم کی آگ کا ایندھن بنے گا۔ دغا بازی اور استحصال کا مقابلہ کرنے کے لیے اسلام کاروبار میں دیانت داری کا حکم دیتا ہے، دھوکا دینے والوں کو تنبیہ کرتا ہے، عمدہ کام کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور حاجت مند کو قرض دے کر اُس سے سود وصول کرنے کی ممانعت کرتا ہے تاکہ انسان کو معلوم ہو جائے کہ وہی کچھ اُس کی جائز ملکیت ہے جس کے لیے اُس نے محنت کی ہے۔ نیز دوسرے لوگوں کی اشد ضروریات کا استحصال کرنا غیر مذہبی، غیر انسانی اور غیر اخلاقی فعل ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

> جو لوگ اپنے مال شب و روز کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں اُن کا اجر اُن کے رب کے پاس ہے اور اُن کے لیے کسی خوف اور رنج کا مقام نہیں۔ مگر جو لوگ سُود کھاتے ہیں، اُن کا حال اُس شخص کا سا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھُو کر باؤلا کر دیا ہو۔ اور اس حالت میں اُن کے مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: "تجارت بھی تو آخر سود ہی جیسی چیز ہے۔" حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔ لہٰذا جس شخص کو اُس کے رب کی طرف سے یہ نصیحت پہنچے اور آئندہ کے لیے وہ سود خواری سے باز آ جائے، تو جو کچھ وہ پہلے کھا چکا سو کھا چکا، اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔

اور جو اس حکم کے بعد اس حرکت کا اعادہ کرے، وہ جہنمی ہے، جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ سُود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشوونما دیتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے بدعمل انسان کو پسند نہیں کرتا۔

(سورہ ۲: آیات ۲۷۴ تا ۲۷۶)

آسمان کو اُس نے بلند کیا اور میزان قائم کردی۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ تم میزان میں خلل نہ ڈالو، انصاف کے ساتھ ٹھیک ٹھیک تولو اور ترازو میں ڈنڈی نہ مارو۔

(سورہ ۵۵: آیات ۷ تا ۹)

ان آیاتِ قرآنی میں انسان کو اپنے تعلقات اور معاملات میں عدل و انصاف قائم کرنے کی تلقین اور صراطِ مستقیم کی طرف اُس کی رہنمائی کی گئی ہے۔ دھوکا دینے والوں کا مستقبل بہت المناک اور اُن کا انجام نہایت بُرا ہے۔ اس ضمن میں قرآن کے احکامات یہ ہیں:

تباہی ہے ڈنڈی مارنے والوں کے لیے جن کا حال یہ ہے کہ جب لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں، اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو انہیں گھاٹا دیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ ایک بڑے دن یہ اُٹھا کر لائے جانے والے ہیں؟ اُس دن جب کہ سب لوگ اپنے ربّ العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ (سورہ ۸۳: آیات ۱ تا ۶)

اس کے علاوہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعدد ارشادات ہیں جن میں دغابازوں، استحصال کرنے والوں، اجارہ داروں اور بد دیانت تاجروں کو سچے مسلمانوں کی جماعت سے خارج قرار دیا گیا ہے۔ اسلامی قانون میں ہر اُس کاروباری معاملے کی سختی سے ممانعت کردی گئی ہے اور اُسے قابلِ تنسیخ ٹھہرایا گیا ہے جس میں ناانصافی،

دھوکا یا استحصال شامل ہو۔ اقتصادی اور تجارتی امور سے متعلق اسلامی قوانین کا اصل مقصد فرد کے حقوق کو تحفظ دینا، معاشرے کا استحکام برقرار رکھنا، دُنیائے تجارت کو اعلیٰ اخلاقیات سے روشناس کرانا اور کاروباری معاملات میں اللہ کا قانون نافذ کرنا ہے۔ ان امور میں اسلام کی دلچسپی ایک منطقی اور اصولی بات ہے کیونکہ اسلام محض ایک روحانی فارمولا نہیں بلکہ ایک مکمل نظامِ حیات ہے جس کا تعلق زندگی کے تمام شعبوں سے ہے۔

اسلام مالکان کو مسلسل یہ امر یاد دلاتا ہے کہ وہ محض اللہ کے نائبین ہیں جن کا کام اپنے احوال و اسباب کا انتظام کرنا ہے۔ اسلام میں ایسی کوئی بات نہیں جس میں مسلمان کو دولت کمانے اور جائز اور شُستہ ذرائع سے مادی خوشحالی کے لیے جد و جہد کرنے سے روکا گیا ہو۔ تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ انسان اس دُنیا میں خالی ہاتھ آتا ہے اور یہاں سے خالی ہاتھ ہی جاتا ہے۔ اشیائے دنیا کا اصل اور حقیقی مالک صرف اللہ ہے اور کسی بھی دوسرے مالک کی حیثیت صرف اللہ کے مقرر کردہ امین کی سی ہے۔ یہ امر نہ صرف زندگی کی ایک اٹل حقیقت ہے بلکہ اس کی گہری چھاپ انسان پر پڑتی ہے۔ یہ حقیقت مالک کو اللہ کے راستے میں خرچ کرنے یا اعلیٰ مقاصد کی خاطر اپنا حصہ ادا کرنے کے لیے ہر وقت تیار رکھتی ہے۔ یہ اُسے اپنے معاشرے کی ضروریات کی تکمیل کے لیے اُبھارتی ہے اور اُسے ایک اہم کردار —— ایک مقدس نصب العین عطا کرتی ہے۔ یہ اُسے خود غرضی، لالچ اور ناانصافی کے گڑھے میں گرنے سے بچاتی ہے۔ یہ ہے اسلام میں جائداد یا ملکیت کا صحیح تصور اور مالکان کی اصل حیثیت۔ قرآن مجید دولت کی ملکیت کو ایک کڑی آزمائش سے تعبیر کرتا ہے۔ اسے پارسائی، فضیلت، استحقاق یا شرافت کی علامت قرار نہیں دیتا نہ اسے دوسروں کے استحصال کا ذریعہ بنانے کی اجازت دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

"وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا، اور تم میں سے بعض کو بعض

کے مقابلہ میں زیادہ بلند درجے دیئے، تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اُس میں تمہاری
آزمائش کرے۔ بے شک تمہارا رب سزا دینے میں بھی بہت تیز ہے
اور بہت درگزر کرنے اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔

(سورہ ٦ : آیت ١٦٥)

مزید برآں قرآن میں حضرت موسیٰؑ اور اُن کی قوم کے درمیان ہونے والی دلچسپ
گفتگو کو اس طرح بیان کیا گیا ہے :

موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو، زمین
اللہ کی ہے، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اُس کا وارث بنا دیتا ہے
اور آخری کامیابی انہی کے لیے ہے جو اُس سے ڈرتے ہوئے کام کریں۔
اُس کی قوم کے لوگوں نے کہا: تیرے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے
جاتے تھے اور اب تیرے آنے پر بھی ستائے جا رہے ہیں۔ اُس نے
جواب دیا: قریب ہے وہ وقت کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے
اور تم کو زمین میں خلیفہ بنائے، پھر دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔

(سورہ ٧ : آیات ١٢٨ تا ١٢٩)

حضرت موسیٰؑ اور اُن کی قوم کے درمیان ہونے والی اس گفتگو کا کسی طرح بھی یہ مطلب
نہیں نکلتا کہ خاندانی یا نسلی بنیاد پر انسان کے کسی طبقے کو افضل و اعلیٰ تسلیم کر لیا گیا ہے نہ
اس کا یہ مطلب ہے کہ قرآن بعد کی صدیوں میں حضرت موسیٰؑ کے پیروکاروں کے اطوار اور
اُن کے نظریات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ قرآنِ مجید کے متن کا لہجہ شک کرنے
والوں کے لیے ملامت آمیز اور ناقدانہ ہے اور یہ حقیقت ذہن نشین کرانے کی کوشش کی
گئی ہے کہ دنیا کی ہر چیز اللہ کی ملکیت ہے۔ وہ دنیاوی اشیا موروثی امانت کی شکل میں یا
آزمائش کے طور پر اپنے بندوں میں تقسیم کرتا ہے۔ یہ نکتہ قرآن میں بار بار سمجھایا گیا ہے۔

مثال کے طور پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

> وہی زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے اور تمام معاملات فیصلے کے لیے اُسی کی طرف رجوع کیے جاتے ہیں .... ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسولؐ پر اور خرچ کرو اُن چیزوں میں سے جن پر اُس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے ۔ جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں گے اور مال خرچ کریں گے اُن کے لیے بڑا اجر ہے ..... آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے حالانکہ زمین اور آسمانوں کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے ۔
>
> (سورہ ۵۷ : آیات ۵ ، ۷ ، ۱۰)

اسلام کا نظریۂ حکومت کمیونزم سے یکسر مختلف ہے ۔ اسلام کمیونسٹ ریاست کی اجتماعی مصنوعی حاکمیت کی بجائے اللہ کی فیض رساں حاکمیت قائم کرتا ہے اور کمیونزم کے طبقاتی کشمکش کے نظریے کی جگہ ٹھوس اخلاقی اصولوں ، باہمی ذمہ داریوں اور تعاون کی فضا کو جنم دیتا ہے ۔ دوسری طرف یہ مالکان کی حریصانہ سرمایہ داری اور ظالمانہ استحصال کے خلاف بھی ضمانت مہیا کرتا ہے ۔ اسلام کا اقتصادی نظام فرد کے خود مختارانہ تشخص اور کام کرنے اور ملکیت رکھنے کی فطری امنگوں کو تسلیم کرتا ہے لیکن اُسے اللہ یا کائنات سے کلیتہً آزاد تصور نہیں کرتا ۔ یہ انسان کو یا اُس کے سرمائے کو معبود نہیں بناتا نہ یہ محنت کش طبقے کو لائقِ پرستش ٹھہراتا ہے اور نہ آزادانہ کاروبار کی ممانعت کرتا ہے ۔ یہ انسان کو اُسی انداز میں قبول کرتا ہے جس انداز میں اُس کی تخلیق ہوئی ہے اور اُسی لحاظ سے اُس سے برتاؤ کرتا ہے ۔ یہ اُس کی فطری امنگوں اور محدود اختیارات کا پورا پورا خیال رکھتا ہے ۔ انسان آخر انسان ہے اور اُس کے ساتھ انسان ہی کی حیثیت میں برتاؤ کیا جانا چاہیے ۔ وہ کوئی دیوتا نہیں ہے کہ لامحدود اختیارات اور بے گناہی کا دعویٰ کرے جسے چیلنج بھی نہ کیا جا سکے نہ اُس کا وجود اتنا غیر اہم ہے کہ وہ کسی شمار میں نہ آ سکے ۔ انسان ایک ایسی ذات ہے جسے تسلیم کیا جانا

چاہیے اور اُسے اُس کا حقیقی مقام دیا جانا چاہیے۔ فطری طور پر وہ جو کچھ بھی ہے اس میں مبالغہ یا قصہ سے کام نہیں لینا چاہیے۔ وہ باقی کائنات سے الگ یا اس سے ماورا نہیں ہے بلکہ پورے کائناتی نظام کا ایک جزو ہے۔ کائنات کی عمومی ساخت کا ایک عنصر ہے۔

اگرچہ اپنی مرضی کا پیشہ اختیار کرنے میں انسان کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے، اُسے اپنی مرضی کا کاروبار کرنے میں مکمل آزادی حاصل ہے، اُسے کمانے اور جائداد رکھنے کا حق دیا گیا ہے اس کے باوجود اُس کی حیثیت چونکہ ایک امین کی سی ہے اسی لیے اسلام میں ایسے اقدامات کی گنجائش موجود ہے جن کے ذریعے اموال یعنی امانتوں کے صحیح استعمال کو یقینی بنایا جا سکے۔ انسان کو دولت کمانے، سرمایہ کاری کرنے اور خرچ کرنے کا پورا اختیار دیا گیا ہے تاہم ایسا کرنے میں اُس کی رہنمائی کے لیے اعلیٰ اصول بنا دیے گئے ہیں تاکہ وہ گمراہی سے بچا رہے۔ مثال کے طور پر مالکان اپنی من مانی سے دولت خرچ کرنے میں اور جائداد کے معاملات طے کرنے میں مکمل طور پر آزاد نہیں ہیں۔ اسلام نے خرچ کرنے کے کچھ ضوابط وضع کر دیے ہیں جن کی پابندی اُن کے لیے لازمی ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ میں اللہ مالکان کو حکم دیتا ہے کہ وہ اپنے دوسرے ساتھیوں سے متعلق اپنی مالی ذمہ داریاں پوری کرے اور اپنے نجی اخراجات میں احتیاط سے کام لے۔ اُسے یہ حقیقت مسلسل یاد دلائی گئی ہے کہ اللہ ہی حقیقی رازق اور اصل مالک ہے۔ قرآن مجید کا فرمان ہے:

> رشتہ دار کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو اُس کا حق۔ فضول خرچی نہ کرو۔ فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔ نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھو اور نہ اُسے بالکل ہی کھلا چھوڑ دو کہ ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ۔ تیرا رب جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور

انہیں دیکھ رہا ہے۔

(سورہ ۱۷ : آیات ۲۶ تا ۲۷ ، ۲۹ تا ۳۰)

سیاسی زندگی

معاشرتی اور اقتصادی زندگی کی طرح اسلام میں سیاسی زندگی کی بنیاد بھی ٹھوس؛ روحانی اور اخلاقی اصولوں پر رکھی گئی ہے اور آسمانی ہدایات سے اس کی رہنمائی کی گئی ہے۔ اسلام کا سیاسی نظام اپنی ساخت، اپنے عمل اور اپنے مقصد میں دوسرے تمام نظاموں سے منفرد ہے۔ یہ نہ تو بے جا مداخلت کرتا ہے نہ معاونت۔ یہ مُلّائیت نہیں ہے جس میں معاشرے کے ایک خاص طبقے کو موروثی طور پر یا کسی اور طریقے سے آسمانی حقوق حاصل ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو دوسرے شہریوں سے بالاتر اور جواب دہی سے بری الذمہ سمجھنے لگتا ہے۔ نہ یہ پرولتاری نظام ہے جس میں جذبۂ انتقام سے سرشار محنت کش طبقہ اقتدار پر قبضہ کر لیتا ہے۔ یہ اپنے عام معنوں میں جمہوریت بھی نہیں ہے۔ یہ ان سب نظاموں سے مختلف ہے۔ اسلام کا سیاسی نقطۂ نظر سمجھنے کے لیے صرف یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ اس کی بنیاد حسبِ ذیل اصولوں پر رکھی گئی ہے۔

۱۔ مسلم فرد یا گروہ کا ہر فعل اللہ کے قانون یعنی قرآن مجید کے تابع ہونا چاہیے۔ قرآن ایک ایسا دستور ہے جو خود اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کے لیے منتخب کیا ہے اور اگر ان میں سے کچھ لوگ یا گروہ اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ثالثی کرنے یا حکومت کرنے سے انحراف کرتے ہیں تو وہ لوگ منکرین میں سے ہیں...... وہ غلط کار ہیں ..... باغی ہیں۔ (قرآن کا سورہ ۵ : آیات ۴۷ تا ۵۰) حقیقت یہ ہے کہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھی ہے۔ (سورہ ۱۷ : آیت ۹)

۲۔ اسلامی ریاست میں اقتدارِ اعلیٰ حاکم کے پاس نہیں ہوتا اور نہ یہ عوام ہی کے پاس ہوتا ہے۔ اقتدارِ اعلیٰ صرف اللہ کے پاس ہوتا ہے اور لوگ مجموعی طور پر اُس کا قانون اور اُس کی مشیئت نافذ کرنے کے لیے اقتدارِ اعلیٰ کا استعمال اللہ کی دی ہوئی امانت کے طور پر کرتے ہیں۔ حاکم خواہ وہ کوئی بھی ہو، محض ایک قائم مقام عامل ہوتا ہے جسے لوگ اس لیے منتخب کرتے ہیں کہ وہ اللہ کے قانون کے مطابق اُن کی خدمات بجا لائے گا۔ یہ ہے اسلامی ریاست کی بنیاد جو کائنات کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر سے ہم آہنگ ہے یعنی اللہ ہی اس کائنات کا خالق ہے اور وہی اس کا واحد مقتدرِ اعلیٰ ہے۔ قرآن مجید میں اسی موضوع کی متعدد آیات ملتی ہیں جن میں اس قسم کا مفہوم پایا جاتا ہے کہ حاکمیت، طاقت اور اقتدارِ اعلیٰ صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔

> نہایت بزرگ و برتر ہے وہ جس کے ہاتھ میں (کائنات کی) سلطنت ہے، اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ (سورہ ۶۷: آیت ۱) یا
>
> مسلمانو، اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت کے سپرد کرو، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو، اللہ تم کو نہایت عمدہ نصیحت کرتا ہے۔" (سورہ ۴: آیت ۵۸) یا
>
> اللہ تو زمین اور آسمانوں کا اور اُن سب چیزوں کا مالک ہے جو زمین اور آسمانوں کے درمیان پائی جاتی ہیں، اور اُسی کی طرف سب کو جانا ہے۔
>
> (سورہ ۵: ۱۷، ۱۸)

۳۔ اسلامی ریاست کا مقصد اللہ کے دستور یعنی قرآن مجید میں درج قوانین کے مطابق انصاف قائم کرنا اور بلا لحاظ رنگ، نسل و عقیدہ تمام شہریوں کو سلامتی و تحفظ فراہم کرنا ہے۔ مذہبی اور نسلی اقلیتوں کا سوال اُس وقت تک نہیں اٹھتا جب تک وہ قانون کے پابند رہتے ہیں اور پُرامن شہریوں کی حیثیت سے زندگی گزارتے ہیں۔

ارشادِ قرآنی ہے:

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس سے پوری طرح باخبر ہے۔ (سورہ ۵، آیت : ۸، سورہ ۴، آیت ۱۳۵)

یقیناً اللہ مدافعت کرتا ہے ان لوگوں کی طرف سے جو ایمان لائے ہیں ...... یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے۔ اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ (سورہ ۲۲ : آیات ۳۸ تا ۴۱)

۴۔ اوپر بیان کیے گئے مقاصد اور اللہ کا قانون نافذ کرنے کے لیے قائم کی جانے والی اسلامی ریاست کا کنٹرول کسی غیر اسلامی پلیٹ فارم پر منظم ہونے والی سیاسی جماعت کو نہیں دیا جا سکتا یا اُسے بیرونی طاقتوں کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ سیاسی ریاست کے لیے ضروری ہے کہ وہ مکمل طور پر خود مختار اور آزاد ہو تاکہ وہ اللہ کے قائم مقام کی حیثیت سے اور اُس کے مقصد کے فروغ کے لیے اپنے اختیارات استعمال کر سکے۔ یہ امر اس اصول پر مبنی ہے کہ مسلمان صرف اللہ کے تابع ہے اور اُسی کے قانون کی پیروی کرنے کا عہد کرتا ہے۔ وہ اللہ کا قانون نافذ کرنے والوں اور اُس کی ہدایات پر عمل کرنے والوں کو اپنا بھرپور تعاون اور حمایت پیش کرتا ہے۔ اس لیے یہ امر اسلام سے مطابقت نہیں رکھتا کہ ایک مسلمان قوم کسی غیر اسلامی پلیٹ فارم پر منظم ہونے والی سیاسی جماعت کی حمایت کا عہد کرے یا اجنبی نظریات و مقاصد کی بنیاد پر قائم ہونے والی غیر اسلامی حکومت کے آگے جھکے۔ اللہ ہرگز ایسا نہیں ہونے دے

تاکہ کفر کرنے والے ایمان لانے والوں پر غالب آجائیں۔ ایمان لانے والوں کو جب اللہ اور اُس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ اللہ اُن کے درمیان فیصلہ یا حکم جاری کرے تو اُن کا جواب یہی ہوتا ہے: ہم نے سُنا اور اطاعت کی........

(سورہ ۲۴ : آیت ۵۱)

اللہ نے وعدہ فرمایا ہے کہ تم میں سے اُن لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ اُن کو اُسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح اُن سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے، اُن کے لیے اُن کے اس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا جسے اللہ تعالیٰ نے اُن کے حق میں پسند کیا ہے، اور اُن کی (موجودہ) حالتِ خوف کو امن سے بدل دے گا، بس وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ (سورہ ۲۴ : آیت ۵۵)

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول ہی غالب ہو کر رہیں گے۔ فی الواقع اللہ زبردست اور زور آور ہے۔ تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ اُن لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنہوں نے اللہ اور اُس کے رسول کی مخالفت کی ہے، خواہ وہ اُن کے باپ ہوں، یا اُن کے بیٹے، یا اُن کے بھائی یا اُن کے اہلِ خاندان۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح عطا کر کے ان کو قوت بخشی ہے۔ (سورہ ۵۸ : آیات ۲۱ تا ۲۲)

۵۔ اسلام میں حاکم، خواہ وہ کوئی بھی ہو، لوگوں پر مقتدرِ اعلیٰ نہیں ہوتا۔ وہ لوگوں کا منتخب کردہ ایک نمائندہ ملازم ہوتا ہے اور وہ اپنے تمام اختیارات قانونِ الٰہی کی پیروی سے حاصل کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا قانون ہے جو ایک مقدس معاہدے کے ذریعے

حاکم اور محکوم کو مساوی طور پر پابند کرتا ہے اور خود اللہ اس معاہدے کا نگران ہوتا ہے۔
اسلام کا سیاسی معاہدہ صرف انتظامیہ اور عوام کے درمیان ہی طے نہیں پاتا بلکہ یہ ایک طرف حاکم و محکوم کے درمیان اور دوسری طرف حاکم و محکوم اور اللہ کے درمیان طے پاتا ہے اور یہ اخلاقاً صرف اُس وقت تک درست اور قابلِ عمل ہے جب تک حاکم و محکوم ہر دو اللہ کی طرف سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں کی تکمیل کرتے ہیں۔ وہ حکمران جنہیں لوگ اللہ کا قانون نافذ کرنے کے لیے منتخب کرتے ہیں وہ صرف اُس وقت تک عوام کی حمایت اور تعاون کے مستحق ہیں جب تک وہ اللہ کی ہدایات پر عمل پیرا ہیں۔ اگر معاشرہ یا اس کا کوئی رکن ایسے منتظمین کو اپنا تعاون اور حمایت پیش نہیں کرتا تو اُس کا یہ عمل انتظامیہ اور اللہ کے خلاف ایک غیر ذمہ دارانہ جرم تصور کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر انتظامیہ اللہ کے راستے سے ہٹ جاتی ہے یا اُس کے قانون سے انحراف کرتی ہے تو یہ نہ صرف ویسا ہی جُرم ہے بلکہ وہ عوام کی حمایت اور اطاعت کے حق سے بھی محروم ہو جاتی ہے۔ ارشادِ قرآنی ہے:

> اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اُسے اللہ اور رسولؐ کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریقِ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔ (سورہ ۴: آیت ۵۹)

عوام کے لیے حاکم کی اطاعت اس بات سے مشروط ہے کہ وہ خود اللہ کے قانون اور اُس کے رسولؐ کی قائم کردہ روایات کی اطاعت کرے۔ ارشادِ نبوی ہے کہ جو شخص خواہ وہ حاکم ہو یا محکوم اگر اللہ کی اطاعت اور اُس کے قانون کا اتباع نہیں کرتا تو اُس کی اطاعت یا اتباع ہرگز نہ کرو۔ رسولؐ اللہ کے ابتدائی جانشین اس اصول کو

خوب سمجھتے تھے اور اپنی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے اعلان کر دیتے تھے کہ لوگ صرف اُس وقت تک اُن کی اطاعت اور مدد کریں جب تک وہ خود (رسول اللہ کے جانشین، اللہ کی اطاعت کرتے رہیں۔ اور اگر وہ اللہ کے بتائے ہوئے راستے سے منحرف ہو جائیں تو لوگوں پر اُن کی اطاعت واجب نہیں۔

۶۔ حکام اور منتظمین کا انتخاب بہترین شہریوں میں سے اُن کی نیکی، موزونیت اور اہلیت کی بنیاد پر کیا جانا ضروری ہے۔ حسب نسب، خاندانی وقار یا اقتصادی مرتبہ بذاتِ خود ایسی صفات نہیں ہیں جن کی بنا پر کسی امیدوار کو اعلیٰ سرکاری عہدے کے لیے کم یا زیادہ اہل قرار دیا جائے۔ یہ صفات کسی فرد کے استحقاق کو نہ تو تقویت پہنچاتی ہیں نہ اس میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ ہر امیدوار کے بارے میں اندازہ لگاتے وقت اُس کی اپنی خوبیوں کو مدِنظر رکھنا ضروری ہے جن میں خاندانی وقار، دولت، نسل اور عمر جیسے کوائف کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ امیدواروں کو عام انتخابات کے ذریعے رائے عامہ کی بنیاد پر چُنا جا سکتا ہے یا عوامی نمائندے انہیں منتخب کر سکتے ہیں جس کے بعد معاشرے کے مختلف طبقات کے آزادانہ اتفاقِ رائے سے لیڈرشپ اُن کے حوالے کی جا سکتی ہے۔ اس طرح ایک اسلامی ریاست میں نمائندہ کونسلوں اور میونسپل حکومتوں کی تعداد ضرورت کے مطابق کم یا زیادہ ہو سکتی ہے۔ انتخاب یا نامزدگی کا یہ حق اور انتظامیہ کا یہ رویہ مجموعی طور پر معاشرے کے بہترین مفاد میں ہونا چاہیے۔ رسول اللہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ارشاد ہے:

"جو کوئی کسی شخص کو قومی عہدہ سونپتا ہے حالانکہ معاشرے میں اس عہدے کے لیے اُس سے بہتر آدمی موجود تھا تو وہ (عہدہ سونپنے والا) اللہ اور اُس کے رسولؐ اور مسلمانوں کی امانت میں خیانت کا مرتکب ہوا۔"

سیاسی معنوں میں اس کا مطلب ہے کہ رائے دہندگان اخلاقی لحاظ سے قومی

معاملات سے لاتعلق نہیں رہ سکتے۔ نیز وہ جب بھی ووٹ ڈالیں تو انہیں چاہیے کہ وہ محتاط چھان بین کے بعد اور اچھی طرح سوچ سمجھ کر اپنے ووٹ کا استعمال کریں۔ اس طریقہ سے ریاست اپنی سلامتی اور ذمہ دارانہ شہریت کا امکانی حد تک بہترین تحفظ حاصل کر سکتی ہے جس کا بہت سی جدید جمہوری ریاستوں میں فقدان ہے۔

۷۔ عام انتخابات یا حکمران کی جانب سے نامزدگی کے طریقۂ کار کے مطابق منتظمین چُن لیے جائیں تو ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ انتظامیہ کے رویّے کی نگرانی کرے اور قومی امور کی انجام دہی میں اگر اُسے کوئی سقم نظر آئے تو فوراً اعتراض کرے۔ اگر انتظامیہ اللہ اور قوم کی امانت میں خیانت کی مرتکب ہو تو اُسے عہدے پر قائم رہنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اس صورت میں ضروری ہو جاتا ہے کہ اُسے نکال باہر کیا جائے اور یہ منصب کسی اور کو تفویض کر دیا جائے۔ یہ دیکھنا ہر شہری کا فرض ہے کہ ایسی تبدیلی قوم کے مفاد میں کی جائے چنانچہ موروثی اقتدار اور تاحیات نامزدگی کا اطلاق اسلامی ریاست پر نہیں ہوتا۔

۸۔ اگرچہ حکمرانوں کا انتخاب اور اُس کا تقرر لوگ کرتے ہیں لیکن حکمران سب سے پہلے اللہ کے سامنے اور اُس کے بعد لوگوں کے آگے جواب دہ ہے۔ اُس کا عہدہ محض ملازمتی نوعیت کا نہیں ہے نہ اُس کا کردار محض خیالی ہی ہے۔ وہ ایک بے اختیار کٹھ پتلی نہیں ہے جس کا کام صرف کاغذات پر دستخط ثبت کرنا یا ہمیشہ لوگوں کی اچھی بُری خواہش کی تکمیل کرنا ہو۔ اُس کے لیے لازم ہے کہ وہ لوگوں کی خاطر اُن کے بہترین مفاد میں اور اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق اپنے حقیقی اختیارات کا استعمال کرے۔ ایک طرف وہ اپنے طرزِ عمل کے لیے اللہ کے سامنے اور دوسری طرف لوگوں کے سامنے جواب دہ ہے جنہوں نے اس پر اعتماد کا اظہار کیا ہے اُسے اللہ کے آگے پورا حساب دینا ہوگا کہ اُس نے براہِ راست لوگوں کے ساتھ اور اُن کے نمائندوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا۔

لیکن حکمران اور عوام دونوں کو بھی اللہ کے سامنے پورا حساب دینا ہوگا کہ انھوں نے قرآن
کے بارے میں کیا رویّہ اختیار کیا اور اللہ کے قانون کا جس کی پیروی اُن کے لیے لازمہ
تھی کس حد تک لحاظ رکھا۔ چونکہ وہ لوگوں کے سامنے جواب دہ ہے اس لیے اُسے
چاہیے کہ اُن کے معاملات اُن کے بہترین مفاد میں سرانجام دے اور چونکہ وہ اللہ تعالیٰ
کے سامنے بھی جواب دہ ہے اس لیے اُس کا ہر فعل اللہ کے قانون کے مطابق ہونا
چاہیے۔ اس طرح اسلام کا نظام بنیادی طور پر دوسرے تمام معروف سیاسی نظاموں
اور نظریات سے مختلف ہے۔ اسلامی حکمران کا کام صرف اپنی خواہشات کے مطابق
لوگوں پر حکومت کرنا نہیں بلکہ اُن کی خدمت کرنا ہے اور یہ خدمت عدل و انصاف
قائم کر کے، لوگوں کو خالق کائنات کا اطاعت گزار بنا کر اور خصوصی اخلاقی اصولوں کو حکومت
کی مقدس ذمہ داری سمجھ کر سرانجام دی جا سکتی ہے۔

۵۔ اگرچہ قرآن ہی اسلامی ریاست کا آئین ہے تاہم مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ
اپنے مشترکہ امور باہمی صلاح مشورے سے طے کریں۔ اس حکم کے تحت مقامی، قومی
اور بین الاقوامی سطح پر قانونی کونسلوں اور مشاورتی اداروں کے قیام کی گنجائش نکل آتی ہے۔
اسلامی ریاست میں ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ عام امور پر اپنی بہترین رائے پیش کرے
اور اُسے ایسا کرنے کا حق ضرور حاصل ہونا چاہیے۔ اس فرض کی انجام دہی کو قابل عمل
اور اس کی افادیت کو یقینی بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ارباب اختیار ریاست
کے ہنرمند اور تجربہ کار لوگوں سے رائے حاصل کریں۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں
کہ عام شہریوں کو رائے زنی کے حق سے محروم کر دیا جائے بلکہ جب بھی ضرورت ہو
انہیں اپنی رائے کا اظہار ضرور کرنا چاہیے۔

اس طرح اسلامی ریاست کے ہر شہری پر کسی نہ کسی حیثیت میں قومی امور سے

متعلق ذمہ داری عائد ہوتی ہے جسے وہ بلا واسطہ یا بالواسطہ طور پر نبھاتا ہے۔ اسلامی تاریخ میں ایسے مستند واقعات موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کا بڑے سے بڑا حکمران یا خلیفہ کسی معاملے میں عام لوگوں سے نظریں نہیں چُرا سکتا تھا۔ مرد اور خواتین مساوی طور پر اپنے حکمرانوں کے کسی فعل پر اعتراض کر سکتے تھے۔ وہ اُن سے وضاحت طلب کرتے تھے، انہیں مشورے دیتے تھے اور اُن کی اصلاح کیا کرتے تھے۔ اسلام میں باہمی صلاح مشورے کا اصول اتنی بنیادی حیثیت رکھتا ہے کہ محض رسمی طور پر اظہارِ خیال کر دینے سے اُس کی ذمہ داری پوری نہیں ہوتی بلکہ اُس کے لیے ضروری ہے کہ وہ معاشرے میں بہترین مفاد کے لیے اپنی رائے کا اظہار نہایت پُرخلوص اور موثر ترین انداز میں کرے۔ سیاسیات میں یا کسی اور شعبے میں مشاورتی طریقۂ کار حکومت کا صرف جمہوری فارمولا ہی نہیں بلکہ یہ ایک مذہبی حکم اور اخلاقی فریضہ ہے جس کا اطلاق حکمرانوں اور رعایا دونوں پر ہوتا ہے۔ رسول اللہؐ نے اس پر ہمیشہ عمل کیا اور نیک مشاورت کو دین کا ایک لازمی جزو قرار دیا۔ اس قسم کی مشاورت کا مقصد اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ اللہ کے قانون پر عمل ہو رہا ہے نیز شہریوں کے حقوق کا احترام کیا جا رہا ہے اور وہ اپنی ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں۔ پیشہ ورانہ سیاست کو روکنے اور موقع پرست سیاست دانوں کی زیرِ زمین سرگرمیوں کے قلع قمع کے لیے رسولؐ اللہ نے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت پر بات کرتے ہوئے فرمایا کہ تم میں سے کوئی بھی شخص جب بات کرے خواہ یہ بات مشورے کی غرض سے کی جائے یا کسی اور مقصد کے لیے، اُس کے لیے لازم ہے کہ وہ صحیح اور اچھی باتیں کرے اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو اُس کے لیے بہتر ہے کہ خاموش رہے۔ اس ارشادِ نبویؐ میں مشورہ اور رائے دینے والوں کو خود غرضانہ میلانات اور خود پرستانہ خواہشات سے متنبہ کیا گیا ہے اور یوں اس بات کی ضمانت فراہم کر دی گئی ہے کہ مشورہ جب بھی

دیا جائے پوری نیک نیتی سے اور لوگوں کے بہترین مفاد میں دیا جائے کیوں کہ مشاورت ایک ایسا فعل ہے جس کا اختیار خود اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، یہ اُسی کی جانب سے سرانجام دیا جاتا ہے اور اس کا مقصد عام لوگوں کی فلاح و بہبود ہے۔ حکمران کا مشورہ طلب کرنا اور لوگوں کا مشورہ دینا کوئی اپنی پسند کا معاملہ یا رضاکارانہ اقدام نہیں ہے بلکہ یہ ایمان کی شرط اور مذہبی فریضہ ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ صاحبِ فہم و فراست، معصوم اور بے غرضانہ شخصیت کے مالک تھے، اس کے باوجود آپؐ اس اصول سے بالا یا اس حکم سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو حکم دیتا ہے:

(اے پیغمبر) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم اُن لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تند خُو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب تمہارے گردو پیش سے چھٹ جاتے۔ ان کے قصور معاف کر دو، ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو، اور دین کے کام میں ان کو بھی شریکِ مشورہ رکھو، پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسا کرو۔

(سورہ ۳، آیت ۱۵۹)

اہلِ ایمان کے خصائص کا ذکر کرتے ہوئے قرآن مجید باہمی مشاورت کو بڑے واضح الفاظ میں ایمان کی شرط قرار دیتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

جو کچھ بھی تم لوگوں کو دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی چند روزہ زندگی کا سر و سامان ہے، اور جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی۔ وہ ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں؛ جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور اگر غصہ آجائے تو درگزر کر جاتے ہیں، جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں، ہم نے جو کچھ بھی

رزق انہیں دیا ہے اُس میں سے خرچ کرتے ہیں، اور جب اُن پر زیادتی کی جاتی ہے تو اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ (سورہ ۴۲: آیات ۳۶ تا ۳۹)

۱۰۔ اسلام کے سیاسی نظام میں ہر شہری کو عقیدہ وضمیر کی اور فکر واظہار کی مکمل آزادی حاصل ہے۔ وہ اپنی صلاحیتوں کو ترقی دینے اور اپنی حالت کو بہتر بنانے، کام کرنے اور دوسروں سے سبقت لے جانے، دولت کمانے اور جائداد بنانے اور اپنے دیانتدارانہ فیصلے سے اشیاء کو پسند اور ناپسند کرنے میں آزاد ہے۔ لیکن اُس کی یہ آزادی غیر مشروط نہیں اور نہ یہ غیر مشروط ہو سکتی ہے کیونکہ اس صورت میں یہ ابتری اور انتشار کا باعث بنے گی۔ اس آزادی کی ضمانت اللہ کے قانون میں دی گئی ہے اور یہی قانون اس کا نگران اور منتظم بھی ہے۔ جب تک یہ آزادی اس قانون کے مطابق ہے۔ یہ ہر شہری کا ایک جائز حق ہے، لیکن اگر یہ اللہ کے قانون کے حدود سے تجاوز کرتی ہے یا مفادِ عام سے متصادم ہوتی ہے تو اس سے قانون کی خلاف ورزی ہوگی۔ چنانچہ اسے نظم وضبط میں لانا ضروری ہوگا۔ فرد اس پوری کائنات کا ایک جزو ہے۔ چنانچہ اُس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود کو اللہ کے بنائے ہوئے قانون اور ضابطے کے مطابق ڈھالے کیونکہ یہی قانون پوری کائنات کے نظام کو چلا رہا ہے۔ دوسری طرف فرد اپنے معاشرے یا قوم کا رکن بھی ہے۔ اس لیے اُسے اپنے حقوق اور مفادات کو دوسروں کے حقوق اور مفادات سے ہم آہنگ رکھنا چاہیے تاکہ فرد اور معاشرہ دونوں کے حقوق ومفادات کی حفاظت ہو سکے۔ اگر کوئی فرد کسی خاص قومی مسئلے میں آزادانہ رویّہ اختیار کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ قوم کی اکثریت اس سے مختلف رویّہ اختیار کیے ہوئے ہے تو قومی استحکام اور تعاون کو برقرار رکھنے کے لیے اُسے بالآخر اکثریت ہی کا ساتھ دینا چاہیے بشرطیکہ اکثریت کا فیصلہ اللہ کے قانون کے منافی نہ ہو۔ تاہم رائے عامہ ہموار کرنے کے عمل میں اُسے بلا روک ٹوک اپنی رائے کا اظہار کرنے اور دوسروں کو اپنے نظریات

کا قائل کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ جب اُس پر واضح ہو جائے کہ اکثریت نے دوسرا راستہ اختیار کر لیا ہے تو پھر اُس کے لیے اکثریت کا ساتھ دینا ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ وہ معاملہ اب انفرادی سوچ بچار کا نہیں رہا بلکہ قومی سطح پر عمل درآمد کے مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔ (حوالے کے لیے دیکھیے قرآن کا سورہ ۳: آیات ۱۰۲ تا ۱۰۵، سورہ ۸: آیت ۴۶)

۱۱۔ اسلامی ریاست کی حکومت ایک قومی امانت ہے جو اللہ کی جانب سے اور لوگوں کی مشترکہ رضامندی کے ذریعے منتظمین کو سونپی جاتی ہے۔ ریاست کا مقتدرِ اعلیٰ چونکہ اللہ ہے اس لیے جو شخص سب سے اعلیٰ عہدے پر فائز ہو کر اُس کی نمائندگی کرتا ہے اُس کے لیے ضروری ہے کہ وہ امانت سونپنے والے حاکم کا وفادار ہو یعنی اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہو۔ اسلامی ریاست کی اکثریت چونکہ مسلمانوں پر مشتمل ہوتی ہے اس لیے جو شخص صدارت یا خلافت کے عہدے پر متمکن ہو اُس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک سچا مسلمان ہو۔ ان اقدامات کا مقصد مشترکہ مفاد کو فروغ دینا اور اللہ اور شہریوں کی طرف سے عائد ہونے والی ریاستی ذمہ داریوں کی تکمیل کرنا ہے۔ اس کے علاوہ یہ اقدامات اس لیے بھی ضروری ہیں کہ مذہبی اور نسلی اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ اور احترام ہو سکے۔

عالمِ انسانیت کے لیے یہ ایک بدقسمتی کی بات ہے کہ اسلام کے اس حکم کو اچھی طرح سمجھا نہیں گیا اور اس کے مفہوم کو بُری طرح مسخ کر دیا گیا ہے۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ اس حکم کے ذریعے اقلیتوں کے خلاف کوئی امتیاز نہیں برتا گیا بلکہ اُن کے حقوق کی حفاظت اور توثیق کی گئی ہے۔ جو شخص قانون کا پابند رہ کر اسلامی ریاست کا شہری بننا چاہے اُسے بخوشی قبول کر لیا جاتا ہے اور وہ دوسروں کی طرح ذمہ دارانہ شہریت کے فرائض اور مراعات میں شریک ہو جاتا ہے۔ غیر مسلم ہونے سے اُس کی حیثیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی نہ وہ دوسرے درجے کا شہری متصور ہوتا ہے

بشرطیکہ وہ ریاست کے عام قانون کا پابند رہے اور اپنے حقوق کا استعمال ذمہ دارانہ طریقے سے کرے۔ مثال کے طور پر ریاست کے اخراجات پورے کرنے اور اس کے عوض اپنے تحفظ اور بہبود کے لیے اگر وہ مسلمان شہریوں کی طرح مذہبی ٹیکس (زکوٰۃ) اور حکومت کے دوسرے ٹیکس ادا کرنا چاہتا ہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ سمجھتا ہے کہ غیر مسلم ہونے کی حیثیت میں اسلامی ٹیکس (زکوٰۃ) کی ادائی سے اُس کے وقار کو دھچکا لگتا ہے یا اُس کے احساسات مجروح ہوتے ہیں تو وہ اپنے ٹیکس ایک مختلف شکل میں یعنی "خراج" یا "جزیہ" کے طور پر ادا کر سکتا ہے۔ درحقیقت اُس کے پاس ایک ایسا حقِ انتخاب ہے جو اُسی ریاست کے مسلمان شہریوں کو بھی حاصل نہیں۔ ریاست کو اپنا حصّہ ادا کرنے کے بدلے اُسے ریاست کے حکام اور شہریوں کی جانب سے تحفظ اور سلامتی کی ضمانت مل جاتی ہے۔

اسی طرح اگر کوئی شہری اپنی شخصی یا نجی زندگی مثلاً شادی، طلاق، خوراک، وراثت وغیرہ سے متعلق امور اسلامی قوانین کے مطابق نمٹانا چاہتا ہے تو اُس کی خواہش کا احترام اور اُس کے حقوق کو تسلیم کیا جانا چاہیے۔ لیکن اگر وہ چاہتا ہے کہ یہ امور اُس کے اپنے مذہب کی تعلیمات کے مطابق انجام پائیں تو وہ ایسا کرنے میں مکمل طور پر آزاد ہے اور اس سلسلے میں اپنے حقوق کے استعمال میں اُسے کوئی نہیں روک سکتا۔ پس شخصی یا جذباتی معاملات میں وہ چاہے تو اپنے مذہب کی تعلیمات سے یا چاہے تو حکومتی قوانین سے رجوع کر سکتا ہے۔ لیکن مفادِ عامّہ کے معاملات یا عام امور کی صورت میں اُس کے لیے ریاست کے قوانین یا دوسرے لفظوں میں اللہ کے قانون کی پابندی کرنا ضروری ہے۔ شخصی اُمور کے بارے میں اُس کا انتخاب خواہ کچھ بھی ہو، یعنی وہ اپنے شخصی امور خواہ اپنے مذہب کی تعلیمات کے مطابق نمٹانا چاہتا ہو خواہ حکومت کے قوانین کے مطابق، ان دونوں صورتوں میں اُسے دوسرے شہریوں کے

مساوی تحفظ اور سلامتی کا حق حاصل ہوگا۔ یہ سب کچھ کسی آسمانی سلطنت کا خواب نہیں ہے جو ابھی پورا ہونا ہے بلکہ یہ قرآن کی تعلیم، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اور اسلامی تاریخ کا ریکارڈ ہے۔ مثال کے طور پر ایک روایت ہے کہ رسولُ اللہؐ کے وصال کے بعد مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ حضرت عمرؓ بن خطاب ایک بار ایک مقام سے گزر رہے تھے کہ انہوں نے ایک بوڑھے یہودی کو قابلِ رحم حالت میں دیکھا۔ حضرت عمرؓ نے اس یہودی کے بارے میں تحقیقات کی اور یوں انہیں اپنی ریاست کی صحیح صورتِ حال کا علم ہوا۔ حضرت عمرؓ نے افسوس آمیز لہجہ میں اُس شخص سے کہا: "جب آپ اچھی حالت میں تھے تو ہم نے آپ سے محاصل وصول کیے۔ اب (اس بُری حالت میں) آپ کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا ہے۔ عمرؓ آپ کے ساتھ کس قدر ناانصافی کا مرتکب ہوا ہے" یہ کہنے کے بعد حضرت عمرؓ نے اس بوڑھے شخص کے لیے باقاعدہ پنشن کے احکامات جاری کر دیے اور ان احکامات کو فوری طور پر مؤثر قرار دیا گیا۔ حضرت عمرؓ اور دوسرے اسلامی حکمرانوں نے سیاسی تربیت رسول اللہؐ سے حاصل کی تھی اور رسول اللہؐ نے براہِ راست خدا سے علم حاصل کیا تھا۔ یہ تعلیمات قرآن کی ان آیات اور بہت سی دوسری آیات میں موجود ہیں:

> اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم اُن لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ وہ تمہیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم اُن لوگوں سے دوستی کرو جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے اور تمہارے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔ اُن سے جو لوگ دوستی کریں وہی ظالم ہیں۔ (سورہ ٦٠: آیات ٨ تا ٩)

اسلامی ریاست، جس کے سربراہ کا مسلمان ہونا ضروری ہے، کا موازنہ کسی لادینی ریاست سے کرنا، جس کے سربراہ کا کسی اقلیتی گروہ سے تعلق رکھنا نظریاتی طور پر قابلِ فہم ہے، ایک فاش غلطی ہوگی۔ یہ موازنہ کئی وجوہات کی بنا پر مغالطہ آمیز اور گمراہ کن ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ موازنہ کرنے کا مطلب یہ مفروضہ قائم کرنا ہے کہ لادینیت خواہ یہ کتنی ہی سطحی کیوں نہ ہو، اسلامی نظریہ کے مقابلے میں زیادہ مستحکم ہے۔ ایسا مفروضہ لادینیت کی اہمیت جتانے کے مترادف ہوگا۔ دوسرے یہ کہ اسلامی ریاست کے سربراہ کے فرائض اور حقوق لادینی ریاست کے سربراہ کے حقوق و فرائض سے بالکل مختلف ہیں۔ تیسرے جدید دور کا لادینی جذبہ زیادہ تر تلافی یا عذر خواہانہ بازدہی کے مترادف ہے جس کا اطلاق اسلام پر نہیں ہوتا۔ مزید برآں ایک لادینی ریاست، اگر واقعی ایسی ریاست کا قیام ممکن ہے، کے سربراہ کا تعلق کسی نسلی یا مذہبی اقلیت سے بھی ہو سکتا ہے لیکن اُسے تقریباً ہمیشہ ہی کسی اقلیتی پارٹی میں شامل ہونا پڑتا ہے۔ اس سے ہوتا یہ ہے کہ سیاسی اکثریت کو مذہبی اکثریت کا قائم مقام بنا دیا جاتا ہے جس سے اقلیت کے لیے بمشکل بہتری کا کوئی پہلو نکل سکتا ہے۔ مزید برآں لادینیت کا تمام تر استدلال اس مفروضے پر مبنی ہے کہ ریاست کی سربراہی ایک ایسا استحقاق ہے جس سے کسی شخص کو نوازا جا سکتا ہے یا اس سے محروم رکھا جا سکتا ہے جبکہ اس منصب کی اسلامی حیثیت بالکل مختلف ہے۔ اسلام میں ریاست کی سربراہی ایک اوّلین فریضہ، ایک کڑی آزمائش اور ایک بھاری ذمہ داری ہے۔ چنانچہ اگر اسلام اس قسم کی ذمہ داریاں غیر مسلم افراد پر عائد کر دے تو یہ بات انصاف سے بعید ہوگی۔

بین الاقوامی زندگی

اسلام میں بین الاقوامی زندگی سے مراد کسی اسلامی ریاست یا قوم اور دوسری ریاستوں یا

اقوام کے درمیان معمول کے تعلقات کا تعین ہے۔ اسلامی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کی طرح بین الاقوامی زندگی کے خدوخال بھی آسمانی ہدایت سے تشکیل پاتے ہیں اور یوں مسلمانوں کی زندگی کا یہ پہلو بھی اللہ کی مشیت کے تابع ہے۔ اسلام میں بین الاقوامی زندگی کی بنیاد ان اصولوں پر رکھی گئی ہے۔

۱۔ بنی نوع انسان کی پیدائش، اُس کی انسانی حیثیت اور اُس کے مقصدِ حیات کی وحدت پر غیر متزلزل یقین رکھنا۔ (دیکھیے قرآن کا سورہ ۴ : آیت ۱، سورہ ۷ : آیت ۱۸۹، سورہ ۴۹ : آیت ۱۳)

۲۔ دوسرے لوگوں کے مفادات اور اُن کی جان، مال اور آبرو کے حقوق کا اُس وقت تک احترام کرنا جب تک وہ مسلمانوں کے حقوق میں مداخلتِ بیجا نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں غاصبانہ کارروائیوں، تجاوزات اور ہر قسم کی ناانصافیوں کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ (دیکھئے سورہ ۲ : آیات ۱۹۰ تا ۱۹۳، سورہ ۴۲ : آیت ۴۲)

۳۔ معمول کے تعلقات میں امن و سلامتی کے قیام کے ساتھ ساتھ خیر سگالی کے وفود کا تبادلہ اور انسانیت کی خاطر جس میں تمام لوگ برابر کے حصہ دار ہیں پُرخلوص جدوجہد کرنا۔ (سیاسی زندگی کی بحث پر مشتمل گذشتہ صفحات کا مطالعہ کیجیے اور دیکھیے قرآن کا سورہ ۸ : آیت ۶۱)

۴۔ بین الاقوامی تعلقات میں مداخلتِ بیجا کو برداشت نہ کرنا۔ اگر کوئی شخص اسلامی ریاست کے حقوق کی خلاف ورزی کرتا ہے یا امن و امان میں خلل انداز ہوتا ہے یا ملک کی سلامتی کو خطرے میں ڈالتا ہے یا اُس کی پُرامن پالیسیوں سے ناجائز فائدہ اُٹھاتا ہے تو ریاست کا فرض ہے کہ اپنے دفاع میں غفلت سے کام نہ لے اور اس قسم کی تمام کوششوں کو خاک میں ملا دے۔ صرف ایسے موقع پر اور اس قسم کے حالات میں اسلام جنگ کو

جائز قرار دیتا ہے۔ تاہم اِن حالات میں بھی جنگ کی وسعت کو کم سے کم کرنے اور اسے صرف ناگزیر مدت تک جاری رکھنے کے لیے اسلام نے کچھ اخلاقی اصول بتلائے ہیں جن پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔ اسلام میں جنگ اور امن کا قانون انتہائی منفرد، جامع، ٹھوس اور اعلیٰ اخلاقیات پر مبنی ہے۔ قانون دانوں اور ماہرینِ اخلاقیات کے لیے اس کا بطورِ خاص مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ کتاب اس موضوع کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ تاہم یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اسلام نہ تو جارحانہ جنگ کو ضروری سمجھتا ہے نہ یہ فصلوں، جانوروں، گھروں وغیرہ کی تباہی کو جنگ کا مقصد قرار دیتا ہے۔ جنگ میں شریک نہ ہونے والوں مثلاً عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دیتا نہ یہ جنگی قیدیوں کو اذیت رسانی اور مفتوحین پر اپنی تعلیمات ٹھونسنے کی اجازت دیتا ہے۔ اسلام میں جنگ محض ایک دفاعی اقدام ہے جسے اسلام کے عملی اُصول اُس وقت تک جائز قرار دیتے ہیں جب تک دُنیا میں زیادتی، ناانصافی اور جارحیت موجود ہو۔ (دیکھیے قرآن کا سورہ ۲: آیات ۱۹۰ تا ۱۹۵، سورہ ۲۱۶ تا آیت ۲۱۸، سورہ ۲۲: آیات ۳۹ تا ۴۱، باب پنجم میں جہاد پر بحث بھی ملاحظہ فرمائیں۔)

۵۔ اسلامی ریاست کی ذمہ داریاں نبھانا اور اسلامی ریاست اور دوسری ریاستوں کے درمیان طے پانے والے معاہدوں کا پاس کرنا۔ یہ صرف اُسی صورت میں ضروری ہے جب دوسرے فریق بھی اپنی ذمہ داریاں نبھا رہے ہوں۔ بصورتِ دیگر معاہدوں یا ذمہ داریوں کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ (سورہ ۵: آیت ۱، سورہ ۸: آیات ۵۵ تا ۵۶، ۵۸، سورہ ۹: آیات ۳ تا ۴)

۶۔ اندرونی امن وسلامتی کو برقرار رکھنا اور بین الاقوامی سطح پر باہمی افہام وتفہیم اور عالمی بھائی چارے کی فضا قائم کرنے میں حقیقی کردار ادا کرنا۔

یہ ہیں وہ عناصر جو کسی اسلامی ریاست کی بین الاقوامی زندگی میں رُوح پھونک

دیتے ہیں۔ اسلامی ریاست محض اپنی یا اپنی رعایا کی خاطر ہی اپنا وجود برقرار نہیں رکھتی۔ اس کا دائرہ کار بہت وسیع ہے اور بین الاقوامی شعبے میں اسے ایک اہم کام سرانجام دینا ہوتا ہے۔ اسلام کی رُو سے اسے اپنے شہریوں کے ہر شعبۂ زندگی میں خوشحالی اور ترقی کے لیے جدوجہد کرنا ہوتی ہے اور اسلام ہی کی رُو سے اسے عالمِ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے بھی اہم کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ اسلامی ریاست کے لیے لازم ہے کہ وہ بامروت لوگوں اور ریاستوں کے ساتھ وسیع تر مفہوم میں دوستانہ تعلقات قائم کرے۔ اسلامی ریاست کا فرض ہے کہ عالمِ انسانیت کے مفاد کے تحت بین الاقوامی سطح پر تعلیم، اقتصادیات، صنعت، سیاسیات غرض زندگی کے ہر شعبے میں اپنا اہم کردار ادا کرے۔ اس کردار کی داغ بیل خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈالی جسے آپ پر ایمان لانے والوں نے نسلاً بعد نسلٍ برقرار رکھا۔

پیشتر اس کے کہ یہ باب اپنے اختتام کو پہنچے یہ بتا دینا مناسب ہوگا کہ سطورِ بالا میں جو کچھ مذکور ہوا ہے وہ قرآن اور احادیثِ نبوی میں بیان کردہ اسلام کے ٹھوس، حقیقی اور سچے اصولوں پر مبنی ہے۔ یہی وہ اسلام ہے جس پر رسولؐ اللہ اور آپؐ کے نقشِ قدم پر چلنے والے مسلمانوں نے عمل کیا اور نہایت شاندار مثالیں قائم کیں۔ یہ کسی مخصوص عالمِ دین یا فقیہ یا حکمران کا اسلام نہیں ہے بلکہ راقم الحروف کے عقیدے کے مطابق یہی حقیقی اسلام ہے اور اس سے مراد وہی ہے جو اوپر بیان ہو چکا ہے۔

یہ بات بھی ذہن میں جاگزیں رہنی چاہیے کہ اسلامی نظامِ حیات دوسرے تمام نظاموں اور نظریات سے منفرد اور مختلف ہے۔ اسے آپ کسی بھی زاویۂ نگاہ سے دیکھیں خواہ یہ زاویۂ نگاہ روحانی ہو یا اخلاقی، ذہنی ہو یا ثقافتی، سیاسی ہو یا اقتصادی یا کوئی اور، آپ فوراً ہی محسوس کریں گے کہ یہ نظامِ حیات امتیازی خصوصیات کا حامل ہے وضاحت کے لیے چند ایک مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ اسلامی نظریے کا سرچشمہ دوسرے تمام نظریات کے سرچشموں سے مختلف ہے۔

یہ نظریہ کسی انسان کا وضع کردہ نہیں۔ یہ تخریبی سیاست دانوں یا کینہ پرور معاشیات دانوں کی پیداوار نہیں، نہ یہ نکتہ چین معلمینِ اخلاق یا خود غرض صنعت کاروں ہی کی اختراع ہے۔ بلکہ یہ نظریۂ اللہ کا مرتّب کردہ ہے۔ یہ اُس ذاتِ لامحدود کا شاہکار ہے۔ اِسے من حیث المجموع بنی نوع انسان کے بہترین مفاد میں تخلیق کیا گیا ہے اور اپنی نوعیّت کے اعتبار سے یہ تمام اہلِ ایمان کے لیے لازم اور لائقِ احترام ہے۔ یہ ہر صائب الذّہن شخص کے لیے قابلِ فہم ہے کیونکہ یہ چکرا دینے والے اسرار و رموز، خفیہ شرائط و قیود اور متکبرانہ مراعات سے مبّرا ہے۔

۲- اس نظریے کے مقاصد بھی دوسرے تمام نظریات سے یکسر مختلف ہیں۔ یہ نظریۂ دنیا پر تسلّط جمانے یا مادی توسیع پر یقین نہیں رکھتا۔ اس کا مقصد دنیا کو مشیّتِ الٰہی کے تابع اور قانونِ الٰہی کے حدود کا پابند بنانا ہے۔ اس کا سب سے بڑا مقصد اللہ کو خوش کرنا اور انسان کی اس طرح تہذیب کرنا ہے کہ وہ خالقِ کائنات کے قانون کی اطاعت کرنے اور مالکِ حقیقی کا وفادار نائب بننے کے قابل ہو سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے یہ نظریّہ زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کا مقصد انسان میں ایک صاف ستھرے ذہن، ایک سچے جذبے، ایک زندہ ضمیر، ایک صحت مند جسم اور ذمّہ دارانہ احساسات کی تعمیر کرنا ہے۔ ان خصوصیات کا حامل شخص اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے کبھی رُوگردانی نہیں کر سکتا اور وہ زندگی کا بہترین راستہ اختیار کرتا ہے۔ پس اسلامی نظریہ کے مقاصد محض انسانی یا دُنیوی نہیں بلکہ بالکل جداگانہ نوعیّت کے ہیں۔

۳- اسلامی نظریّہ میں وہ تمام عناصر اور قوّتیں موجود ہیں جو اسے جامع، قابلِ عمل، اعتدال پسند اور لچکدار بناتی ہیں۔ اس کی آسمانی حیثیت صرف بنیادی اور اٹل اصولوں کی نشان دہی کرتی ہے اور انسانی عقل کو جُزئیات میں جانے اور جہاں ضرورت

ہو تصرف کرنے کے وسیع مواقع فراہم کرتی ہے۔ اسلامی نظریے کو آپ خواہ کسی بھی زاویۂ نگاہ سے دیکھیں یہ جامع، قابلِ عمل اور باتدبیر اصولوں سے عبارت ہے۔ جامع اس لیے کہ یہ اصول زندگی کے تمام بڑے پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں، قابلِ عمل اس لیے کہ تاریخ کے کسی ایک یا دوسرے دور میں ان پر عمل ہوا اور ان کو حقیقت کے رُوپ میں ڈھالا گیا، اعتدال پسند اس لیے کہ یہ کسی سرمایہ دار یا محنت کش فرد کی حمایت نہیں کرتے۔ ان اصولوں کا تعلق نہ تو سراسر دنیاوی معاملات سے ہے نہ سراسر روحانیت سے۔ یہ نہ تو صرف دنیا تک محدود ہیں نہ ان کا تعلق صرف عُقبیٰ کی زندگی سے ہے۔ ان کا راستہ تمام انتہاؤں کے بین بین ہے اور یہ اعتدال پسند اور مستحکم زندگی کی رہنمائی کرتے ہیں۔ ان اصولوں کے ساتھ ساتھ مختلف خطّوں اور زمانوں کی مناسبت سے تفصیلات طے کرنے کے لیے اسلامی نظریّے میں خاصی لچک پائی جاتی ہے۔ یہ لچک درحقیقت ایک ضرورت ہے کیونکہ یہ نظریہ اللہ کا تخلیق کردہ ہے اور اللہ کی دوسری تمام تخلیقات کی طرح اس نظریہ میں بھی انسانی ذہن اور انسانی کوشش کے لیے وسیع میدان موجود ہے۔

باب پنجم

مسخ شدہ اسلامی تصورات

اس باب میں اسلام کے بعض ان پہلوؤں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے جنکو بہت سے مسلمانوں نے فراموش کر دیا ہے اور تقریباً دوسرے تمام لوگوں نے عملاً ان کی شکل بگاڑ دی ہے۔ یہاں کوشش کی جائے گی کہ ان پہلوؤں کو ان کے صحیح رنگ میں پیش کیا جائے اور ان کی واضح تصویر سامنے لائی جائے۔ ایسا کرنے میں معذرت خواہانہ انداز اپنانے کی کوشش نہیں کی گئی کیونکہ اسلام کو عذر خواہی کی قطعاً ضرورت نہیں نہ ہمارا مطمحِ نظر کسی کی تشفی، مذمت یا خوشامد کرنا ہی ہے کیونکہ اسلام میں ایسے رویّوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسلام تو راست انداز اپنانے کا حکم دیتا ہے چنانچہ مقصود یہ ہے کہ اس کے مذکورہ پہلوؤں کی حقیقتِ حال معلوم کی جائے، اسے غیر مسلم اذہان کے آگے از سرِ نو پیش کیا جائے اور ہر شخص کے لیے موقع فراہم کیا جائے کہ وہ ایک ذہین، ذمہ دار اور صاحبِ فہم و فراست ہونے کی حیثیت میں ان پہلوؤں کی صداقت کا جائزہ لے اور ان کے بارے میں از خود کسی فیصلے پر پہنچ سکے۔

ایسے مسلمان جو مغربی دنیا میں اقامت گزیں ہیں یا مغربی زبان و ادب سے مانوس ہیں انہیں اکثر و بیشتر بعض اہلِ مغرب کے خلافِ توقع سوالات یا بھونچکا کر دینے والے بیانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان میں "جہاد"، "عیسائیت دشمن اسلام"، "تعددِ ازدواج" "طلاق"، "اسلام میں عورت کا مقام" اور ایسے بہت سے دوسرے موضوعات شامل ہیں جن کے حوالے سے اسلام کو اکثر تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ یہاں ان موضوعات کا مختصراً جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ حق و صداقت کی بات لوگوں تک پہنچائی جا سکے اور ان معترضین کو حقیقتِ حال سے آگاہ کیا جا سکے جو سادہ لوحی یا لاعلمی کے باعث اس قسم

کے اعتراضات اٹھاتے ہیں۔

۱۔ جہاد

کیا اسلام تلوار کے زور سے پھیلا؟ کیا مسلمانوں کا نعرہ "قرآن یا تلوار" تھا؟ کیا مسلمان سامراجی تھے اور ان کا نصب العین دنیاوی طاقت یا لوٹ مار تھا؟ بعض لوگ ایسے سوالات پر مثبت اندازِ فکر اختیار کرتے ہیں اور بعض منفی۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو حتمی رائے قائم نہیں کر سکے۔ وہ تذبذب کا شکار ہیں اور اس موضوع پر کوئی فیصلہ صادر کرتے وقت تامل سے کام لیتے ہیں۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں قرآن کا کیا مؤقف ہے اور رسول اللہ ؐ کے عہد کے تاریخی وقائع کیا بتاتے ہیں۔ ہر دیانتدار شخص جس کے دل میں سچائی کی قدر اور انسانی وقار کا احترام ہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنی تشفی کے لیے حقائق کا سراغ لگائے اور جو معلومات اسے حاصل ہوں ان کو جوں کا توں دوسروں تک پہنچائے۔

قرآن اس بات کی صراحت کرتا ہے کہ خواہ ہم پسند کریں یا نہ کریں جب تک دنیا میں ناانصافی، تشدد، من موجی خواہشات اور من مانی مراعات موجود ہیں جنگ ایک لازمۂ حیات اور زندگی کی حقیقت بنی رہے گی۔ ممکن ہے یہ بات آپ کو عجیب لگے لیکن کیا یہ ایک تاریخی حقیقت نہیں ہے کہ ابتدائے زمانہ سے لیکر اب تک عالمِ انسانیت کو مقامی، خانگی اور عالمی جنگوں سے واسطہ رہا ہے؟ اور کیا یہ بھی ایک حقیقت نہیں کہ اکثر و بیشتر حالات میں فاتحین اپنے تنازعات کا فیصلہ اپنے مفادات کی بنا پر کرتے ہیں اور دشمنوں کے مقام کا تعین جنگ اور جنگ کی دھمکیوں کے ذریعے کیا جاتا ہے؟ آج بھی بنی نوعِ انسان مسلسل خوف کی فضا میں اور دنیا کے بہت سے مقامات پر جنگ کی گھن گرج میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ زندگی کے ان حقائق سے اغماض

برت سکتا ہے ؟ کیا قرآن اس مسئلے سے حقیقت پسندانہ اور مؤثر طور پر نمٹنے سے قاصر ہے ؟ یقیناً ایسا نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے انسان کے اپنے دفاع اور انصاف، آزادی اور امن وسلامتی کی بحالی کے لیے جنگ کو ایک قانونی اور جائز ذریعہ تسلیم کیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

تمہیں جنگ کا حکم دیا گیا ہے اور وہ تمہیں ناگوار ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہی تمہارے لیے بہتر ہو اور ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہی تمہارے لیے بُری ہو۔ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔ (سورہ ۲: آیت ۲۱۶)

اگر اس طرح اللہ انسانوں کے گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعے سے ہٹاتا نہ رہتا تو زمین کا نظام بگڑ جاتا، لیکن دنیا کے لوگوں پر اللہ کا بڑا فضل ہے (کہ وہ اس طرح دفعِ فساد کا انتظام کرتا رہتا ہے) (سورہ ۲: آیت ۲۵۱)

اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور معبد اور مسجدیں، جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے، سب مسمار کر ڈالی جائیں۔ (سورہ ۲۲: آیت ۴۰)

اسلام کا طرزِ عمل اگرچہ حقیقت پسندانہ ہے لیکن یہ اپنی جانب سے یا کسی دوسرے کی جانب سے جارحیت کو ہرگز برداشت نہیں کرتا نہ یہ جارحانہ جنگوں یا ایسی جنگوں کی پہل کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ مسلمانوں کو اللہ کی جانب سے حکم دیا گیا ہے کہ وہ زیادتی نہ کریں یا کسی جارحانہ اقدام کی پہل نہ کریں اور نہ دوسروں کے حقوق پائمال کریں۔ گزشتہ باب میں جو کچھ کہا جا چکا ہے اس کے علاوہ قرآن کی بعض مخصوص آیات بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں، مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ان سے لڑو جہاں بھی تمہارا ان سے مقابلہ پیش آئے اور انہیں نکالو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے، اس لیے کہ قتل اگرچہ بُرا

ہے، مگر فتنہ اس سے بھی زیادہ برا ہے۔ اور مسجدِ حرام کے قریب جب تک وہ تم سے نہ لڑیں، تم بھی نہ لڑو، مگر جب وہ وہاں لڑنے سے نہ چوکیں، تو تم بھی بے تکلف انہیں مارو کہ ایسے کافروں کی یہی سزا ہے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو جان لو کہ اللہ معاف کرنیوالا اور رحم فرمانیوالا ہے۔ تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کیلیے ہو جائے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا اور کسی پر دست درازی روا نہیں۔ (سورہ ۲: آیات ۱۹۰ تا ۱۹۳)

جنگ اسلام کا نصب العین نہیں ہے نہ یہ مسلمانوں کا معمول کا شعار ہے۔ یہ تو اصلاحِ احوال کی ایک آخری کوشش ہے جو انتہائی غیر معمولی حالات میں جب دوسرے تمام اقدامات ناکام ہو جائیں رو بہ عمل لائی جاتی ہے۔ یہ ہے اسلام میں جنگ کا حقیقی مقام۔ اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے۔ اس کے معنی ہی سلامتی کے ہیں۔ اللہ کے اسماء میں سے ایک "سلام" ہے۔ مسلمانوں اور فرشتوں میں خیر مقدم کرنے کا مروجہ طریقہ سلام یعنی امن و سلامتی کی دعا ہے۔ بہشت امن و سلامتی کا گھر ہے۔ اسمِ صفت "مُسلم" کے معنی بھی سلامتی والے کے ہیں۔ غرض امن و سلامتی ہی اسلام کی فطرت، معنی، علامت اور نصب العین ہے۔ ہر شخص کو مذہبی، جغرافیائی اور نسلی امتیازات کے لحاظ کے بغیر اسلام کی عطا کردہ سلامتی اور پرامن مسلمانوں کی رحمدلی سے متمتع ہونے کا اس وقت تک حق حاصل ہے جب تک وہ اسلام یا مسلمانوں کے خلاف جارحیت کا مرتکب نہیں ہوتا۔ اگر غیر مسلم افراد مسلمانوں کے ساتھ پرامن طریقے سے رہتے ہیں یا اسلام کے بارے میں ان کا رویہ غیر جانبدارانہ ہے تو ان کے خلاف اعلانِ جنگ کی کوئی وجہ یا جواز نہیں ہو سکتا۔ اسلام میں غیر مسلموں کو بالجبر مسلمان بنانے کے لئے مذہبی جنگ کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ اگر اسلام یقین کامل کے نتیجے میں انسان کے باطن سے نمو پذیر نہیں ہوتا تو یہ اللہ تعالی کے لئے ہرگز قابلِ قبول نہیں نہ یہ اقرار کرنے والے کے لئے ہی مددگار ثابت ہو سکتا ہے اگر دنیا میں کوئی ایسا مذہب یا منشور موجود ہے جو پرامن مذہبی آزادی کی ضمانت دیتا ہو اور مذہب معاملے

میں جبر و اکراہ منع کرتا ہو تو یہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔ قرآن اس نقطۂ نظر کی وضاحت اس طرح کرتا ہے:

دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ اب جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا، اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا، جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ (جس کا سہارا اس نے لیا ہے) سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے (سورہ ۲: آیت ۲۵۶)

تبلیغِ اسلام کے دوران بھی مسلمانوں کے۔ یہ نہ صرف طاقت کے استعمال کی ممانعت کی گئی ہے بلکہ انہیں ایسے مواقع پر نہایت پُرامن طریقے استعمال کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

اے نبی، اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو۔ تمہارا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہِ راست پر ہے۔

(سورہ ۱۶: آیت ۱۲۵)

اور اہلِ کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقے سے — سوائے ان لوگوں کے جو اُن میں سے ظالم ہوں — اور ان سے کہو کہ "ہم ایمان لائے ہیں اس چیز پر بھی جو ہماری طرف بھیجی گئی ہے اور اس چیز پر بھی جو تمہاری طرف بھیجی گئی تھی، ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے اور ہم اسی کے مسلم (فرمانبردار) ہیں۔" (سورہ ۲۹: آیت ۴۶)

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلام کو امن و سلامتی کے لئے مخصوص کیا گیا ہے اور اگر مسلمان امن و سلامتی کے نصب العین کے لئے ہی وقف ہیں اور اگر قرآن امن و سلامتی کا اتنا حامی ہے تو پھر رسول اللہ نے جنگیں کیوں لڑیں اور مسلمانوں کو جنگوں میں حصہ لینے کا حکم کیوں دیا؟ قرآن کیوں کہتا ہے "ان کو قتل کر دو"، "ان سے لڑو"؟ اس ظاہر

معصومانہ سوال کا جائزہ لینے کے لئے بعض ان تاریخی حقائق کا ذکر ناگزیر معلوم ہوتا ہے جو مشرکین کے خلاف اسلامی جنگوں کے دوران اور اس سے پہلے کارفرما تھے۔

بعثتِ رسالت کے بعد رسول اللہ حضرتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جلسۂ عام منعقد کیا اور اجتماع کو اللہ کا پیغام پہنچایا۔ آپؐ نے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ اصنام پرستی ترک کر دیں اور خدائے واحد پر ایمان لائیں۔ آپؐ کی پہلی پُر امن اور منطقی اپیل کی نہ صرف مزاحمت ہوئی بلکہ مخالفین نے پھبتیاں کسیں، مضحکہ اڑایا اور ٹھٹھے لگائے۔ آپ نے لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچانے کی کوشش مسلسل جاری رکھی لیکن کامیابی نہ ہو سکی چونکہ اسلام کی کھلم کھلا تبلیغ کے تمام راستے آپ پر بند کر دیے گئے اس لیے اپنے چند ایک حامیوں کی جان بچانے اور ان کے مصائب کم کرنے کے لیے آپؐ نے چند برس تک خفیہ طور پر تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا۔ جب اللہ کی طرف سے اسلام کی علی الاعلان تبلیغ کی ہدایات آگئیں تو کفار نے مسلمانوں پر اور زیادہ مظالم ڈھانا شروع کر دیے اور انہیں طرح طرح کی اذیتیں پہنچانے لگے۔ لیکن وہ مسلمانوں پر جتنے زیادہ ظلم و ستم توڑتے تھے اتنا ہی مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ مشرکین نے صدائے حق کو خاموش کرنے کے لئے ہر قسم کا دباؤ اور ترغیب استعمال کی لیکن ان کی معاندانہ سرگرمیاں جتنی بڑھتی جاتی تھیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں میں اتنا ہی زیادہ استقلال پیدا ہوتا جاتا تھا۔ جب مشرکین دھمکیوں، تشدد، جائداد کی ضبطی اور تمسخر و تضحیک سے مسلمانوں کا ایمان متزلزل کرنے میں ناکام رہے تو انہوں نے مسلمانوں کا معاشرتی مقاطعہ کیا اور انہیں برادری سے نکال باہر کرنے کی زور دار مہم شروع کر دی۔ چند برس تک مسلمانوں پر عرصۂ حیات بہت تنگ رہا۔ ان کے تعلقات کا دائرہ بہت محدود ہو کر رہ گیا۔ وہ اللہ کے پیغام کی تبلیغ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اپنے ہم وطن اہل مکہ کے ساتھ خرید و فروخت، شادی بیاہ یا کسی بھی قسم کا رابطہ قائم نہیں کر سکتے تھے۔ ان حالات میں بھی مسلمانوں کے ایمان میں ذرہ بھر لغزش نہ آئی۔ سماجی مقاطعہ

بہت عرصے تک جاری رہا حتیٰ کہ خود مشرکین اس کیفیت سے تنگ آ گئے اور انہیں بالآخر یہ مقاطعہ ختم کرنا پڑا۔

مقاطعہ کا اختتام ہرگز اس بات کی علامت نہ تھا کہ مشرکین امن و سلامتی اور پر سکون فضا کے قیام پر راضی ہیں۔ اس کے برعکس ان کی طرف سے ظلم و تشدد اور ایذا رسانی میں مزید اضافہ ہو گیا لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان پر ان مظالم کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بالآخر مشرکین نے اعلیٰ سطح کے زعماء کی ایک خفیہ کانفرنس بلائی جس میں اسلام کو نیست و نابود کرنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کرنے کے طریقوں پر غور و خوض ہوا بالآخر اتفاق رائے سے یہ طے پایا کہ ہر قبیلے سے ایک طاقتور شخص کا انتخاب کیا جائے اور وہ سب مل کر آنحضرتؐ کو سوتے میں قتل کر دیں۔ رسول اللہ کا مشن ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے آبائی شہر مکہ کو خیرباد کہنے اور مدینہ کو ہجرت کر جانے کا حکم دیا تاکہ آپؐ وہاں کے مقامی مسلمانوں اور ان لوگوں سے جا ملیں جو پہلے ہی مکہ سے مدینہ ہجرت کر گئے تھے (دیکھیے قرآن کا سورہ ۸: آیت ۳۰، سورہ ۹: آیت ۴۰)۔ ہجرت کا یہ واقعہ بہت اہمیت رکھتا ہے اور تاریخ اسلام اور اسلامی کیلنڈر کا آغاز اسی واقعۂ ہجرت سے ہوتا ہے۔

ترکِ مکّہ کے وقت مسلمان حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی تمام جائدادیں، ساز و سامان حتیٰ کہ اپنے خاندان بھی پیچھے چھوڑ آئے۔ مدینہ پہنچتے ہی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پرامن تبلیغ اور دعوتِ اسلام کا کام پھر سے شروع کر دیا۔ بعض مقامی باشندوں نے اللہ کے پیغام پر مثبت ردِ عمل ظاہر کیا اور فوراً ہی اسلامی معاشرے کے فعّال رکن بن گئے جبکہ بعض نے اسلام قبول نہ کیا اور وہ اپنے روایتی عقائد پر قائم رہے۔ آنحضرتؐ نے خود کو چونکہ باوقار امن اور اصلاحِ معاشرہ کے لئے وقف کر دیا تھا اس لیے آپؐ نے غیر مسلموں کے ساتھ معاہدے طے کیے، انہیں آزادی اور تحفظ کا یقین دلایا اور یوں ان کے دلوں

میں تنگ نظری پر مبنی قبائلی وفاداری کی بجائے پہلی مرتبہ معاشرتی اور قومی شعور پیدا کیا۔

جن دنوں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان اصلاحات میں مصروف تھے اور مدینہ میں مسلم آبادی کو منظم کرنے اور ایک ایسے مستحکم اور پرامن معاشرے کی بنیادیں رکھنے کی کوشش کر رہے تھے جہاں مسلمان اور غیر مسلم ساتھ ساتھ زندگی بسر کر سکیں تو انہی دنوں مکہ میں آپؐ کے دشمن پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ مسلمانوں کے لیے ان کی نفرت آگ کی طرح بھڑک رہی تھی اور ان کا اسلام کو ملیامیٹ کرنے کا عزم روز بروز راسخ سے راسخ تر ہوتا جا رہا تھا۔

انہوں نے اپنی معاندانہ چالوں کا از سر نو جائزہ لیا اور جونہی ان کے نئے منصوبے پایۂ تکمیل کو پہنچے ان پر عملدرآمد شروع کر دیا گیا۔ انہوں نے اندرونی اور بیرونی ہر دو محاذ سے مسلمانوں کو زچ کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے چھاپہ ماروں کے دستے منظم کیے تاکہ وہ مدینہ پر اچانک حملہ کر کے اور وہاں سے جو کچھ ہاتھ آئے سمیٹ کر واپس مکہ پہنچ جائیں۔ اسلام کی روز افزوں مقبولیت اور مسلمانوں میں ایک انوکھے جذبۂ اخوت کو دیکھ کر مدینہ کے غیر مسلم افراد حسد کی آگ میں جلنے لگے تھے۔ یہ وہ جذبہ تھا جس کا انہیں تجربہ نہیں ہوا تھا یا جس کا تجربہ وہ حاصل نہیں کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ دشمنانِ مکہ نے اس صورتِ حال کا فائدہ اٹھانے میں دیر نہ کی اور مسلمانوں کا امن و سکون تباہ کرنے کے لئے اندرونی اختلافات کو ہوا دینی شروع کر دی۔ اہلِ مکہ کے اکسانے پر مدینہ کے حاسد غیر مسلموں نے فوری اور واضح ردِعمل ظاہر کیا اور سارے مدینہ میں خطرناک شورشیں سر اٹھانے لگیں۔

اب مسلمانوں کو مسلسل دو سمتوں سے خطرہ رہنے لگا۔ ایک خطرہ مدینہ کے اندر غیر مسلموں کی طرف سے اور دوسرا اہلِ مکہ کے منظم چھاپوں کا تھا۔ مسلمانوں پر عرصۂ حیات اتنا تنگ کر دیا گیا کہ اب وہ مزید اذیتیں اور دھمکیاں برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے خاندانوں کو ان سے جبراً الگ کر دیا گیا تھا۔ ان کی جائدادیں ضبط کر لی گئی تھیں۔ ان کا خون بہایا گیا تھا۔ انہیں اپنے پیارے آبائی شہر سے تین بار ہجرت کرنا پڑی تھی — دو بار تھوڑیا

کی طرف اور ایک بار مدینہ کی طرف۔ انہوں نے تیرہ سال سے زائد عرصہ تک یہ مصائب برداشت کیے۔ دشمنانِ مکہ کی نئی چالوں کے بعد مسلمانوں کے لیے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ رہا تھا کہ یا تو وہ اجتماعی قتلِ عام کے نتیجے میں صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو جاتے یا پھر ظلم و تشدد کے خلاف اپنے دفاع کے لئے ڈٹ جاتے۔

حالات اس موڑ پر آگئے تھے کہ اسلام میں بظاہر تناقص نظر آنے لگا تھا۔ اسلام بنی نوع انسان کو عزو وقار، قوت، آزادی اور تحفظ دینے آیا تھا۔ اس کا مقصد انسان کا اللہ سے رشتہ جوڑنا تھا اور اللہ ہر قسم کی نیکی، مدد طاقت اور امن و سلامتی کا سرچشمہ ہے اس کے باوجود مسلمان بے یار و مددگار اور مضطرب تھے۔ انہیں دھمکیاں دی جارہی تھیں اور خوفزدہ کیا جارہا تھا۔ اسلام نے انہیں امن قائم کرنے، نیکی کا حکم دینے اور برائی کو روکنے مظلوم کی مدد کرنے اور مغلوب کو نجات دلانے کی ہدایت کی تھی۔ انہیں یہ ثابت کرنا تھا کہ اللہ اپنے بندوں کے لئے کس قدر قابلِ اعتماد اور ان کا مددگار ہے لیکن وہ ایسا کیونکر کر سکتے تھے جبکہ وہ خود مظلوم، خوفزدہ اور بے بس تھے۔

مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ پریشانی کی بات یہ تھی کہ قرآن اس معاملے میں بالکل خاموش تھا۔ قرآن نے انہیں کوئی واضح ہدایات نہیں دی تھیں کہ اس قسم کے حالات میں وہ کیا کریں۔ لیکن ان کی یہ پریشانی زیادہ دیر نہیں رہی۔ ان مسائل سے نمٹنے کیلئے اور اس قسم کی صورتِ حال میں گھرے ہوئے لوگوں کی نجات کے لیے اللہ نے آسمانی فیصلہ صادر کر کے مسلمانوں کو اس پریشانی سے نکال لیا۔ آیئے دیکھیں اللہ نے یہ فیصلہ کن الفاظ میں سنایا:

یقیناً اللہ مدافعت کرتا ہے ان لوگوں کی طرف سے جو ایمان لائے ہیں۔ یقیناً اللہ کسی خائن کافرِ نعمت کو پسند نہیں کرتا۔ اجازت دیدی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ جاری ہے، کیونکہ وہ مظلوم ہیں، اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے

گھروں سے ناحق نکال دیے گئے صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے "ہمارا رب اللہ ہے"۔ اگر اللہ لوگوں کو ایکدوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور معبد اور مسجدیں، جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے، سب مسمار کر ڈالی جائیں۔ اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے۔ اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے۔ اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

(سورہ ۲۲: آیات ۳۸ تا ۴۱)

اللہ کی طرف سے یہ واضح ہدایت آنے کے بعد مسلمانوں پر اذیتوں اور ظلم و تشدد کا دور ختم ہو گیا۔ انہوں نے سکون کی بحالی، امن و آزادی کے حصول، اپنے خاندانوں سے ملاپ اور اپنی املاک کی بازیابی کے لئے مزاحمت شروع کر دی۔ انہوں نے ان کینہ پرور مشرکین کے ساتھ لڑائیاں اور جنگیں لڑیں جنہوں نے مسلمانوں کو امن اور آزادی سے محروم کر دیا تھا۔ لیکن ان جنگوں میں بھی مسلمانوں کی طرف سے کبھی جارحیت نہیں ہوئی۔ انہوں نے گھروں، فصلوں اور سامانِ رسد وغیرہ کو کبھی نقصان نہیں پہنچایا نہ انہوں نے غیر متحارب بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور معذور افراد کو قتل کیا۔ مسلمانوں نے ان ضابطوں کی پابندی کی اور اللہ کی مقرر کردہ حدود میں رہے۔ یہ ایک ایسی چیز تھی جو نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد ہی کبھی تجربے میں آئی ہے۔ یہ تھے وہ حالات جن میں مسلمان لڑنے پر مجبور ہوئے اور یہ تھے اللہ کے بتائے ہوئے اصول اور اس کی ہدایات جن کی بدولت انہیں انجامِ کار فیصلہ کن فتوحات حاصل ہوئیں۔

ان "بے رحم" مسلمانوں کے بارے میں بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے۔ یہ مسلمان تاریک عرب کے تپتے ہوئے خشک صحراؤں سے اٹھے اور انہوں نے روم و فارس کے ممالک محروسہ فتح کر ڈالے یہاں تک کہ مہم جوئی کرتے ہوئے یورپ کی سرحدوں تک جا پہنچے۔ بہت

سے مورخین کا خیال ہے کہ مسلمان مذہبی جذبے سے مغلوب ہو کر بذریعہ طاقت اسلام پھیلانے کے لیے جہاں تک جا سکتے تھے گئے جبکہ بہت سے دوسرے لوگ اس رائے کو احمقانہ اور سادہ لوحی پر مبنی خیال کرتے ہیں کیونکہ اسلام اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک ایسا مذہب ہے جسے دوسروں پر مسلط نہیں کیا جا سکتا اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اسلام کو مفتوحین پر مسلط کیا گیا تھا تو پھر یہ زیادہ عرصے تک برقرار نہیں رہ سکتا تھا اور مفتوحہ علاقوں میں غیر مسلم افراد کا وجود ختم ہو جانا چاہیئے تھا۔ تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ اسلام ماسوائے سپین کے جہاں بھی پہنچا باقی رہا (سپین میں بعض وجوہات کی بنا پر اسلام اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکا) اور مسلم فاتحین جہاں بھی گئے غیر مسلم مقامی باشندوں کے ساتھ گھل مل گئے۔ علاوہ ازیں اس نقطہ نظر کے حامل مورخین یہ دلیل دیتے ہیں کہ اسلام ایسا مذہب کسی شخص پر ٹھونسا نہیں جا سکتا اور کوئی شخص اپنے عقیدے میں اس قدر مخلص اور دیانت دار نہیں ہو سکتا جتنا کہ مفتوحہ علاقوں کے نو مسلم اسلام کے بارے میں تھے۔ اسلام کے پھیلاؤ کیلئے جبر کی نہیں بلکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ مفتوحین میں سے لوگ خود بخود اسلام قبول کریں اور اچھے مسلمان بن کر دکھائیں۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ جبر و تشدد کی بجائے نو مسلموں کے لئے ایسے حالات پیدا کئے جائیں کہ وہ اسلام پر سختی سے قائم رہیں اور اس کی خلوص دل سے آبیاری کریں۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ رویہ کسی ایسے مذہب کے بارے میں ہرگز نہیں ہو سکتا جسے ان پر زبردستی مسلط کر دیا گیا ہو۔

توسیع اسلام کے بارے میں ایک اور نظریہ بھی پایا جاتا ہے۔ یہ نظریہ ان لوگوں کا پیش کردہ ہے جو اپنے آپ کو دانشور، روشن خیال، نقاد یا مستند شخصیات کہلانا پسند کرتے ہیں۔ یہ گروہ اس احمقانہ اور سادہ لوحی پر مبنی رائے سے متفق نہیں کہ اسلام بذریعہ تشدد پھیلا ہے۔ یہ لوگ اسلام کی توسیع کو مسلمانوں کی جارحانہ جنگوں پر محمول کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں مسلمانوں کے لئے عرب کے وسیع و عریض تپتے ہوئے بے آب و گیاہ

صحرا میں زندگی کو قائم رکھنا مشکل ہو گیا تھا چنانچہ بعض معاشی ضروریات اور حالات سے مجبور ہو کر انہوں نے دوسرے ممالک پر چڑھائی کر دی۔ اس لئے ان جنگوں اور مہموں کی نوعیت مذہبی یا روحانی نہیں تھی بلکہ یہ محض ان کی فوری ضروریات کا نتیجہ تھیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ عرب قربانی اور عبادت کے اعلیٰ مقام پر فائز نہیں تھے یا پھر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد آپ کے پیروکار اور پھر ان کی اگلی نسل مذہب میں اپنی دلچسپی مکمل طور پر کھو چکی تھی اور انہوں نے خود کو صرف فوری ضروریات کی تکمیل کے لئے وقف کر لیا تھا۔ اس سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ دینِ اسلام ان مسلمان عرب جنگجوؤں میں جوش و جذبہ پیدا کرنے کے اہل نہیں تھا۔ اس طرح اس نظریے سے بہت سے مطالب اخذ کئے جا سکتے ہیں اور اس نظریئے کے حامل "دانشور" خود بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ کس امکان کو دوسرے امکانات پر ترجیح دی جانی چاہیے۔

توسیعِ اسلام کے بارے میں بعض لوگ ایک اور نظریہ رکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں عربوں نے جذبۂ تحریص سے مغلوب ہو کر محض لوٹ مار اور غارتگری کے لیے بیرونِ عرب جنگیں لڑیں۔ ان نقادوں کو مسلمانوں میں خونریزی اور ہوسِ مال و زر کے سوا کوئی چیز جنگ و جدل کی محرک نظر نہیں آتی۔ وہ اسلام کی کسی خوبی کو تسلیم کرنے اور مسلمانوں کو کسی اعلیٰ مقصد سے منسوب کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔

ان مختلف مکتبہ ہائے فکر کے درمیان اس مسئلے پر اختلاف کی نوعیت خاصی سنجیدہ ہے اور بعض اوقات یہ اختلافِ رائے علمی مباحث کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کسی میں بھی نظریہ کے حامل نقاد نے اس پورے مسئلے کو سمجھنے اور سچائی کو دیانتدارانہ طریقے سے پیش کرنے کی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ ان میں سے کسی میں بھی اتنی بصیرت اور اخلاقی جرأت نہیں کہ وہ اس پورے معاملے کی تہ تک پہنچ کر صحیح صورتِ حال بیان کر سکے۔ یہ نقاد اس وقت اپنے آپ

کو کتنے بھاری بوجھ تلے دبا ہوا محسوس کریں گے جب کسی دن ان پر انکشاف ہوگا کہ انہوں نے لاکھوں انسانوں کو گمراہ کیا ہے اور غلط معلومات فراہم کی ہیں۔ ان کے لیے جوابدہی کتنی مشکل ہو گی جب انہیں معلوم ہوگا کہ انہوں نے سچائی کے خلاف، مسلمانوں کے خلاف اور اپنے حامیوں کے خلاف سنگین جرائم کا ارتکاب کیا ہے۔

اس کتاب میں ہر جنگ یا لڑائی سے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر بالتفصیل بیان کرنا ممکن نہیں۔ تاہم بعض نکات ایسے ہیں جن کے ذکر سے پورے معاملے کی ایک واضح تصویر سامنے آجاتی ہے۔

۱۔ یہ بات ذہن میں رہنی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام عالم انسانیت کے لیے رحمت بنا کر بھیجا تھا چنانچہ آپ نے پڑوسی ممالک کے حکمرانوں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی اور انہیں اسلام قبول کرنے اور اللہ کی رحمت سے فیض یاب ہونے کی دعوت دی۔ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ ان حکمرانوں نے نہ صرف آپ کی فیاضانہ دعوت کو مسترد کر دیا بلکہ آپ کا تمسخر اڑایا اور مسلمانوں کے خلاف کھلا اعلان جنگ کر دیا۔ آپ کی زندگی ہی میں روم اور فارس کے لشکروں نے مختلف اوقات میں چھاپے مار کر اسلامی مملکت کی سرحدوں کو عبور کیا چنانچہ آپ کے وصال کے وقت مسلمان بامرِ مجبوری اپنے پڑوسیوں کے ساتھ حالتِ جنگ میں تھے۔

یہ صورتِ حال بدستور جاری رہی اور پھر جو حالات بعد میں آنے والی نسلوں کے دور میں پیش آئے ان کو ان ابتدائی واقعات کی روشنی میں دیکھا جانا چاہیئے۔ اس وقت تمام عیسائی دنیا جس میں سپین اور فرانس کے ممالک بھی شامل تھے ابھرتی ہوئی دنیائے اسلام کے ساتھ برسرِ پیکار تھی۔ یورپ میں مسلمانوں کی مہم جوئی کو بھی انہی حالات کی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ عیسائی دنیا کے تمام ممالک من حیث المجموع ایک فعال قوت بن چکے تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ تمام عیسائی دنیا پاپائے روم کے

زیرنگیں تھی جس کی حاکمیتِ اعلیٰ پر حرف گیری کی گنجائش نہ تھی۔ عیسائی دنیا کے قوتِ واحدہ ہونے کا ثبوت زمانۂ وسطیٰ کی صلیبی جنگوں اور بیسویں صدی کے ربع اول کے دوران اسلام کے خلاف عیسائی قوتوں کی عمومی نقل وحرکت سے بھی ملتا ہے۔

پس ان حالات میں جب روم نے اسلام کے خلاف جنگ کی منظوری دیدی تو جواباً کسی بھی میدانِ جنگ میں مسلمانوں کے حقِ مبارزت سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا خواہ یہ میدانِ جنگ فلسطین کا ہو، اٹلی کا ہو یا ہنگری کا۔ یہ تھے وہ حالات جو مسلمانوں کو سپین اور جنوبی فرانس تک لے گئے۔ وہ یہ برداشت نہیں کرسکتے تھے کہ روم و فارس کی طاقتیں انہیں چار جانب سے گھیرے میں لے لیں نہ وہ ان کے ہاتھوں صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہونے کا انتظار کر سکتے تھے۔ روم سے احکامات جاری کر دیے گئے تھے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر کے آپ کا سرِ مبارک شاہی دربار میں پیش کیا جائے۔ روم کے ملحدوں نے یہی سلوک حضرت عیسیٰؑ کے ابتدائی حواریوں کے ساتھ کیا تھا۔ تاہم یہاں یہ اعتراف کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قرونِ اواخر کی بعض جنگوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں اگرچہ یہ جنگیں بھی مسلمانوں ہی نے کفار سے لڑی تھیں۔ یہ جنگیں اس لیے غیر اسلامی تھیں کہ ان کا مقصد اشاعتِ اسلام نہیں تھا بلکہ بعض جنگیں تو مقامی اور شائد ذاتی محرکات کی بنا پر لڑی گئی تھیں۔ جارحیت بہرحال جارحیت ہے خواہ یہ مسلمانوں کی جانب سے ہو یا مسلمانوں کے خلاف۔ جارحیت کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر بالکل واضح ہے اور یہ تبدیل نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ بعد کی جنگوں میں اگر مسلمانوں کی طرف سے جارحیت کا ارتکاب ہوا تھا تو اسلام اسے جائز قرار نہیں دیتا یا خدا اس جارحیت کو پسند نہیں کرتا۔

۲۔ مذکورہ ناقدین میں سے کسی نے بھی قرونِ اولیٰ کی ان جنگوں کی نوعیت اور حالات سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس زمانے میں ذرائع ابلاغ کا فقدان تھا۔ پریس، ریڈیو، ٹیلیویژن

نام کی کوئی چیز موجود نہیں تھی بلکہ باقاعدہ ڈاک کا نظام بھی وجود میں نہیں آیا تھا۔ عام لوگوں کو اطلاعات بہم پہنچانے اور تبلیغ کا کوئی طریقہ سوائے ذاتی روابط کے موجود نہ تھا۔ لوگوں کی جان، مال، عزت اور افراد اور کمزور قوموں کے ساتھ معاہدوں کا احترام کوئی نہ تھا۔ کسی کو کوئی تحفظ حاصل نہ تھا اور نہ کسی کو اظہارِ رائے کی آزادی تھی۔ جو شخص کسی نیک مقصد کا بیڑا اٹھاتا یا غیر مانوس عقائد کا پرچار کرتا اسے دھمکیاں دی جاتی تھیں۔ اس بات کا ثبوت یونانی فلسفہ دان سقراط، ابتدائی دور کے عیسائیوں اور قرونِ اُولیٰ کے مسلمانوں کی تاریخ سے ملتا ہے۔ بیشتر سفارتی نمائندے جنہیں خصوصی پیغامات دے کر حکمرانوں اور گورنروں کے پاس بھیجا جاتا تھا کبھی زندہ بچ کر نہیں آتے تھے۔ انہیں ان کے میزبان ہی نہایت بے رحمی سے قتل کر دیتے یا گرفتار کر لیتے تھے۔

عرب کے مسلمانوں کو ان تمام مسائل سے نمٹنا تھا۔ اس قسم کے حالات میں اپنا کام جاری رکھنا تھا۔ بنی نوع انسان کو ایک پیغام دینا تھا۔ انسانیت کی سربلندی کے لیے اپنا کردار ادا کرنا اور لوگوں کو نسخۂ نجات عطا کرنا تھا۔ ارشادِ قرآنی ہے کہ لوگوں کو راہِ حق کیطرف بلانے کے لئے عقل و دانش سے کام لو، تبلیغ کا احسن طریقہ اپناؤ اور اپنی بات کے حق میں دلیل پیش کرتے وقت ہمدردانہ انداز اختیار کرو۔ لیکن ان حالات میں اللہ کا پُرامن پیغام سننے کے لئے بھلا کون تیار تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بہت سے منکرینِ رسول ؐ اللہ کی باتیں سننے سے فقط اس لیے گریز کرتے تھے کہ کہیں وہ آپ کی پرامن تبلیغ سے متاثر نہ ہو جائیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے اللہ کے پرامن پیغام کی بالقوۃ مزاحمت کی۔ عرب کے ابتدائی تجربے نے مسلمانوں کو سبق دیا تھا کہ پرامن رہنے کے ساتھ محتاط اور چوکس رہنا زیادہ کارگر طریقہ ہے کیونکہ پرامن طریقے سے آپ صرف اسی صورت میں آگے بڑھ سکتے ہیں جب آپ اتنے طاقتور ہوں کہ اپنی سلامتی کی خود حفاظت کر سکیں اور آپ کی صدائے امن اسی صورت میں بہتر سنائی دے گی جب آپ تشدد کی مزاحمت

اور ظلم کا خاتمہ کرنے کے قابل ہوں گے۔

اب مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آگیا تھا کہ وہ اسلام کو بیرونی دنیا میں متعارف کرائیں لیکن اس زمانے میں کوئی مواصلاتی نظام، پریس یا کوئی بڑا ذریعہ ابلاغ موجود نہیں تھا۔ ان کے لئے صرف ایک راستہ تھا اور وہ تھا ذاتی اور براہ راست رابطہ پیدا کرنے کا طریقہ جس کا مطلب تھا کہ انہیں اپنے علاقے کی سرحدیں عبور کرنا تھیں۔ لیکن یہ کام وہ چھوٹے چھوٹے اور غیر مسلح گروہوں میں نہیں کر سکتے تھے چنانچہ انہیں بڑے بڑے اور زیر حفاظت قافلوں میں سفر کرنا پڑا ـــ ایسے قافلے جن پر فوج کا گمان ہو۔ لیکن یہ قافلے درحقیقت فوجی دستے نہیں تھے۔ انہوں نے مختلف اوقات میں مختلف سمتوں میں سرحدیں عبور کیں۔ پھر جو کچھ ہوا وہ قابل غور ہے۔ بعض علاقوں میں مقامی باشندوں نے جو مدت سے ظلم و تشدد کا شکار تھے اور روم اور فارس کی غیر ملکی طاقتوں کے زیر نگیں تھے ان قافلوں کا پرجوش استقبال کیا۔ بعض علاقوں میں مسلم قافلوں نے سب سے پہلے ان لوگوں کو اسلام کی دعوت دی جو اسے قبول کرنے کے لئے تیار تھے۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ جن لوگوں نے اسلام قبول نہ کیا ان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اسلامی ٹیکس (زکوٰۃ) کے مساوی جزیہ ادا کریں۔ اس قسم کے ٹیکس کا مطالبہ کرنے کی وجوہات یہ تھیں۔

(ا) مسلمان اس بات کو یقینی بنانا چاہتے تھے کہ ٹیکس دہندہ کو اپنے ٹیکس کی ادائی کا علم اور احساس ہو اور اس بات کا بھی کہ اسے قبول اسلام کی دعوت دی گئی تھی لیکن اس نے اسے اپنی مرضی سے مسترد کر دیا۔

(ب) مسلمان جزیہ ادا کرنے والے غیر مسلم کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کرتے تھے اور اسے تحفظ اور آزادی کی وہی ضمانت حاصل ہوتی تھی جو خود کسی مسلمان کو حاصل تھی کیونکہ جو مسئلہ کسی غیر مسلم کو پیش آسکتا تھا وہ اس کے ہم وطن مسلمان کو بھی پیش آسکتا تھا۔ اسی طرح مسلمانوں کو خطرے سے محفوظ رکھنے کے لئے انہیں غیر مسلموں کا دفاع بھی کرنا پڑتا تھا اور ان کے تحفظ کی ضمانت

دینی پڑتی تھی۔

(ج) نئی قسم کی صورتِ حال اس بات کی مقتضی تھی کہ تمام فرقوں یعنی مسلمانوں اور غیر مسلموں کی یکساں حمایت اور تعاون حاصل کیا جائے ــــ اول الذکر زکوٰۃ کے ذریعے اور موخر الذکر کا جزیہ کے ذریعے۔ یہ ہر دو قسم کی رقوم مفاد عامہ پر خرچ ہوتی تھیں۔

(د) جزیہ کی وصولی سے مسلمان اس بات کو یقینی بنانا چاہتے تھے کہ کوئی غیر مسلم فرد ان کا اور نومسلم بھائیوں کا دشمن نہیں ہے یا وہ اپنے مسلمان ہموطنوں کے لئے مشکلات پیدا کرنا نہیں چاہتا۔

جو لوگ اسلام کو مسترد کر دیتے تھے اور دوسرے فرقوں کے ساتھ مل کر انکی ریاست کی حمایت میں جزیہ ادا کرنے سے انکار کرتے تھے، وہ دراصل خود اپنے لئے مشکلات پیدا کرتے تھے۔ ایسے لوگوں نے شروع ہی سے معاندانہ رویّہ اختیار کیا اور مشکلات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ مشکلات نووارد مسلمانوں کیلیے اتنی نہیں تھیں جتنی نومسلم افراد اور اُن کے ہم وطن جزیہ دہندگان کیلیے تھیں۔ یہ رویّہ قومی لحاظ سے غدّارانہ، انسانی لحاظ سے گھٹیا، معاشرتی لحاظ سے غافلانہ اور فوجی لحاظ سے اشتعال انگیز تھا۔ لیکن عملی طور پر اس رویئے کو ختم کرنے کی ضرورت صرف نووارد مسلمانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ اُن سے زیادہ اس ریاست کی بہبود کے لئے تھی جس میں یہ غدّار رہتے تھے۔ بس ایسے مواقع پر ان لوگوں کے حواس درست کرنے کے لیے اور انہیں اپنی ذمّہ داریوں کا احساس دلانے کے لیے طاقت استعمال کی جاتی تھی۔ انہیں اختیار دیا جاتا تھا کہ یا تو وہ آزادانہ طور پر اپنی مرضی سے اسلام قبول کرلیں یا جزیہ ادا کر کے ریاست کے وفادار شہری بن جائیں، ایسے شہری جو اپنے مسلمان ہموطنوں کے ساتھ مل جل کر رہیں اور ان کے حقوق اور فرائض میں برابر کے شریک ہوں۔

۳۔ نکتہ چین نقادوں کے لئے یہ بات بڑی دانشمندی کی ہوگی کہ وہ قرآن کا مطالعہ

دیانتدارانہ نیت سے کریں اور دیکھیں کہ جنگ اور امن کے سلسلے میں قرآن کے احکامات کیا ہیں۔ ان کے لیے اس سے زیادہ عقلمندی کی بات یہ ہوگی کہ وہ مفتوحہ اقوام کی حیثیت کے بارے میں چھان بین کریں اور ان حالات کا بھی جائزہ لیں جن میں وہ مسلمانوں سے ربط قائم ہونے سے پہلے زندگی بسر کر رہے تھے۔ اگر ان پر یہ منکشف ہوتا ہے کہ فارس اور روم کے ممالکِ محروسہ کے مقامی باشندوں نے مسلمانوں سے پرزور اپیل کی تھی کہ وہ آکر انہیں بیرونی حکومت کے تشدد سے نجات دلائیں تو یہ نقاد کیا تبصرہ کریں گے اور اگر انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ عام لوگوں اور مذہبی رہنماؤں نے، جو مسلمانوں کے زیرِ نگیں آئے اور اسلامی حکومت سے انصاف کے خواہش مند تھے، مسلم فاتحین کا پرجوش خیر مقدم کیا تو ان نقادوں کی سوچ کیا ہوگی؟ وہ اس حقیقت کی وضاحت کیسے کریں گے کہ بعض مفتوحین نے حملہ آور مسلمانوں کا نہ صرف استقبال کیا بلکہ ان کی حمایت میں ظالم حکمرانوں کے خلاف جنگ بھی کی؟ جن علاقوں پر مسلمان "حملہ آور" ہوئے اگر وہاں کے ماقبل اور مابعد حالات کا باہمی موازنہ کیا جائے تو مسلمانوں کے "حملہ آور" ہونے کے بعد ان علاقوں کو جو خوشحالی، آزادی اور ترقی نصیب ہوئی اس کے بارے میں ناقدین کیا اندازِ فکر اختیار کرتے ہیں۔

ہم اس مسئلے پر کوئی خاص نقطۂ نظر پیش کرنا یا جلد بازی میں کوئی نتیجہ اخذ کرنا نہیں چاہتے۔ ہم تو صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس مسئلے پر از سرِ نو غور و خوض اور سنجیدگی سے چھان بین کی جانی چاہیئے۔ اگر ایسا ہوا تو یقیناً دلچسپ اور اہم حقائق سامنے آئیں گے۔ اگر اس سارے مسئلے پر آج کی دنیا کے حالات کی روشنی میں غور کیا جائے تو شاید مغربی ذہن اسے بہتر طور پر سمجھ سکے گا۔ برلن کے مسئلے پر مغربی اتحادیوں کی گہری تشویش، مظلوم اقوام کی اپیلیں، جنوبی کوریا کے باشندوں کا اضطراب، لاؤس کے عوام کے خدشات، نیٹو (NATO) کی کاروائیاں، سیٹو (SEATO) کے معاملات، ماتحت کمیونسٹ ممالک کا عدمِ استحکام وغیرہ ایسے حقائق ہیں جو قرونِ اولیٰ کے واقعات اور اس زمانے کے مسلمانوں کی اصل پالیسیوں کا ادراک کرنے

میں مغربی ذہن کی مدد کر سکتے ہیں۔

۴۔ یہ نظریہ بھی محل نظر ہے کہ بیرون عرب اسلامی جنگوں کا اصل محرک عربوں کی اقتصادی ضروریات تھیں۔ اگرچہ اس نظریئے کے حامل نقاد بظاہر اپنے مفروضوں میں پُریقین نظر آتے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے حقیقتِ حال کا سنجیدگی سے مطالعہ نہیں کیا۔ کیا وہ واقعی دیانتداری سے سمجھتے ہیں کہ اقتصادی ضروریات ہی نے مسلمانوں کو عرب کی سرحدیں عبور کرنے پر مجبور کیا؟ وہ کس بنیاد پر یہ مفروضہ قائم کرتے ہیں کہ ملکِ عرب جو وادیوں اور نخلستانوں کی سرزمین تھا اور ازمنۂ قدیم سے تجارت کا مرکز چلا آ رہا تھا اب اس کے پاس مسلمانوں کے لئے کچھ نہ رہا تھا؟ کیا انہوں نے کبھی سنجیدگی سے اس بات کی تحقیق کی ہے کہ "حملہ آور" مسلمانوں نے اپنے لیے کتنی دولت اکٹھی کی، کتنی اپنی رعایا میں تقسیم کی اور کتنی مدینہ، دمشق، بغداد اور قاہرہ میں قائم مرکزی حکومت کو بھیجی؟ کیا انہوں نے مفتوحہ علاقوں میں اسلام کی آمد سے پہلے اور اسلام کی آمد کے بعد حکومت کو موصول ہونے والے محاصل کا موازنہ کیا ہے اور اس بنیاد پر کوئی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ آیا یہ "حملہ آور" محض خود غرض مہم جو تاجر تھے یا نہیں؟ کیا اس بات پر یقین کرنے کے لیے ان کے پاس دلائل ہیں کہ ان مسلمانوں نے محاصل زیادہ کیا اور دوسروں میں تقسیم کم کیا یا جتنا انہوں نے جمع کیا اس سے زیادہ نکلوایا یا کسی جگہ جتنا سرمایہ انہوں نے لگایا وہاں سے اس سے زیادہ کمایا؟ کیا انہیں اس چیز کے ثبوت میں کوئی شہادت ملی ہے کہ عرب کی مرکزی حکومت نے کسی موقع پر اپنے زیرِ نگیں ممالک کو ترقی دینے کی ضرورت کے پیشِ نظر انہی ممالک سے خراج یا ٹیکس وصول کیا؟ اور اگر ایسا کیا تو کتنی رقم وصول ہوئی اور کیا یہ رقم دور دراز کے ملکوں میں مہم جوئی کے لیے کافی تھی؟ کیا ان کے پاس ایسی قابلِ اعتماد اطلاعات ہیں جن سے یہ ثابت ہو سکے کہ اخراجات کی تخصیص اور ترقیاتی پروگراموں میں عرب کو مفتوحہ علاقوں کے مقابلے میں زیادہ مراعات یا ترجیحات حاصل تھیں؟ ہمارا آخری سوال یہ ہے کہ کیا عرب نے اچانک بڑھتی ہوئی آبادی کے

خطرے کو محسوس کر لیا تھا جس کے باعث مسلمان جنگجویانہ سرگرمیوں یا اقتصادی وسائل کی تلاش کے لیے اپنے ملک سے نکلنے پر مجبور ہو گئے؟

مسلمانوں کے غیر مسلموں سے روابط کو اقتصادی ضروریات پر محمول کرنے کی کوشش عجیب و غریب اور لائق ہمدردی تو ہو سکتی ہے لیکن اس میں کوئی صداقت نظر نہیں آتی نہ اس قسم کی کوشش کا علم و فضل سے کوئی تعلق دکھائی دیتا ہے۔ اس نظریے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ نظریہ غیر تسلی بخش اور ادھورا ہے۔ ابھی اس سلسلے میں تحقیق، چھان بین، تجزیے اور موازنے کی ضرورت ہے۔ جب تک یہ سارا کام نہیں ہوتا کسی نقاد کو اخلاقی طور پر یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے قیاسی مفروضات کو قوی اور قطعی قرار دے۔ جملہ ناقدین کو یہ ایک اور فیاضانہ دعوت ہے کہ وہ سچائی کی تلاش میں مزید مخلصانہ کوششیں کریں۔

۵۔ ان لوگوں کی آراء کو جو اسلامی جنگوں کو غارت گری اور لوٹ مار سے منسوب کرتے ہیں ہم زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اس سے زیادہ بے معنی اور گھسی پٹی رائے اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس قسم کی رائے کا اظہار دراصل دنیائے علم و دانش میں قدم رکھنے کا ایک مختصر راستہ اور عقلی اور اخلاقی مسائل سے نمٹنے کا ایک آسان طریقہ ہے لیکن اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ سطور بالا میں نکات نمبر ۳ اور ۴ کے تحت جو سوالات پوچھے گئے ہیں اس رائے کے ضمن میں بھی پوچھے جا سکتے ہیں تاکہ معترضین کو معلوم ہو سکے کہ مہم جو مسلمانوں نے کتنا مال غنیمت واپس عرب بھیجا اور کتنے مسلمان واپس عرب جاتے ہوئے لوٹ کا مال اپنے ساتھ لے گئے۔ یہاں یہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کہ ان "غارت گروں" کے زیر تسلط آنے والے ان "غارت شدہ" علاقوں میں ترقی، خوشحالی اور احیائے علوم کا کس طرح دور دورہ ہوا۔ اس ذکر کی بھی ضرورت نہیں کہ ان مسلمانوں کو کتنی اذیتیں اور جان و مال کا کتنا بھاری نقصان برداشت کرنا پڑا اور قدم قدم پر انہیں کتنی دھمکیوں اور اشتعال انگیزیوں سے سابقہ پڑا۔ اس قسم

کی رائے رکھنے والے حضرات سے ہم صرف اتنا عرض کریں گے کہ وہ ان تاریخی واقعات کا زیادہ محتاط اور ہوشمندانہ مطالعہ کریں اور پوری دیانتداری اور ذمہ داری سے نتائج پیش کریں۔ تاہم انہیں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ مسلمانوں نے جو مالِ غنیمت حاصل کیا وہ ان نقصانات کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا جو انہیں دشمن کے ہاتھوں قرقی، ضبطی، اذیتوں اور دوسری اشتعال انگیز کارروائیوں کی شکل میں برداشت کرنا پڑے۔

مندرجہ بالا نظریات کے حامل مختلف قسم کے ناقدین ہمارے پیش کردہ نقطۂ نظر کو تسلیم کریں یا نہ کریں یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ اسلام اپنے تمام تر مفاہیم کے ساتھ امن و سلامتی کا دین ہے۔ اس کی تعلیمات میں بے جواز جنگ کی قطعی گنجائش نہیں۔ اس کے اصولوں میں جارحیت کی کوئی جگہ نہیں اور نہ یہ جارحیت کو برداشت کرتا ہے۔ اسے کبھی طاقت کے ذریعے کسی پر مسلط نہیں کیا گیا۔ اسلام کی توسیع جبر و تشدد کے نتیجے میں نہیں ہوئی۔ اللہ خورد برد یا بدعنوانی کو کبھی برداشت نہیں کرتا نہ ایسا کوئی فعل اسلام کی نظر میں پسندیدہ ہے۔ اور جو شخص اسلامی تعلیمات کو مسخ کرتا ہے یا غلط انداز میں پیش کرتا ہے وہ اسلام سے زیادہ اپنے آپ کو اور اپنے ساتھیوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ چونکہ یہ اللہ کا دین اور اس تک رسائی حاصل کرنے کا سیدھا راستہ ہے اس لیے یہ انتہائی مشکل حالات میں بھی قائم رہا اور آیندہ بھی ابدی مسرت تک پہنچنے کے لیے ایک محفوظ پُل کا کام دیتا رہے گا۔ اگر ناقدین کو اس حقیقت کے بارے میں کوئی شک ہو تو انہیں ہمارا مشورہ ہے کہ وہ اسلام کا بنظرِ غائر جائزہ لیں، قرآن کا ازسرِنو مطالعہ کریں اور تاریخ سے متعلق اپنی یادداشت کا اعادہ کریں۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ "مفتوحہ" علاقوں میں اشاعتِ اسلام سے اقتصادی خوشحالی اور ثقافتی احیاء کا دور شروع ہوا لیکن اس کا لازمی طور پر یہ مطلب نہیں کہ مسلمانوں کا نصب العین مالی فوائد اور مالِ غنیمت حاصل کرنا تھا۔ اور اگر اسلامی تاریخ کے آخری ادوار میں مسلمان مبینہ فوائد اور مالِ غنیمت حاصل کرنے کی طرف راغب ہوئے تب بھی اس کا یہ

مطلب ہرگز نہیں نکلتا کہ اسلام جنگ کو امن پر ترجیح دیتا ہے اور مسلمان مالِ غنیمت کے رسیا ہیں۔ اس کی وضاحت کے لیے بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں مثلاً جو لوگ پروٹسٹنٹ اصولِ اخلاق اور سرمایہ داری کی روح سے متعلق قدیم بحث سے واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ بہت سے دیگر عوامل کے ساتھ ساتھ پروٹسٹنٹ فرقہ بھی جدید سرمایہ داری کے فروغ کا باعث بنا لیکن کوئی سنجیدہ ذہن رکھنے والا شخص یہ دلیل پیش نہیں کرے گا کہ پروٹسٹنٹ فرقے کے پیروکاروں نے معاشی طور پر خوشحال بننے کے لئے اپنے اخلاقی اصول مرتب کیے یا موجودہ سرمایہ کاری کا انحصار اب بھی پروٹسٹنٹ کی اخلاقیات پر ہے۔

۲۔ عیسٰی ابنِ مریم

انسانی تاریخ میں جو مسائل سب سے زیادہ متنازعہ رہے ہیں ان میں ایک مسئلہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کا بھی ہے۔ کیا وہ کلیتہً ایک آسمانی یا عالمِ قدس کی مخلوق تھے یا صرف انسان تھے یا پھر وہ بیک وقت نیم آسمانی اور نیم انسانی ہستی تھے؟ کیا ان کی پیدائش کسی بھی دوسرے بچے کی طرح معمول کے مطابق ہوئی تھی یعنی کیا ان کے والد بھی تھے اور والدہ بھی تھیں؟ کیا وہ موسمِ سرما میں پیدا ہوئے تھے یا موسمِ گرما میں؟ عیسائی اور غیر عیسائی ہر دو فرقوں سے تعلق رکھنے والے افراد اس قسم کے سوالات اٹھاتے رہتے ہیں اور اب بھی اٹھاتے ہیں۔ ان امور سے متعلق تنازعات اور اختلافی دلائل حضرتِ عیسٰی علیہ السلام کے زمانے ہی سے شروع ہو گئے تھے اور ان کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ عیسائیوں میں بہت سے فرقے ان مسائل کے بعض غیر اہم پہلوؤں کی تاویل میں معمولی اختلافات کی بنا پر پیدا ہوئے ہیں۔ ان سب باتوں کا علم عیسائیوں کو بھی ہے اور غیر عیسائیوں کو بھی۔ لیکن اس مسئلے میں اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے؟ کیا اسلام ان الجھے ہوئے مسائل کو طے کرنے کے لئے کوئی تاویل پیش کرتا ہے؟ [1]

---

[1] حضرت عیسٰی کی زندگی کے کسی بھی پہلو پر اتفاق رائے نہیں پایا جاتا۔ ان کی پیدائش، زندگی، نزول کی
بقیہ اگلے صفحہ پر

اس سے قبل کہ اس مسئلے پر کچھ کہا جائے تین باتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئیں. پہلی یہ کہ جہاں تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کا تعلق ہے مسلمانوں کو اس پر کوئی تشویش نہیں۔ اُن کا ذہن مطمئن، ضمیر صاف اور عقیدہ پختہ ہے۔ دوسرے یہ کہ مسلمان خدا، مذہب، نبوت، وحی اور انسانیت کے بارے میں جو تصور رکھتے ہیں اس کی بنا پر وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہ صرف ایک تاریخی حقیقت بلکہ خدا کے نہایت برگزیدہ پیغمبروں میں شمار کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ مسلمانوں کے لئے حضرت عیسیٰ پر ایمان لانا اسلام کی ایک بنیادی شرط ہے اور کوئی مسلمان حضرت عیسیٰؑ کی شان کے خلاف کوئی بات کہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ہر مسلمان حضرت عیسیٰؑ اور اللہ کے کسی بھی دوسرے پیغمبر کی اہانت کرنے کی آزادی کو فی الفور مسترد کر دے گا۔

تیسرے یہ کہ یہاں صرف وہی کچھ بیان کیا جائے گا جو قرآن کہتا ہے یا ہمیں سکھاتا تھا۔ اگرچہ عیسائیوں کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں اسلامی عقائد نہایت ناپسندیدہ ہیں لیکن کسی بھی لحاظ سے ان عقائد کا مقصد حضرت عیسیٰ کے کردار کی تخفیف کرنا یا ان کی عظیم شخصیت کو بے وقعت کرنا نہیں ہے۔ اس کے برعکس ان اسلامی عقائد کے تحت حضرت عیسیٰؑ کا ذکر نہایت عزت واحترام سے کیا جاتا ہے اور انہیں وہی درجہ دیا جاتا ہے جو خود

بقیہ حاشیہ} موت اور تدفین کیسے، کب اور کہاں ہوئی؟ کیا واقعی اُن سے معجزات سرزد ہوئے، اگر ہوئے تو ان کی نوعیت کیا تھی؟ انہوں نے مُردوں کو فی الواقعہ زندہ کیا بھی یا نہیں اور اگر کیا تو کب اور کیسے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب پورے یقین اور صحت سے نہیں دیا جا سکتا۔ جگہ کی کمی اور گستاخانہ اور توہین آمیز قسم کے دلائل ہمیں ان اشتعال انگیز مسائل کا بیان مختصر اور محدود رکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ناقدانہ جائزے اور اس موضوع پر اعلیٰ معیار کی کتب کی فہرست کے لئے قاضی محمد برکت اللہ کی کتاب "عیسیٰ ابن مریمؑ — مغالطہ اور واقعیت"

(JESUS SON OF MARY, FALLACY AND FACTUALITY)

(فلاڈلفیا: ڈارنس اینڈ کمپنی) اشاعت ۱۹۷۳ء کا مطالعہ فرمائیں۔

خدا نے انہیں بخشا ہے۔ درحقیقت حضرت عیسیٰ کا جتنا احترام مسلمان کرتے ہیں اتنا بہت سے عیسائی بھی نہیں کرتے۔ لیکن اسلام کے اس رویے کے بارے میں کوئی غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہیئے اور اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں لیا جانا چاہیئے کہ اسلام کا یہ رویہ محض دلجوئی، خوشامد یا مصلحت آمیزی کی خاطر ہے بلکہ اسے سچائی پر محمول کیا جانا چاہیئے جس پر مسلمان غیر متزلزل یقین رکھتے ہیں اور ان کا یہ یقین ہمیشہ قائم رہے گا۔ یہ سچائی ماضی کی ہے، عہد حاضر کی ہے اور مستقبل کی بھی۔

حضرت عیسیٰؑ جس ماحول میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے اس پر کچھ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ جن لوگوں کی طرف انہیں پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ان کی کچھ اپنی خصوصیات تھیں مثلاً (الف) وہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ صحیفوں میں معناً اور لفظاً تصرف کر لیتے تھے اور گمراہ کن تاویلات پیش کرتے تھے (ب) انہوں نے اپنے بعض پیغمبروں کی بات ماننے سے انکار کر دیا جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی شامل تھے اور بعض کو قتل کر دیا اور (ج) دولت کے معاملے میں ان کا رویہ متکبرانہ اور غیر ذمہ دارانہ تھا۔ ارشاد قرآنی ہے:

> پھر یہ تمہارا کیا ڈھنگ ہے کہ جب بھی کوئی رسول تمہاری خواہشات نفس کے خلاف کوئی چیز لے کر تمہارے پاس آیا، تو تم نے اس کے مقابلے میں سرکشی ہی کی، کسی کو جھٹلایا اور کسی کو قتل کر ڈالا (سورہ ۲: آیت ۹۰)

> اللہ نے ان لوگوں کا قول سنا جو کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ ان کی یہ باتیں بھی ہم لکھ لیں گے، اور اس سے پہلے جو وہ پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں وہ بھی ان کے نامۂ اعمال میں ثبت ہے۔ (جب فیصلہ کا وقت آئے گا اس وقت) ہم ان سے کہیں گے کہ لو، اب عذابِ جہنم کا مزہ چکھو۔
>
> (سورہ ۳: آیت ۱۸۱)

> اللہ نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا...... پھر یہ ان کا اپنے عہد کو

توڑ ڈالنا تھا جس کی وجہ سے ہم نے ان کو اپنی رحمت سے دور پھینک دیا اور اُن کے دِل سخت کر دیئے۔ اب ان کا حال یہ ہے کہ الفاظ کا الٹ پھیر کر کے بات کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں، جو تعلیم انہیں دی گئی تھی اس کا بڑا حصہ بھول چکے ہیں۔ (سورہ ۵ : آیات ۱۲ تا ۱۳)

یہ تھی ان لوگوں کی فطرتِ ثانیہ جن کی طرف حضرت عیسیٰؑ کو بھیجا گیا تھا۔ جہاں تک ان کی تاریخ پیدائش کا تعلق ہے مسیحی حضرات ابھی تک کسی خاص سال یا موسم کا تعین نہیں کر سکے "ہیئت دان ابھی تک سٹار آف بیتھلم کی سائنسی توضیح نہیں کر پائے .... نہ تو یہ بات یقینی طور پر معلوم ہو سکی ہے کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش کس سال میں ہوئی نہ یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ستارہ سال کے کون سے موسم میں نمودار ہوا .... مورخین کے اندازے کے مطابق مذکورہ ستارہ ۱۱ قبل از مسیح سے ۴ قبل از مسیح تک کے درمیانی عرصے میں نمودار ہوا ...... جبکہ اس بات کا ابھی تک تعین نہیں ہو سکا کہ حضرت عیسیٰ کی ولادت سال کے کون سے حصہ میں ہوئی۔ اغلب امکان ہے کہ یہ دسمبر میں نہیں بلکہ موسمِ بہار میں ہوئی .... " (یہ بیان ریاستہائے متحدہ امریکہ کی بحری رصدگاہ کی مسز ڈرو گاسنر کا ہے جو "دی ایڈمنٹن جرنل" کی ۲۲، دسمبر ۱۹۶۰ء کی اشاعت کے صفحہ ۱۲ پر چھپا)۔

خیر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مسلمانوں کے نزدیک سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کیسے ہوئی۔ حضرت عیسیٰ کے زمانے تک انسان کی تخلیق تین طریقوں سے ہو چکی تھی اور ہر طریقے میں اللہ، جو کہ خالقِ کائنات ہے، کی طاقت، علم اور دانش کا واضح اظہار موجود تھا۔ پہلے طریقے کے مطابق ایک انسان کی تخلیق کسی جسمانی مداخلت کے بغیر یا معروف اصطلاح میں کسی انسانی باپ یا ماں کی موجودگی کے بغیر ہوئی اور وہ تھے آدم علیہ السلام۔ دوسرے طریقے کے مطابق ایک ایسے انسان کی تخلیق ہوئی جسے کسی ماں یا عورت کے جسمانی وجود کے بغیر پیدا کیا گیا یعنی اسکی جنس کی مثال موجود نہیں تھی اور وہ تھیں

حواجن کی ضرورت حضرت آدمؑ نے پہلے سے محسوس کر لی تھی۔ حضرتِ آدمؑ کو بنی نوع انسان کا علامتی یا مجازی باپ تصور کیا جا سکتا ہے۔ تیسرے طریقے کے مطابق باپوں اور ماؤں کے حسبِ معمول اختلاطات سے لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں لوگوں کو تخلیق کیا گیا۔ متجسس اذہان نے ایک چوتھے طریقے یعنی کسی انسانی باپ کی جسمانی مداخلت کے بغیر انسانی تخلیق کے امکان کے بارے میں سوچا ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو بغیر باپ کے پیدا کر کے چار ممکنہ تخلیقی طریقوں کی تکمیل کر دی اور خالق ہونے کی حیثیت میں اپنی قدرت کا ہر ممکن شکل میں اظہار کر دیا۔ باعصمت مریم کے ہاں حضرتِ عیسیٰ کی پیدائش ایک معجزہ اور مشیّتِ الٰہی کا عمل تھا۔ اُس خاص زمانے میں اس قسم کی تخلیق کا انتخاب جس قدر دلچسپ ہے اتنا ہی قابلِ فہم بھی ہو سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس دَور میں دوا کا استعمال کسی نہ کسی شکل میں یا کسی نہ کسی علاقے میں ضرور ہوتا ہوگا۔ حضرت عیسیٰ کے معاصرین نے اللہ کے بتائے ہوئے راستے سے انحراف اور سرکشی اختیار کی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک نئے طریقہ تخلیق سے اپنی قدرت کا مظاہرہ کیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اُن پر ثابت کر دیا کہ اُس کی طاقت لامحدود ہے اور اُن کی نجات صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اُس پر ایمان لانے میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت و طاقت کی مثال حضرت عیسیٰ کی تخلیق کر کے پیش کی۔ اس قسم کی تخلیق شاید ایک خاص قسم کے معجزات کی پیش بندی کے طور پر کی گئی جو بعد میں حضرت عیسیٰؑ نے اللہ کی مدد سے انجام دیے تھے۔ یہ معجزات کم و بیش طبی نوعیت کے تھے۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حضرت عیسیٰ کی ولادت کی یہ فرضی تاویل قرآنی استناد یا رسول اللہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پر مبنی نہیں ہے۔ تخلیق کے منطقی طور پر چار ممکنہ صورتیں اور یہ استنباط کہ حضرت عیسیٰ کی ولادت تخلیق کی چوتھی اور آخری صورت تھی راقم الحروف کا محض ذاتی نقطۂ نظر اور خود اپنا قائم کردہ مفروضہ ہے۔ اس ذاتی نظریّہ کا قرآن اور احادیثِ رسولؐ کی سند اور اصلیت سے کوئی تعلق نہیں۔ تخلیق کی چار ممکنہ اقسام

سے متعلق یہ پیش کردہ مفروضہ خواہ قوی ہو یا کمزور کسی طرح بھی مسلمانوں کے اُس عقیدے پر اثر انداز نہیں ہوتا جو وہ قرآن کی صداقت اور ولادتِ عیسٰی سے متعلق قرآن کے اس بیان پر رکھتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک معجزانہ عزم اور فعل تھا۔ بہر حال یہ پورا معاملہ قابلِ غور اور تحقیق طلب ہے۔

اب اگر کوئی شخص حضرت عیسٰیؑ کو اس لیے خدا کا بیٹا یا خدا کہنا چاہتا ہے کہ اُن کو کسی انسانی باپ کے بغیر پیدا کیا گیا یا خود خدا نے انہیں متبنّٰی بنایا یا اُن کے باپ کی جگہ لی، اور اگر اس دلیل کو صحیح مان لیا جائے تو اس کا اطلاق حضرت آدمؑ کے لیے زیادہ موزوں ہوگا کیونکہ اُن کی تخلیق بغیر باپ کے اور بغیر ماں کے ہوئی۔ اور اگر خدا کی ابویت کی تاویل مجازی یا استعاراتی انداز میں کی جائے تو پھر اس کا اطلاق تمام بنی نوع انسان پر ہونا چاہیے خصوصاً اُن لوگوں پر جنہوں نے اپنے مالک کی بندگی میں شرف و فضیلت حاصل کی۔ تمام انسان اللہ تعالےٰ کی عظیم الشان مخلوق ہیں اور ایک لحاظ سے اُس کے بچے ہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ابویت کو خواہ لغوی معنی پہنائے جائیں یا مجازی اس کا اطلاق صرف حضرت عیسٰیؑ تک محدود رکھنا اور پہلی تاویل کے مطابق حضرت آدمؑ کو اور دوسری تاویل کے مطابق تمام بنی نوع انسان کو نظر انداز کر دینا بڑی زیادتی کی بات ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حضرت عیسٰیؑ کی ولادت کو اس طرح بیان کیا ہے۔

> اور اے نبیؐ! اس کتاب میں مریم کا حال بیان کرو، جبکہ وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر شرقی جانب گوشہ نشین ہو گئی تھی اور پردہ ڈال کر اُن سے چھپ بیٹھی تھی۔ اس حالت میں ہم نے اُس کے پاس اپنی رُوح کو (یعنی فرشتے کو) بھیجا اور وہ اُس کے سامنے ایک پورے انسان کی شکل میں نمودار ہو گیا۔ مریم یکایک بول اُٹھی کہ "اگر تو کوئی خدا ترس آدمی ہے تو میں تجھ سے خدائے رحمان کی پناہ مانگتی ہوں۔" اُس نے کہا "میں تو تیرے

رب کا فرستادہ ہوں اور اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا دوں۔"
مریم نے کہا "میرے ہاں کیسے لڑکا ہوگا جبکہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں
ہے اور میں کوئی بدکار عورت نہیں ہوں۔" فرشتے نے کہا "ایسا ہی ہوگا، تیرا
رب فرماتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لیے بہت آسان ہے اور ہم یہ اس لیے
کریں گے کہ اُس لڑکے کو لوگوں کے لیے ایک نشانی بنائیں اور اپنی طرف سے
ایک رحمت اور یہ کام ہو کر رہنا ہے۔"

مریم کو اس بچے کا حمل رہ گیا اور وہ اس حمل کو لیے ہوئے ایک دُور کے مقام پر چلی
گئی۔ پھر زچگی کی تکلیف نے اُسے ایک کھجور کے درخت کے نیچے پہنچا دیا۔ وہ کہنے لگی۔
کاش میں اس سے پہلے ہی مر جاتی اور میرا نام و نشان نہ رہتا۔" فرشتے نے پائنتی سے
اُس کو پکار کر کہا۔ "غم نہ کر۔ تیرے رب نے تیرے نیچے ایک چشمہ رواں کر دیا ہے اور
تُو ذرا اس درخت کے تنے کو ہلا، تیرے اوپر تر و تازہ کھجوریں ٹپک پڑیں گی۔ پس تُو کھا اور
پی اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر۔ پھر اگر کوئی آدمی تجھے نظر آئے تو اُس سے کہہ دے کہ میں
نے رحمان کے لیے روزے کی نذر مانی ہے۔ اس لیے آج میں کسی سے نہ بولوں گی۔"

پھر وہ اُس بچے کو لیے ہوئے اپنی قوم میں آئی۔ لوگ کہنے لگے۔ "اے مریم یہ تو
تُو نے بڑا پاپ کر ڈالا۔ اے ہارون کی بہن، نہ تیرا باپ کوئی بُرا آدمی تھا اور نہ تیری ماں
ہی کوئی بدکار عورت تھی۔" مریم نے بچے کی طرف اشارہ کر دیا۔ لوگوں نے کہا: "ہم اس سے
کیا بات کریں جو گہوارے میں پڑا ہوا ایک بچہ ہے؟" بچہ بول اُٹھا۔

میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اُس نے مجھے کتاب دی، اور نبی بنایا اور
بابرکت کیا جہاں بھی میں رہوں، اور نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کا حکم دیا جب
تک میں زندہ رہوں، اور اپنی والدہ کا حق ادا کرنے والا بنایا، اور مجھ کو جبار

اور شقی نہیں بنایا، سلام ہے مجھ پر جبکہ میں پیدا ہوا اور جبکہ میں مروں اور جب کہ زندہ کر کے اُٹھایا جاؤں۔"

یہ ہے حضرت عیسیٰ ابنِ مریم اور یہ ہے اُس کے بارے میں وہ سچی بات جس میں لوگ شک کر رہے ہیں۔ اللہ کا یہ کام نہیں کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔ وہ پاک ذات ہے۔ وہ جب کسی بات کا فیصلہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا، اور بس وہ ہو جاتی ہے۔

(اور عیسیٰؑ نے کہا تھا) "اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی، پس تم اُس کی بندگی کرو، یہی سیدھی راہ ہے۔

(سورہ ۱۹: آیات ۱۶ تا ۳۶، نیز مطالعہ کیجئے سورہ ۳: آیات ۴۲ تا ۶۴، سورہ ۴: آیات ۱۷۱ تا ۱۷۲، سورہ ۵: آیت ۱۷ و آیات ۷۲ تا ۷۵، سورہ ۲۵: آیت ۲، سورہ ۴۳: آیات ۵۷ تا ۶۵)

اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو جو مشن تفویض کیا تھا وہ خون کی قربانی دے کر مکمل کفارہ کے ذریعے نجات کا سامان کرنا نہیں تھا بلکہ خلقِ خدا کی صحیح رہنمائی کر کے، انہیں ضبطِ نفس کی تعلیم دے کر، جامد ذہنوں کو متحرک کر کے اور شقاوتِ قلبی رحمدلی میں بدل کر انہیں نجات کا راستہ دکھانا تھا۔ اُن کا کام اللہ تعالیٰ کا صحیح مذہب متعارف کرانا اور اُس کی الہامی ہدایات، جن کو غلط تاویلات سے مسخ کر دیا گیا تھا، کو از سرِ نو بحال کرنا تھا۔ اُن فاترالذہن اور شقی القلب انسانوں میں تبدیلی لانے کے لیے حضرت عیسیٰؑ نے نہ صرف اللہ کا پیغام اُن تک پہنچایا بلکہ انہیں ٹھوس نشانیاں بھی دکھائیں اور اپنے مشن کی تائید میں معجزے سرانجام دیے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو منطقی اور روحانی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ مافوق الفطرت اور ماورائی رفعتوں سے بھی نوازا تھا تاکہ اُس زمانے کے شقی القلب انسانوں کو اللہ تعالےٰ کا سیدھا راستہ دکھایا جا سکے۔ حضرت عیسیٰؑ کے مشن اور اُن کی سچائیوں کی "معجزانہ" نوعیت کے بارے میں قرآنِ مجید کا ارشاد ہے:

اور جب فرشتوں نے کہا: اے مریمؑ! اللہ تعالیٰ تجھے اپنے ایک فرمان کی خوشخبری دیتا ہے۔ اس کا نام مسیح عیسیٰ ابنِ مریم ہوگا، دنیا اور آخرت میں معزز ہوگا، اللہ کے مقرب بندوں میں شمار کیا جائے گا، لوگوں سے گہوارے میں بھی کلام کرے گا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی، اور وہ ایک مردِ صالح ہوگا۔" یہ سُن کر مریم بولی "پروردگار! میرے ہاں بچہ کہاں سے ہوگا، مجھے تو کسی مرد نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔" جواب ملا "ایسا ہی ہوگا، اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ وہ جب کسی کام کے کرنے کا فیصلہ فرماتا ہے تو بس کہتا ہے کہ ہوجا اور وہ ہوجاتا ہے۔" (فرشتوں نے پھر اپنے سلسلۂ کلام میں کہا) "اور اللہ اُسے کتاب اور حکمت کی تعلیم دے گا، تورات اور انجیل کا علم سکھائے گا اور بنی اسرائیل کی طرف اپنا رسول مقرر کرے گا۔"

(اور جب وہ بحیثیتِ رسول بنی اسرائیل کے پاس آیا تو اُس نے کہا) "میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں۔ میں تمہارے سامنے مٹی سے پرندے کی صورت کا ایک مجسمہ بناتا ہوں اور اس میں پھونک مارتا ہوں، وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے۔ میں اللہ کے حکم سے مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتا ہوں اور اُس کے اذن سے مردے کو زندہ کرتا ہوں۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا اپنے گھروں میں ذخیرہ کرکے رکھتے ہو۔ اس میں تمہارے لیے کافی نشانی ہے اگر تم ایمان لانے والے ہو۔ اور میں اُس تعلیم و ہدایت کی تصدیق کرنے والا بن کر آیا ہوں جو تورات میں سے اس وقت میرے زمانہ میں موجود ہے۔ اور اس لیے آیا ہوں کہ تمہارے لیے بعض اُن چیزوں کو حلال کردوں جو تم پر حرام کردی گئی ہیں۔ دیکھو میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی

لے کر آیا ہوں، لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی، لہٰذا تم اُسی کی بندگی اختیار کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔

(سورہ ۳ : آیات ۴۵ تا ۵۱)

پھر تصور کرو اُس موقع کا جب اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ "اے مریم کے بیٹے عیسیٰ ؑ، یاد کر میری اس نعمت کو جو میں نے تجھے اور تیری ماں کو عطا کی تھی۔ میں نے روحِ پاک سے تیری مدد کی، تو گہوارے میں بھی لوگوں سے بات کرتا تھا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی، میں نے تجھ کو کتاب اور حکمت اور توریت اور انجیل کی تعلیم دی، تو میرے حکم سے مٹی کا پتلا پرندے کی شکل کا بناتا اور اس میں پھونکتا تھا اور وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتا تھا، تو مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کرتا تھا، تو مُردوں کو میرے حکم سے نکالتا تھا۔ پھر جب تو بنی اسرائیل کے پاس صریح نشانیاں لے کر پہنچا اور جو لوگ ان میں سے منکرِ حق تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ نشانیاں جادوگری کے سوا اور کچھ نہیں ہیں تو میں نے ہی تجھے اُن سے بچایا، اور جب میں نے حواریوں کو اشارہ کیا کہ مجھ پر اور میرے رسول ؑ پر ایمان لاؤ تب انہوں نے کہا" ہم ایمان لائے اور گواہ رہو کہ ہم مسلم ہیں"۔

(حواریوں کے سلسلہ میں) یہ واقعہ بھی یاد رہے کہ جب حواریوں نے کہا "اے عیسیٰ ؑ ابنِ مریم، کیا آپ کا رب ہم پر آسمان سے کھانے کا ایک خوان اُتار سکتا ہے"؟ تو عیسیٰ ؑ نے کہا کہ اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔ انہوں نے کہا "ہم بس یہ چاہتے ہیں کہ اُس خوان سے کھانا کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہوں اور ہمیں معلوم ہو جائے کہ آپ نے جو کچھ ہم سے کہا ہے وہ سچ ہے اور ہم اُس پر گواہ ہوں"۔ اس پر عیسیٰ ابن مریم نے دعا کی "خدایا، ہمارے

ربّ، ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل کر جو ہمارے لیے اور ہمارے اگلوں پچھلوں کے لیے خوشی کا موقع قرار پائے اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو، ہم کو رزق دے اور تو بہترین رازق ہے۔" اللہ نے جواب دیا۔ میں اُس کو تم پر نازل کرنے والا ہوں، مگر اُس کے بعد جو تم میں سے کفر کرے گا اُسے میں ایسی سزا دوں گا جو میں نے کسی کو نہ دی ہوگی" — غرض جب (یہ احسانات یاد دلا کر) اللہ فرمائے گا کہ "اے عیسیٰ ابن مریم، کیا تُو نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا مجھے اور میری ماں کو بھی خدا بنالو؟" تو وہ جواب میں عرض کرے گا کہ "سبحان اللہ، میرا یہ کام نہ تھا کہ وہ بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے حق نہ تھا...... میں نے اُن سے اُس کے سوا کچھ نہیں کہا جس کا آپ نے حکم دیا تھا، یہ کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ میں اُسی وقت تک اُن کا نگراں تھا جب تک کہ میں اُن کے درمیان تھا۔ جب آپ نے مجھے واپس بلا لیا تو آپ اُن پر نگراں تھے اور آپ تو ساری چیزوں پر نگران ہیں۔

(سورہ ۵ : آیات ۱۱۰ تا ۱۱۷)

یہ آیات قرآن مجید میں جا بجا پائی جانے والی اس جیسی بہت سی دوسری آیات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان تمام آیات میں اس حقیقت پر زور دیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے کبھی خدا یا خدا کا بیٹا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ نیز یہ کہ وہ اسی طرح خدا کے بندے اور پیغمبر تھے جس طرح اُن سے پہلے بہت سے دوسرے گزرے تھے۔ اللہ تعالیٰ اس حقیقت کو اس طرح پُر زور طریقے سے بیان کرتا ہے۔

پھر ہم نے ان پیغمبروں کے بعد مریمؑ کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا۔ تورات میں سے جو کچھ اُس کے سامنے موجود تھا وہ اس کی تصدیق کرنے والا تھا۔

اور ہم نے اس کو انجیل عطا کی جس میں رہنمائی اور روشنی تھی اور وہ بھی توراۃ میں سے جو کچھ اس وقت موجود تھا اُس کی تصدیق کرنے والی تھی اور خدا ترس لوگوں کے لیے سراسر ہدایت اور نصیحت تھی۔

(سورہ ۵: آیت ۴۶)

یقیناً کفر کیا اُن لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ مسیح ابن مریم ہی ہے حالانکہ مسیح نے کہا تھا کہ "اے بنی اسرائیل، اللہ تعالیٰ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تیرا رب بھی"۔ جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا اُس پر اللہ تعالیٰ نے جنت حرام کر دی اور اُس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ یقیناً کفر کیا اُن لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں سے ایک ہے، حالانکہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ اگر یہ لوگ اپنی ان باتوں سے باز نہ آئے تو ان میں سے جس نے کفر کیا ہے اس کو دردناک سزا دی جائے گی۔ پھر کیا یہ اللہ تعالیٰ سے توبہ نہ کریں گے اور اس سے معافی نہ مانگیں گے؟ اللہ تعالیٰ بہت درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ مسیح ابن مریم اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول تھا، اُس سے پہلے اور بھی بہت سے رسول گزر چکے تھے، اُس کی ماں ایک راست باز عورت تھی، اور وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھو ہم کس طرح اُن کے سامنے حقیقت کی نشانیاں واضح کرتے ہیں، پھر دیکھو یہ کدھر اُلٹے پھرے جاتے ہیں۔" (سورہ ۵: آیات ۷۲ تا ۷۵)

کہو: اے اہلِ کتاب، اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور اُن لوگوں کے تخیلات کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے خود گمراہ ہوئے اور بہتوں کو گمراہ کیا اور "سواء السبیل" سے بھٹک گئے۔ (سورہ ۵: آیت ۷۷)

حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کا آغاز بھی متنازعہ تھا اور انجام بھی متنازعہ۔ اپنی عمر کے درمیانی عرصے میں انہوں نے اپنا مشن بڑی مستقل مزاجی سے آگے بڑھایا۔ اس دوران انہیں اللہ کے نازل کردہ صحیفے، عقل و دانش، واضح نشانیوں اور مقدس جذبے کی مدد اور تقویت حاصل رہی۔ اس کے باوجود بہت کم لوگ ایسے تھے جنہوں نے اُن کی بات کو دل وجان سے تسلیم کیا۔ حضرت عیسیٰ اگرچہ طبعاً روادار اور صُلح جُو تھے لیکن اُن کے لیے بنی اسرائیل کی منافقت اور مقصد کو نظرانداز کر کے لفظوں پر اڑے رہنے کی عادت کسی صورت قابلِ برداشت نہ تھی۔ لوگوں نے اُن کے پیغام کو مسترد کر کے ان کی مخالفت شروع کر دی اور انہیں قتل کرنے کی سازش تیار کی۔ اُن کا یہ معمول بن گیا تھا کہ وہ بعض پیغمبروں کی بات ماننے سے انکار کر دیتے تھے اور بعض کو قتل کر دیتے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ اس مروّجہ دستور سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ لوگوں نے انہیں مصلوب کر کے قریباً ہلاک ہی کر دیا۔ دراصل وہ یہ سمجھتے رہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کرنے کی کارروائی مکمل کر لی ہے جس کے نتیجے میں حضرت عیسیٰ ہلاک ہو چکے ہیں۔ اس مرحلے پر داستان اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ کر ڈرامائی شکل اختیار کر لیتی ہے اور عیسائیوں کے لیے مذہبی غم واندوہ اسی طرح مقدس ہو جاتا ہے جس طرح یہودیوں کے لیے گریہ وزاری مقدس تھی۔

دراصل ہوا یوں کہ حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کرنے کی ایک سازش تیار کی گئی۔ اس منصوبے کے مطابق سزائے موت پر حقیقتاً عملدرآمد ہوا اور ایک شخص کو فی الواقع صلیب پر چڑھا دیا گیا لیکن یہ شخص حضرت عیسیٰؑ نہیں تھے۔ یہ کوئی اور شخص تھا جسے حضرت عیسیٰؑ کی جگہ صلیب پر چڑھا دیا گیا تھا۔

جہاں تک خود حضرت عیسیٰؑ کا تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عین وقت پر اُن کی مدد کی اور انہیں دشمنوں سے نجات دلا دی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں پُرتشدد موت سے بچا کر اور انہیں آسمان پر اُٹھا کر زمین پر اُن کے مشن کو بے بہا اعزاز بخشا۔ رہا یہ سوال

کہ اُن کے اُوپر اُٹھائے جانے سے کیا مراد ہے؟ آیا اس سے یہ مطلب لیا جائے کہ شرف و فضیلت عطا کر کے اُن کے رُتبے کو بلند کیا گیا یا انہیں رُوح اور جسم کے ساتھ اوپر اُٹھا لیا گیا یا یہ کہ طبعی موت مرنے کے بعد اُن کی روح کو رفعت بخشی گئی؟ اس ضمن میں ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ اس مسئلے کا اسلامی عقائد سے کوئی زیادہ تعلق نہیں ہے اور نہ ان ممکنہ صورتوں میں سے کسی ایک پر یقین رکھنا ایمان کی شرط ہی ہے کیونکہ مسلمان کے لیے اہم اور لازم بات وہ ہے جو اللہ تعالیٰ ہمیں بتاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب نہیں کیا گیا تھا بلکہ انہیں اللہ تعالیٰ نے اوپر اپنے پاس بُلا لیا تھا۔ قرآن مجید میں حضرت عیسیٰؑ کا انجام اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

اے نبیؐ! یہ اہلِ کتاب اگر آج تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم آسمان سے کوئی تحریر ان پر نازل کراؤ تو اس سے بڑھ چڑھ کر مجرمانہ مطالبے یہ پہلے موسیٰؑ سے کر چکے ہیں۔ اُس سے تو انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو علانیہ دکھا دو اور اسی سرکشی کی وجہ سے یکایک ان پر بجلی ٹوٹ پڑی تھی۔ پھر انہوں نے بچھڑے کو اپنا معبود بنا لیا، حالانکہ یہ کھُلی کھُلی نشانیاں دیکھ چکے تھے اس پر بھی ہم نے اُن سے درگزر کیا۔ ہم نے موسیٰؑ کو صریح فرمان عطا کیا اور ان لوگوں پر طُور کو اٹھا کر ان سے (اس فرمان کی اطاعت کا) عہد لیا۔ ہم نے اُن کو حکم دیا کہ دروازہ میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہو۔ ہم نے اُن سے کہا کہ سَبت کا قانون نہ توڑو اور اس پر ان سے پختہ عہد لیا۔ آخر کار اُن کی عہد شکنی کی وجہ سے، اور اس وجہ سے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا، اور متعدد پیغمبروں کو ناحق قتل کیا، اور یہاں تک کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں محفوظ ہیں ــــ حالانکہ درحقیقت ان کی باطل پرستی کے سبب سے اللہ نے ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا ہے اور اسی وجہ سے یہ

بہت کم ایمان لاتے ہیں ۔ پھر اپنے کفر میں یہ اتنے بڑھے کہ مریم پر سخت بہتان لگایا، اور خود کہا کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابنِ مریم رسول اللہ کو قتل کر دیا ہے ــــ حالانکہ فی الواقع انہوں نے نہ اُس کو قتل کیا نہ صلیب پر چڑھایا بلکہ معاملہ اُن کے لیے مشتبہ کر دیا گیا۔ اور جن لوگوں نے اس کے بارے میں اختلاف کیا ہے وہ بھی دراصل شک میں مبتلا ہیں، اُن کے پاس اس معاملہ میں کوئی علم نہیں ہے، محض گمان ہی کی پیروی ہے۔ انہوں نے مسیح کو یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اُس کو اپنی طرف اُٹھا لیا، اللہ تعالیٰ زبردست طاقت رکھنے والا اور حکیم ہے۔

(سورہ ۴: آیات ۱۵۳ تا ۱۵۸ نیز حوالہ کیلئے دیکھیے سورہ ۳: آیات ۵۲ تا ۵۹)

اسلام نہ صرف اس عقیدے کو مسترد کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اللہ کے دشمنوں کے ہاتھوں مصلوب ہوئے بلکہ اس عقیدے کی اساس کو بھی تسلیم نہیں کرتا۔ اس استرداد کی بنیاد قرآنِ مجید میں خود اللہ تعالیٰ کا مسلم الثبوت بیان ہے جس میں اللہ تعالیٰ یہ بات تسلیم نہیں کرتا کہ حضرت عیسیٰؑ نے خون کی قربانی دی اور نہ اللہ نیابتی بنیاد پر گناہ کے کفارے کو تسلیم کرتا ہے۔ اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ حضرت آدمؑ کا پہلا گناہ اس وقت معاف کیا گیا جب انہوں نے اس گناہ کا خود کفارہ ادا کیا۔ نیز ہر گنہگار، اگر خدا اُسے معاف نہیں کرتا، اپنے گناہوں کے لیے خود جواب دہ ہوگا۔ اور کوئی شخص کسی دوسرے کے گناہوں کا کفارہ ادا نہیں کر سکتا۔ اس وضاحت کے بعد کسی دوسرے شخص کی خاطر خون کی قربانی دینے یا کفارہ ادا کرنے کے عقیدے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ تاہم بعض قدیم عیسائی فرقے حضرت عیسیٰؑ کے مصلوب کیے جانے پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ باسلیدان فرقے سے تعلق رکھنے والے عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کی جگہ کسی اور شخص کو مصلوب کیا گیا۔ ڈوسیٹائی فرقے کے لوگوں کا عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کوئی ٹھوس وجود یا عام انسانوں جیسا جسم نہیں رکھتے تھے بلکہ صرف بادی النظر میں اُن کا ظہور جسدِ انسانی میں ہوا تھا۔ اس طرح اُن کی تصلیب بھی

محض ظاہری یا غیر حقیقی تھی۔ مارشین انجیل (تقریباً ۱۲۸ء) حضرت عیسٰی کی ولادت ہی کو تسلیم نہیں کرتی اور یہ نظریہ پیش کرتی ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں انسان نہیں تھے بلکہ اُن کا ظہور انسانی شکل میں ہوا تھا۔ سینٹ بارناباس کی انجیل جس کا انگریزی ترجمہ ویانا کی سٹیٹ لائبریری میں اور عربی ترجمہ عرب دنیا میں موجود ہے اس نظریہ کی تائید کرتی ہے کہ صلیب پر حضرت عیسٰیؑ کی جگہ کسی دوسرے شخص کو چڑھایا گیا تھا۔

جہاں تک حضرت عیسٰیؑ کے انجام کا تعلق ہے مسلمان اس بارے میں اتنے ہی مطمئن ہیں جتنا کہ وہ اُن کی ولادت کے بارے میں ہیں۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسٰی کو نہ قتل کیا گیا نہ مصلوب، بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عزت و احترام سے اوپر اٹھا لیا اور اپنے پاس جگہ دی۔ اس سارے مسئلے میں مسلمانوں کا ذہن بالکل صاف ہے۔ قرآن مجید نے ان سے متعلق متنازعہ مسائل کا حتمی فیصلہ کر دیا ہے۔ اس عقیدہ سے کہ حضرت عیسٰیؑ کو صلیب پر چڑھا کر ہلاک کیا گیا تھا بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں جن سے گریز ممکن نہیں ہے۔ ان میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں۔

۱۔ کیا حضرت عیسٰیؑ کی تصلیب جس کا تصور عیسائی ذہنوں میں جاگزیں ہے خدا کے انصاف، رحم اور اُس کی قدرت اور حکمت کے شایانِ شان ہے؟

۲۔ کیا یہ بات خدا یا کسی شخص کے لیے قرینِ انصاف ہو سکتی ہے کہ کسی ایسے شخص کو دوسروں کے گناہوں اور خطاؤں کے لیے پشیمان ہونا پڑے جس کا ان گناہوں سے کوئی واسطہ نہیں رہے؟

۳۔ کیا یہ عقیدہ خدا کی رحمت اور حکمت سے مطابقت رکھتا ہے کہ حضرت عیسٰیؑ کی اس طرح تذلیل کی گئی اور انہیں اس طرح قتل کیا گیا جس طرح بیان کیا جاتا ہے؟

۴۔ خدا نے اپنے حلیفوں اور پیاروں کی حفاظت کا جو وعدہ کر رکھا ہے کیا اُسے پورا کرنے کا یہی طریقہ تھا کہ حضرت عیسٰیؑ کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا جاتا تاکہ وہ بآسانی خدا کے

دشمنوں کا شکار ہو جاتے؟ کیا اسی طرزِ عمل کو اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا ایک انداز یا ایفائے عہد کی ایک مثال سمجھ لیا جائے۔

۵۔ کیا یہ عقیدہ جائز اور مناسب ہے کہ خدا جو کہ غفورالرحیم ہے حضرت آدمؑ اور اُن کی اولاد کو اُس ابتدائی گناہ کی وجہ سے نہیں بخش سکتا تھا جو حضرت آدمؑ سے سرزد ہوا تھا اور خدا نے انہیں مسلسل سراسیمگی اور تشویش کی حالت میں رکھا یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ کا ظہور ہوا اور انہوں نے اس گناہ کا کفارہ اپنے خون سے کیا۔

۶۔ قدیم زمانہ کے اہلِ یونان، اہلِ روم، اہل ہند، اہل فارس اور اس طرح کی دوسری اقوام کے ملحدانہ عقائد کے سوا کیا کسی مذہب میں تصلیب اور جان کی قربانی کا عقیدہ ملتا ہے؟

۷۔ کیا بیکس (شراب کا یونانی دیوتا)، اپالو (سورج کا رومی دیوتا یا موسیقی کا یونانی دیوتا) ادونس (روم کا ایک اساطیری کردار جس پر محبت اور حسن کی دیوی فریفتہ تھی) اور دوسرے دیوتا جو کنواری ماؤں سے پیدا ہوئے کے فرضی مجسموں کے شانہ بشانہ انسانی تاریخ میں کوئی شخص حضرت عیسیٰؑ کے ہم پلہ ہے۔

۸۔ حضرت عیسیٰؑ سے جو الفاظ منسوب کیے جاتے ہیں۔ اگر اُن کا موازنہ شراب کے یونانی دیوتا بیکس کے الفاظ سے کیا جائے تو مسئلۂ تصلیب کو سمجھنے کے لیے کیا ہماری سوچ ایک نیا رُخ اختیار نہیں کر لیتی؟ بیکس نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ اس کائنات کا اوّل و آخر ہے اور اپنی جان کی قربانی دے کر عالم انسانیت کو نجات دلانے آیا ہے۔ ان الفاظ میں اور برسوں بعد حضرت عیسیٰ سے منسوب کیے جانے والے الفاظ میں جو مماثلت پائی جاتی ہے کیا اُس سے اس بات کی تحریک نہیں ملتی کہ پورے معاملے کی تہ تک پہنچنے کے لیے ایک نئے جذبے سے تحقیق کی جائے؟

۹۔ آخر روم کے حکام کو حضرت عیسیٰؑ سے کیا اختلاف تھا؛ حضرت عیسیٰؑ اُن کے

اقتدار کے لیے کوئی خطرہ تو نہیں تھے بلکہ فی الحقیقت روم کی سرکردہ شخصیات اور اُن کے گھروں پر حضرت عیسیٰ کے بہت احسانات تھے۔ انہوں نے اپنے حامیوں کو ہدایت کی تھی کہ قیصر کی چیز قیصر کو اور خدا کی چیز خدا کو دو۔ وہ ایک پُرامن مبلغ اور ملک میں امن وامان برقرار رکھنے میں حکامِ روم کے مددگار تھے۔ پھر ان حکام نے ایسے پابندِ قانون شہری اور اپنے حامی کو کیونکر مصلوب کیا؟

۱۰۔ روم کے گورنر پائیلیٹ کے کردار کے بارے میں کتنا کچھ معلوم ہو سکا ہے؟ کیا اُس زمانے کے یہودیوں سے اُس کے تعلقات خوشگوار تھے جنہوں نے حضرت عیسیٰؑ کے خلاف کارروائی کی درخواست کی تھی؟ کیا پائیلیٹ کی حکومت یہودیوں کو نفرت و حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتی تھی؟ کیا وہ رشوت کے لالچ میں آنے والا شخص نہیں تھا۔ اگر اُس کے تعلقات یہودیوں سے خوشگوار نہیں تھے، اگر اسے یہودیوں سے نفرت تھی اور اگر وہ مرتشی تھا تو پھر اُس نے یہودیوں کی خواہش پوری کرنے میں اتنی عجلت کیوں دکھائی؟ اُس نے حضرت عیسیٰؑ کے متمول مداح جوسیف آرماتھائی کی رشوت کیوں قبول نہیں کی؟ لُوک کے مطابق جوسیف مالدار شخص تھا اور حضرت عیسیٰؑ سے اُسے خاص قلبی لگاؤ تھا وہ مشیر تھا اور اُس نے حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کرنے کے فیصلے کے حق میں رضامندی ظاہر نہیں کی تھی۔ کونسل کے ایوان میں ناکام ہونے کے بعد کیا وہ بدعنوان گورنر کو رشوت دے کر حضرت عیسیٰؑ کو صلیب سے بچانے کی کوشش نہیں کر سکتا تھا؟

۱۱۔ حضرت عیسیٰؑ کی مبیّنہ تصلیب کو اُن کے کتنے حواریوں نے فی الواقع دیکھا اور اُن کا کیا ردِعمل تھا؟ کیا میتھیو کی یہ بات (۲۶: ۵۶) درست ہو سکتی ہے کہ اُن کے تمام حواری انہیں چھوڑ کر بھاگ گئے؟ کیا ایک عظیم ہادی کے اتنے عظیم حواریوں کی سالمیّت اور کردار کا یہی معیار ہے؟ صرف ایک منظورِ نظر حواری جون کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اس موقع پر موجود تھا۔ لیکن وہ کتنی دیر وہاں موجود رہا اور اُس زمانے میں

سزا یافتہ شخص کو صلیب پر مرنے میں کتنا وقت لگتا تھا؟ بعض معتبر تاریخی ذرائع کے مطابق اُس زمانے میں سزا یافتہ شخص کو صلیب پر مرنے میں عام طور پر چند دن لگتے تھے (دی چیمبرز انسائیکلو پیڈیا، ۱۹۵۰ء میں صلیب کے موضوع پر دیے گئے مقالے کا مطالعہ فرمائیے) لیکن حضرت عیسیٰؑ کے معاملے میں معمول سے ہٹ کر چند یوم کی بجائے چند گھنٹے کیوں لگے؟ اور پھر انہوں نے صلیب پر کیوں جان دے دی جبکہ اُن کے دوسرے دو ساتھی زندہ رہے؟ اُس تاریکی کے بارے میں کیا رائے قائم کی جائے جو تصلیب کے تین گھنٹے کے دورانیہ میں پورے ملک پر چھایا رہا۔ (میتھیو ۲۷ : ۴۵، مارک ۱۵ : ۳۳، لوک ۲۳ : ۴۴)؟ کیا اس تاریکی اور اُلجھن کے دوران قرمزی رنگ کے پردے کے اندر حضرت عیسیٰؑ کو تبدیل کر کے اُن کی جگہ کسی دوسرے شخص کو مصلوب کیے جانے کا امکان تھا؟

۱۲۔ جو رومن سپاہی حضرت عیسیٰؑ کو صلیب تک لے کر گئے وہ اُن سے کس حد تک شناسا تھے؟ انہیں کیونکر یقین تھا کہ وہ صحیح شخص کو صلیب تک لے کر آئے ہیں؟ جب وہ انہیں گرفتار کرنے گئے تو کیا وہ واقعی انہیں پہچانتے تھے؟ کیا ایسے موقع پر انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کی شناخت میں خاص دلچسپی لی تھی جبکہ پُرمسرت سرکاری تقریبات منعقد ہو رہی تھیں اور تصلیبِ مسیح ایسے غیر متوقع عمل سے عوام کے مشتعل ہونے کا خطرہ نمایاں تھا؟

۱۳۔ کیا کوئی صاحبِ ایمان شخص تصور کر سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ جن کا شمار اللہ تعالےٰ کے پانچ سب سے زیادہ مستقل مزاج اور ثابت قدم پیغمبروں میں ہوتا ہے صلیب پر خُدا کے ساتھ اس انداز میں ہمکلام ہوں گے جس طرح کہ روایت کیا جاتا ہے؟ یعنی انہوں نے ملامت آمیز لہجے میں یا یوں کہنا چاہیے کہ سخت اضطراب کی حالت میں گفتگو کی۔ کیا یہ بات حضرت عیسیٰ ایسے جلیل القدر پیغمبر کے شایانِ شان ہے

کہ وہ آزمائش کے وقت یہ شکوہ کرے کہ خدا نے اُس سے بے وفائی کی ہے؟ کیا آزمائش کے لمحات میں خدا کے ساتھ اس طرح کے اندازِ تخاطب یا ایسے ردِ عمل کو مثال یا نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے؟

۱۴۔ خدا جو نہایت مہربان، غفور الرحیم اور اُونچی شان والا ہے کیا اُس کے لیے اپنے بندوں کے گناہ بخشنے کا یہی ایک طریقہ رہ گیا تھا کہ وہ ایک ایسے شخص کو ظالمانہ اور ذلت آمیز طریقے سے مصلوب کرے جو نہ صرف معصوم تھا بلکہ جس نے اپنی زندگی اُس کی بندگی اور اُس کے مقصد کے فروغ کے لیے وقف کر دی تھی؟ کیا یہی اللہ کی رحمت اور بخشش کا انداز ہے اور یہی اُس کے عدل اور اس کی محبت کا اظہار ہے؟

اگر اُس زمانے کے معاشرتی حالات، دنیاوی حکمرانوں کے طرزِ عمل، عام لوگوں کے ردِ عمل، خدا کے تصور، انسان کے مقام، مذہب اور زندگی کی غرض و غایت وغیرہ ایسے موضوعات کا مطالعہ کیا جائے تو ایسے بہت سے فکر انگیز سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ جب تک ان سوالات کی تسلی بخش وضاحت نہیں ملتی صاحبِ ایمان شخص کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا نہ اُسے ذہنی سکون نصیب ہو سکتا ہے۔ چنانچہ تمام متعلقہ فریقوں کے لیے مناسب ہے کہ وہ اس مسئلے کا سنجیدگی سے مطالعہ کریں اور حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے لیے زیادہ وسیع اور گہری تحقیقات کا بیڑا اٹھائیں۔

تاہم جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے اُن کے ہاں اس قسم کے سوالات کبھی پیدا نہیں ہوتے اور اُن کے لیے ایسی پیچیدگیاں قطعی طور پر غیر متعلقہ ہیں کیونکہ اسلام اس بات پر پختہ یقین رکھتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب یا قتل نہیں کیا گیا تھا بلکہ انہیں عزت بخشی گئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اوپر اٹھا لیا تھا۔ عیسائی لٹریچر میں روایت ہے کہ مصلوب ہونے کے بعد حضرت عیسیٰؑ نے اپنے بعض حواریوں سے ملاقات کی۔ اُن کے دوبارہ نمودار ہونے کا اغلب امکان ہے۔ اور ایسا ہونا اسلامی عقائد سے قطعاً متصادم نہیں۔ اگر

یہ بات درست ہے کہ وہ ظہور پذیر ہوئے تو مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق اُن کا یہ ظہور صلیب پر موت سے ہمکنار ہونے کے بعد نہیں بلکہ پناہ لینے کے بعد تھا۔ یہ پناہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے لی تھی اور اُس منصوبے کا حصّہ تھی جو اللہ تعالیٰ نے انہیں بچانے اور دشمنوں کی مذموم سازش کا توڑ کرنے کے لیے بنایا تھا۔ دشمن کے منصوبے کے مطابق اُن کے ہاتھوں مصلوب اور ذلیل ہونے کے بجائے اللہ تعالیٰ کے جوابی منصوبے کے ذریعے حضرت عیسیٰؑ کا رتبہ اور بلند ہو گیا اور انہیں زیادہ عزت ملی۔

مسلمانوں کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ کی عظمت اور اُن کے کردار کی شانِ امتیاز عیسائیوں کے اس عقیدے سے جنم نہیں لیتی کہ انہیں اُن کی تعلیمات کی پاداش میں صلیب پر چڑھا دیا گیا اور یوں مصلوب ہو کر انہوں نے تمام بنی نوع انسان کے گناہوں کا کفّارہ ادا کر دیا۔ اگر عیسائیوں کا یہ عام عقیدہ درست ہے تو پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ کفّارہ کے لیے حضرت عیسیٰؑ کی قربانی بے سُود تھی کیونکہ گناہوں کا خاتمہ ابھی نہیں ہوا۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں اور بھی بہت سے ہیرو پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے اپنے اعلیٰ یا ادنیٰ نصب العین کے فروغ کے لیے جان کی قربانی دی۔ اس قسم کے ہیرو جرمنوں، اتحادیوں، کمیونسٹوں، اقوامِ متحدہ کے اہلکاروں، مذہبی جنگجوؤں، حصولِ آزادی کے لیے لڑنے والوں غرض ہر قوم اور ہر قسم کے لوگوں میں آپ کو مل جائیں گے۔ پس یہ پُر تشدد موت اگر مرنے والے کو لائقِ پرستش بنا سکتی ہے تو پھر انسانوں کے لیے ان گنت خدا اور دیوتا ہیں۔ اور اگر کوئی شخص دوسرے بے شمار بہادروں کو جنہوں نے اس قسم کے حالات میں جان کی قربانی دی نظر انداز کر کے صرف حضرت عیسیٰؑ ہی کو خدا ماننے پر زور دیتا ہے تو اُس کا یہ رویّہ سراسر یک طرفہ اور من مانی کارروائی ہو گا۔

مزید برآں مسلمانوں کو کسی ایسے مسئلے کا سامنا نہیں ہے جس میں اس قسم کا تناقض پایا جاتا ہو۔ اُن کے نزدیک حضرت عیسیٰ کی عظمت اس حقیقت سے عیاں ہے کہ

انہیں خدا نے منتخب کیا تھا۔ خدا نے خود اپنے الفاظ میں انہیں عزت بخشی۔ اُن پر خدا کی طرف سے وحی نازل ہوئی اور انہیں خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچانے کا فریضہ سونپا گیا۔ وہ ایک صاحبِ کردار اور صاحبِ شخصیت پیغمبر تھے۔ وہ بظاہر اور بباطن ایک سچے انسان تھے۔ انہوں نے منافقت اور کفر کے خلاف جنگ کی۔ وہ ابتدا میں اپنی پیدائش کے وقت اور آخر میں اوپر اٹھائے جانے کے وقت ایک سربرآوردہ اور امتیازی شان کے حامل انسان تھے۔ وہ لوگوں کے رہبر و رہنما اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کے لیے رحمت تھے۔ اُن پر اور اُن کے قبیل کے پیغمبروں پر سلامتی ہو۔

اب تک ہم نے جو جائزہ پیش کیا ہے اُس کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ اس کی روشنی میں ہم حضرت عیسیٰؑ اور اُن کے مشن سے متعلق قرآنی آیات کو زیرِ بحث نہیں لا سکتے۔ جو کچھ یہاں بیان کیا گیا ہے وہ اس موضوع کا محض ایک بنیادی حصہ ہے۔ مزید غور و خوض اور تحقیق کے لیے ہم قارئین کو قرآن مجید کا مطالعہ کرنے کا مشورہ دیں گے۔ حوالہ جات کی تلاش کو سہل بنانے کے لیے ہم یہاں ایک فہرست دے رہے ہیں جس میں موضوع سے متعلقہ سورتوں اور آیات کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔

سورت نمبر	آیات نمبر	سورت نمبر	آیات نمبر
۲	۸۷، ۱۳۶، ۲۵۳	۱۹	۱ تا ۴۰
۳	۴۲ تا ۵۹ ،۸۴	۲۳	۵۰
۴	۱۵۶ تا ۱۵۹، ۱۷۱، ۱۷۲ تا ۱۷۲	۳۳	۷
۵	۱۷، ۴۶، ۷۲، ۷۵،	۴۲	۱۳
	۷۸، ۱۱۰ تا ۱۱۸	۴۳	۵۷ تا ۶۵
۶	۸۵	۵۷	۲۷
۹	۳۰ تا ۳۱	۶۱	۶، ۱۴

۳۔ تعدّدِ ازدواج

درحقیقت تعدّدِ ازدواج سے مراد ہے "چند زنی" یا "چند شوہری" یعنی بیک وقت ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا یا ایک سے زیادہ شوہر رکھنا۔ اگر کوئی مرد بیک وقت ایک سے زیادہ بیویاں رکھتا ہے تو اُس کے لیے زیادہ قطعی یا واضح اصطلاح "چند زنی" ہے جسے "تعدّدِ ازدواج" یا "تعددِ ازواج" بھی کہہ سکتے ہیں لیکن چونکہ ایک متوسط درجے کا عام قاری "تعدّدِ ازدواج" اور "چند زنی" میں کوئی امتیاز نہیں کرتا اس لیے ہم ان دونوں اصطلاحوں کو متبادل معنوں میں استعمال کریں گے۔ اس حوالے سے جب ہم لفظ "تعددِ ازدواج" یا "تعددِ ازواج" استعمال کریں گے تو اس کا مطلب "چند زنی" یعنی بیک وقت ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا ہی ہوگا۔ اسی طرح لفظ "کثیر الازدواج" یا "کثیر الازواج" کے لغوی معنی بیک وقت ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے والا یا ایک سے زیادہ شوہر رکھنے والی ہے۔ لیکن یہاں پر یہ لفظ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے والے کے معنوں میں استعمال ہوگا جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی عورت بیک وقت ایک سے زیادہ شوہر رکھے تو اُس کیلئے "چند شوہری" یا "تعددِ شوہری" کی اصطلاحات استعمال ہوں گی۔ اگر ایک سے زیادہ مرد اور ایک سے زیادہ عورتیں بیک وقت باہم شادی شدہ ہوں تو یہ "گروہی شادی" یا "اجتماعی شادی" کہلائے گی۔

تعددِ ازدواج کی یہ تین بنیادی قسمیں مختلف ادوار، مختلف معاشروں اور مختلف حالات میں کم وبیش رائج رہی ہیں۔ ان میں سے سب سے زیادہ عام قسم "چند زنی" یعنی ایک مرد کا بیک وقت زیادہ عورتوں سے شادی کرنا ہے۔ (اوپر وضاحت کی جا چکی ہے کہ "چند زنی" کی بجائے ہم "تعددِ ازدواج" کی اصطلاح بھی استعمال کر سکتے ہیں جیسا کہ عام

طور پر کی جاتی ہے) تاہم دنیا بھر میں کسی بھی علاقے کی آبادی میں شادی کی یہ عام قسم بھی بہت محدود پیمانے پر رائج ہے اور تعددِ ازدواج میں یہ واحد قسم ہے جس کی اسلام نے اجازت دی ہے۔ تعددِ ازدواج کی دوسری دو قسموں یعنی تعددِ شوہری اور گروہی شادی کی اسلام میں قطعی طور پر ممانعت ہے۔

تاہم یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ یہودیت اور عیسائیت میں ہمیشہ یک زوجگی (ایک وقت میں ایک شادی) کا دستور رہا ہے یا وہ تعددِ ازدواج کے کلیتہً خلاف رہے ہیں۔ بلکہ آج بھی ایسا نہیں ہے۔ بعض ممتاز یہودی علماء مثلاً گوئٹین (GOITEIN) (صفحات ۱۸۴ تا ۱۸۵) کی وساطت سے پتہ چلتا ہے کہ نوآباد کثیر الازواج یہودی اسرائیل کے رہائشی حکام کے لیے طرح طرح کی مشکلات اور پریشانیوں کا موجب بنتے ہیں۔ عیسائیوں کے مذہبی فرقے مارمن کے نظریات سے کون واقف نہیں۔ اسی طرح افریشیائی پادری بھی اسی نقطۂ نظر کے حامل ہیں اور وہ شریکِ حیات سے بے وفائی، شادی سے قبل رضاکارانہ جنسی اختلاط اور شریکِ حیات کے تبادلہ پر تعددِ ازدواج کو ترجیح دیتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق صرف ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں شریکِ حیات کو ادل بدل کرنے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔

رسمی یک زوجگی کی سختی سے پابندی کا عصمت فروشی، ہم جنس پرستی، ناجائز اولاد، بے وفائی اور عام جنسی بے راہروی کے واقعات سے گہرا تعلق ہے۔ اگر اس تعلق کا جائزہ لیا جائے تو حیرت انگیز انکشافات سامنے آتے ہیں۔ اس سلسلے میں یونان و روم اور یہود و نصاریٰ کی تہذیبوں کے تاریخی ریکارڈ سے جو حقائق منکشف ہوتے ہیں وہ کسی اور معاشرتی تاریخ میں نہیں ملتے۔[۲]

---

[۲] حوالہ جات کے لیے ملاحظہ فرمایئے "مختلف ادوار میں اہلِ یہود و اہلِ عرب کے باہمی روابط" (JEWS AND ARABS: THEIR CONTACTS THROUGH THE AGES) نیو یارک

اب ہم واپس اسلام کی طرف آتے ہیں۔ مغربی دنیا میں ہمیں بہت سے ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے جن کے تصور میں مسلمان ایک ایسا شخص ہے جو نفسانی جذبات سے مغلوب ہوتا ہے اور جس نے ایک سے زیادہ بیویاں اور محدود یا غیر محدود تعداد میں داشتائیں رکھی ہوتی ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگ جب کسی مسلمان کو ایک بیوی کے ساتھ یا کسی مسلمان کو غیر شادی شدہ دیکھتے ہیں تو حیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ اُن کے خیال میں مسلمان اپنی ایک بیوی یا کئی بیویوں کو چھوڑ کر کسی اور عورت کو بیوی بنانے میں مکمل طور پر آزاد ہوتا ہے اور یہ کام اُس کے لیے اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جانا یا اپنا لباس تبدیل کرنا۔ اس سوچ کو کچھ تقویت تو ہیجانی قسم کی متحرک تصویروں اور سستے قسم کے افسانوی ادب سے اور کچھ بعض مسلمانوں کے غیر ذمہ دارانہ رویّے سے ملی ہے۔ اس صورتِ حال کا ناگزیر نتیجہ یہ نکلا ہے کہ دنیا کے کروڑوں انسان اسلام کے روشن پہلوؤں پر نظر ڈالنا اور اس کے معاشرتی فلسفے پر غور کرنا تک گوارا نہیں کرتے۔ یہاں ایسے ہی لوگوں کے لیے اس مسئلے پر اسلامی نقطۂ نظر سے بحث کی جائے گی جس کے مطالعہ کے بعد ہر شخص اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق خود نتائج اخذ کرنے میں آزاد ہوگا۔

تعددِ ازدواج کی روایت پوری انسانی تاریخ میں رائج رہی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ اور دوسرے پیغمبروں نے، بادشاہوں

مصنفہ ایس ڈی گوبیٹن (نیویارک شوکن بکس) ۱۹۶۴ء "اخلاقیات کا ارتقا: علم الاخلاق کا تقابلی مطالعہ" (MORALS IN EVOLUTION. A STUDY OF COMPARATIVE ETHICS) مصنفہ ایل۔ ٹی ہاب ہاؤس۔

(لندن چیپ مین اینڈ ہال)، ۱۹۵۱ء، "شادی کی مختصر تاریخ" (A SHORT HISTORY OF MARRIAGE) مصنفہ ای۔ اے۔ ویسٹر مارک (نیویارک: دی میکملن کمپنی) ۱۹۲۶ء۔

اور والیانِ سلطنت نے اور اہلِ مشرق اور اہلِ مغرب نے قدیم اور جدید زمانے میں اس روایت پر عمل کیا ہے۔ آج بھی مشرق و مغرب کے مسلمان اور غیر مسلم افراد مختلف صورتوں میں اس پر عمل پیرا ہیں جن میں بعض صورتیں قانونی اور بعض غیر قانونی اور منافقانہ ہیں، بعض رازدارانہ اور بعض علانیہ ہیں۔ یہ معلوم کرنا زیادہ مشکل نہیں کہ ایک بڑی تعداد میں شادی شدہ لوگ کہاں اور کس طرح اپنی پسند کی داشتائیں یا محبوبائیں رکھتے ہیں یا اپنے دلداروں کے ہاں آتے جاتے ہیں یا غیر عورتوں کے ساتھ گھومتے پھرتے ہیں اور انہیں رواجی قانون کا تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ معلّمینِ اخلاق اسے پسند کریں یا نہ کریں یہ نکتہ اپنی جگہ ہے کہ تعدّدِ ازدواج اب بھی رائج ہے، اسے ہر جگہ دیکھا جا سکتا ہے اور تاریخ کے تمام ادوار میں اس کا سراغ ملتا ہے۔

نزولِ انجیل کے زمانے میں تعدّدِ ازدواج معاشرے میں قابلِ قبول اور مروّج تھا۔ اسے مذہبی، معاشرتی اور اخلاقی طور پر قبول کیا جاتا تھا اور کوئی اس پر معترض نہیں ہوتا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انجیل نے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی کیونکہ یہ اُس زمانے کی ایک حقیقت اور ایک معمول کی بات تھی۔ انجیل اس کی ممانعت نہیں کرتی نہ اس کو کسی ضابطے میں لاتی ہے اور نہ اس پر کوئی پابندی ہی عائد کرتی ہے۔ بعض حضرات نے انجیل میں مذکور دس دوشیزاؤں کی حکایت کی تاویل یوں کی ہے کہ اس سے بیک وقت دس بیویاں رکھنے کی اجازت ملتی ہے۔ انجیل میں تعدّدِ ازدواج سے متعلق پیغمبروں، بادشاہوں اور سردارانِ قبیلہ کی حکایات ناقابلِ یقین معلوم ہوتی ہے۔

جب خاتم النبیین حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اسلام کی تبلیغ شروع کی تو تعدّدِ ازدواج کا رواج عام اور اُس زمانے کی معاشرتی زندگی کی جڑوں میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ اسلام نے اس رواج کو نظر انداز یا ترک نہیں کیا نہ اسے بے لگام یا ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد رہنے دیا۔ اسلام اس مسئلے سے بے تعلق نہیں رہ سکتا تھا یا تعدّدِ ازدواج سے

متعلق غیرِ ذمہ دارانہ رویّے اور بد نظمی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ جس طرح اسلام نے اُس زمانے کی دوسری رسومات میں مداخلت کی اسی طرح قرآن نے تعدّدِ ازدواج کے ادارے کو بھی منظم اور مہذب بنانے کے لیے اقدامات کیے تاکہ اس کی روایتی خرابیوں کو دُور کر کے اس کے فوائد کو یقینی بنایا جا سکے۔ اس مداخلت کی وجہ یہ تھی کہ قرآن مجید کا مطمحِ نظر ایک حقیقت پسندانہ طرزِ عمل اختیار کرنا تھا اور اللہ تعالیٰ کی یہ کتابِ برحق خاندان کے ڈھانچے میں، جو کہ معاشرے کی اصل بنیاد ہے، کسی قسم کی بد نظمی کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ قرآنِ حکیم کی بابرکت مداخلت کے ذریعے تعدّدِ ازدواج کے لیے حسبِ ذیل ضوابط مقرر کیے گئے۔

۱۔ تعدّدِ ازدواج کی اجازت مخصوص شرائط کے ساتھ اور خاص حالات کے تحت دی گئی۔ یہ ایک مشروط اجازت ہے۔ ایمان کی شق یا امرِ لازم نہیں ہے۔

۲۔ یہ اجازت زیادہ سے زیادہ چار بیویوں تک محدود ہے۔ اسلام سے پہلے اس قسم کی کوئی حد یا تحفظات کی ضمانت نہیں تھی۔

۳۔ اگر کوئی مسلمان مرد دوسری یا تیسری بیوی لاتا ہے تو اس نئی بیوی کو بھی وہی حقوق اور مراعات حاصل ہوں گی جو پہلی بیوی کو ہیں۔ وہ ہر اُس چیز کا حق رکھتی ہے جس کا حق پہلی بیوی کو حاصل ہے۔ بیویوں کے ساتھ برتاؤ، اشیاء کی فراہمی اور محبت و شفقت میں مساوات برقرار رکھنا تعدّدِ ازدواج کی بنیادی شرط ہے جس کا پُورا کرنا ہر اُس شخص کے لیے ضروری ہے جو ایک سے زیادہ بیویاں رکھتا ہے۔ اس مساوات کا دارومدار زیادہ تر متعلقہ شخص کے باطن یا ضمیر پر ہے۔

۴۔ تعدّدِ ازدواج کی اجازت عام معمول سے ہٹ کر ایک استثنائی صورت ہے۔ یہ اجازت دراصل بعض معاشرتی اور اخلاقی مسائل حل کرنے اور ناگزیر مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کی ایک آخری کوشش ہے۔ المختصر یہ ایک ہنگامی اقدام ہے

اور اسے انہی معنوں تک محدود رکھنا چاہیے۔

اس موضوع سے متعلق قرآنی آیت اس طرح ہے۔

اور اگر تم کو اندیشہ ہے کہ یتیموں کے ساتھ انصاف نہ کر سکو گے تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں اُن میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کر لو۔ لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو یا اُن عورتوں کو زوجیت میں لاؤ جو تمہارے قبضہ میں آئی ہیں۔ بے انصافی سے بچنے کے لیے یہ زیادہ قرین صواب ہے۔"

(سورہ ۴: آیت ۳)

یہ آیتِ کریمہ جنگِ اُحد کے بعد نازل ہوئی جس میں بہت سے مسلمان شہید ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنے پیچھے بیوائیں اور یتیم بچے چھوڑے تھے جن کی مناسب نگہداشت زندہ بچ رہنے والے مسلمانوں پر فرض تھی۔ ان بیواؤں اور یتیموں کو تحفظ دینے کا ایک طریقہ شادی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے یتیموں کے حقوق کے تحفظ اور سرپرستوں کو اپنے متوسلین سے ناانصافی کرنے سے باز رکھنے کے لیے یہ انتباہ کیا اور بیویوں کے انتخاب کے معاملے میں انہیں مکمل اختیار دیا۔

اگر مسئلے کو اس پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تعددِ ازدواج کی بنیاد اسلام نے نہیں رکھی۔ نیز اسلام نے اس سلسلے میں مذکورہ ضوابط نافذ کر کے اس کی اصولی طور پر حوصلہ افزائی نہیں کی۔ اسلام نے تعددِ ازدواج کو منسوخ نہیں کیا کیونکہ اگر اسے منسوخ کر دیا جاتا تو یہ صرف زبانی کارروائی ہوتی اور لوگ بدستور اس رسم پر قائم رہتے۔ جیسا کہ آج ہم دیکھتے ہیں بہت سی غیر مسلم اقوام جن کے دساتیر اور معاشرتی معیار تعددِ ازدواج کی اجازت نہیں دیتے اس رسم کو کسی نہ کسی شکل میں اپنائے ہوئے ہیں۔ اسلام اس لیے آیا تھا کہ لوگوں کی زندگی میں اس کا عملی نفاذ ہو، یہ قائم رہے اور اس پر عمل کیا جاتا رہے۔

یہ اس لیے نہیں آیا تھا کہ اسے گومگو کی حالت میں رکھا جائے یا اسے محض ایک نظریہ تصور کر لیا جائے۔ اسلام ایک حقیقت پسندانہ دین ہے اور زندگی کے ساتھ گہری مطابقت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بعض شرائط اور پابندیوں کے ساتھ تعددِ ازدواج کی اجازت دیتا ہے کیونکہ اگر اس سے مکمل اجتناب مجموعی طور پر انسانیت کے بہترین مفاد میں ہوتا تو اللہ تعالیٰ یقیناً اس کی تنسیخ کر دیتا۔ لیکن انسان کے اچھے بُرے کو خالقِ کائنات سے بہتر بھلا کون جان سکتا ہے۔

اسلام نے تعددِ ازدواج کی اجازت بہت سی وجوہات کی بنا پر دی ہے۔ ان وجوہات کے بارے میں کوئی قیاس آرائی کرنے یا مفروضات قائم کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ وجوہات بالکل حقیقی ہیں اور ان کا مشاہدہ ہر روز ہر جگہ کیا جا سکتا ہے۔ ہم یہاں ان میں سے بعض وجوہات کا جائزہ لیں گے۔

۱۔ بعض معاشروں میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے۔ خاص طور پر صنعتی اور تجارتی علاقوں پر اور اُن ممالک پر بھی جو جنگوں کی لپیٹ میں ہیں یہ بات صادق آتی ہے۔ اب ذرا غور کیجیے کہ اگر کسی مسلم معاشرے کو اس قسم کی صورتِ حال درپیش ہوتی اور اگر اسلام تعددِ ازدواج کی ممانعت اور قانونی شادی کو صرف ایک بیوی تک محدود کر دیتا تو غیر شادی شدہ عورتوں کا کیا بنتا؟ وہ اپنا ساتھی کہاں سے اور کیسے تلاش کرتیں جس کی فطری طور پر انہیں خواہش ہوتی ہے؟ انہیں ہمدردی، مفاہمت، حمایت اور تحفظ کہاں سے اور کیسے حاصل ہوتا؟ اس مسئلے کے پہلو صرف جسمانی یا مادی نہیں ہیں بلکہ ان کی نوعیت اخلاقی، احساساتی، معاشرتی، جذباتی اور فطری بھی ہے۔ ہر نارمل عورت خواہ وہ کاروبار میں ہو یا بیرونِ ملک ملازمت کر رہی ہو یا اس کا تعلق خفیہ اطلاعات کے محکمہ سے ہو اُس کے دل میں اپنا گھر بسانے اور خاندان بنانے کی امنگ ضرور ابھرتی ہے۔ اُسے کسی کی ضرورت ہوتی ہے جس کی وہ دیکھ بھال کرے اور جو اُس کی دیکھ بھال کرے وہ

چاہتی ہے کہ اُس کی شناخت معاشرے اور خاندان کے حوالے سے قائم ہو۔ اگر ہم اس مسئلے کو صرف جسمانی یا مادی نقطۂ نظر سے دیکھیں تب بھی اس کے مضمرات بہت اہم ہیں جنہیں ہم کسی صورت نظر انداز نہیں کر سکتے بصورتِ دیگر نفسیاتی پیچیدگیاں، اعصابی خلل؛ معاشرتی نفرت اور ذہنی عدم استحکام کے نتیجے میں ایسی خرابیاں پیدا ہوں گی کہ اس مسئلے کو بغیر حل کے جوں کا توں چھوڑنا پڑے گا۔ طبی شہادتیں اس حقیقت کی بھرپور تصدیق کرتی ہیں۔

ہمیں عورت کی ان فطری خواہشات، جذبات اور امنگوں کو محسوس کرنا ہوگا۔ کسی سے تعلق رکھنے اور دیکھ بھال کرنے یا کیے جانے کی ضرورت کی تکمیل بہرحال کسی نہ کسی طریقے سے تو کرنا ہوگی۔ اس صورتِ حال سے دوچار خواتین عام طور پر اپنی فطرت تبدیل نہیں کرتیں یا بالفاظِ دیگر فرشتوں جیسی زندگی بسر نہیں کرتیں۔ وہ محسوس کرتی ہیں کہ انہیں زندگی سے حظ اٹھانے اور اپنا حصہ وصول کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ اگر وہ یہ حق قانونی راستے اور شائستہ طریقے سے حاصل نہیں کر سکتیں تو وہ دوسرے راستے تلاش کرنے میں کبھی ناکام نہیں رہتیں اگرچہ یہ راستے خطرناک اور عارضی ہوتے ہیں۔ ایسی عورتیں شاذ ہی ہوں گی جو مرد کے مستقل اور قابلِ اعتماد ساتھ کے بغیر گزارہ کر سکتی ہوں۔ ایسے معاشرے میں غیر شادی شدہ عورتوں کی بھاری تعداد مردوں سے ملاقات کا راستہ نکال ہی لیتی ہیں۔ وہ عیش و عشرت کی محافل برپا کرتی ہیں، آزادانہ میل جول کی دعوتوں کا اہتمام کرتی ہیں، کانفرنسوں اور کنونشنوں میں شریک ہوتی ہیں، گھر سے باہر کی دُنیا میں دُور تک نکل جاتی ہیں وعلیٰ ہذا القیاس۔ ان بیباکانہ سرگرمیوں کے نتائج ہمیشہ اخلاق اور شائستگی کے معیار پر پورے نہیں اُترتے۔ کوئی شادی شدہ مرد کسی عورت کے لیے باعثِ کشش ہو سکتا ہے اور ممکن ہے وہ عورت اُسے قانونی یا غیر قانونی طریقے سے حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اسی طرح کوئی عورت کسی مرد کے لیے پُرکشش ہو سکتی ہے اور ممکن ہے وہ مرد کسی وجہ سے اخلاقی

کمزوری کا شکار یا دلگیر ہو۔ ایسا مرد کھلم کھلا یا درپردہ شائستہ انداز میں یا غیر مہذب طریقے سے، قانونی شکل میں یا محض رواجی قانون کے تحت اُس عورت کے ساتھ قریبی تعلق قائم کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس کے نتیجے میں متعلقہ شادی شدہ مرد کی گھریلو زندگی پر تشویشناک اثرات مرتب ہوں گے اور معاشرے کی اخلاقی قدریں تباہ ہو جائیں گی، بیویاں بے وفائی کا شکار ہوں گی یا انہیں مکمل طور پر نظر انداز کر دیا جائے گا، بچے بیکس و تنہا رہ جائیں گے، گھر اُجڑ جائیں گے وغیرہ۔

جو عورت اس قسم کے حالات میں کسی مرد سے میل ملاپ بڑھاتی ہے اُسے کسی قسم کا تحفظ وقار یا حقوق حاصل نہیں ہوتے۔ اُس کا دوست یا عاشق اُس کے ساتھ وقت گزار سکتا ہے، اُس کا خرچ برداشت کر سکتا ہے، اُسے تحائف دے سکتا ہے اور اُس پر محبت بھرے کلمات نچھاور کر سکتا ہے۔ لیکن ایسی عورت کو کیا تحفظ حاصل ہے؟ اگر اُس کا دوست اُسے ناپسند کرنے لگتا ہے یا مصیبت کے وقت جب اُس کی رفاقت کی واقعی ضرورت ہو اُس کا ساتھ چھوڑ جاتا ہے تو وہ اُسے کیسے روک سکتی ہے؟ اگر وہ اس خفیہ رومانس کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو کون سی چیز اُس کے راستے میں رکاوٹ بن سکتی ہے؟ اخلاقیات؟ ضمیر؟ قانون؟ ان میں سے کوئی چیز عورت کی مدد کو نہیں آئے گی۔ اخلاقیات کو اُسی وقت کاری ضرب لگ گئی تھی جب فریقین نے اس قسم کا میل ملاپ شروع کیا تھا۔ ضمیر اُسی وقت مفلوج ہو گیا تھا جب مرد نے اللہ تعالیٰ اور انسان کے وضع کردہ تمام ضابطوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے یہ تعلق قائم کیا تھا۔ رہ گیا قانون تو قانون بیوی کے سوا کسی اور کے ساتھ جنسی تعلق کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ چنانچہ مرد اس قسم کی سہل الحصول رفاقت سے جب تک چاہے محظوظ ہو سکتا ہے اور جذبات سرد ہونے پر کسی دوسری عورت سے تعلقات استوار کر کے کسی قسم کی ذمہ داری یا فرض قبول کیے بغیر وہی المناک کھیل دُہرا سکتا ہے۔

عین ممکن ہے کوئی عورت اس قسم کے تجربے سے گزرنے کے بعد بھی پرکشش اور جاذبِ نظر رہے اور اس کا دل امنگوں سے لبریز ہو۔ وہ ایک دوسرا مرد تلاش کر سکتی ہے اور اپنے پہلے تجربے کو دُہرا سکتی ہے۔ لیکن کیا ایسا کرنے سے اُسے کوئی تحفظ، یقین دہانی، عزت و وقار یا حق حاصل ہو جائے گا؟ ہرگز نہیں۔ وہ اسی مذموم چکر میں پھنسی رہے گی یعنی ہر وقت کسی کو شکار بنانے یا کسی کا شکار بننے کی اُمید میں رہے گی۔ اُس کی مشکلات میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا، خصوصاً اگر اُس کے بچے بھی ہیں تو اُس کے مصائب اور بھی زیادہ ہوں گے لیکن انجام کار اُسے فراموش کر دیا جائے گا۔ یہ بات انسانی وقار اور نسوانی لطافت کے شایانِ شان نہیں۔ اس صورتِ حال میں کوئی بھی عورت اعصابی طور پر تباہ ہو جائے گی یا معاشرے سے بغاوت کر کے انتقام لینے پر اُتر آئے گی اور تمام اخلاقی اصولوں کو پامال کر کے رکھ دے گی۔

دوسری طرف کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ تمام شادی شدہ مرد خوش و خرم، کامیاب اور اپنی شادیوں سے مطمئن ہوتے ہیں۔ اس آزردگی، ناکامی یا بے اطمینانی کا باعث خواہ مرد کی اپنی غلطی ہو یا اُس کی بیوی کی بہرحال ایسا شوہر کسی دوسری عورت کی رفاقت یا اُس کے قرب سے تسکین حاصل کرنے کی تلاش میں رہے گا۔ اگر خواتین کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے تو وہ اپنی رفیقہ تلاش کرنے میں بآسانی کامیاب ہو جائے گا۔ اگر وہ جائز طریقوں سے اپنا مقصد حاصل نہیں کر پاتا تو دوسرے ذرائع اختیار کر کے غیر عورتوں سے غیر اخلاقی اور ناشائستہ تعلقات استوار کرے گا جس کا نتیجہ ناجائز بچے کی پیدائش، اسقاطِ حمل اور دوسرے مصائب کی صورت میں برآمد ہو سکتا ہے۔ ایسے واقعات لاکھ ناخوشگوار اور تلخ سہی لیکن یہ حقیقی اور نہایت حساس مسائل ہیں۔ ان کو ایسے طریقے سے حل کیا جانا چاہیے جس سے فرد، خواہ وہ مرد ہو یا عورت محفوظ رہے اور معاشرے کو تحفظ حاصل ہو۔

اس مسئلے کے حل کے طور پر اسلام رنجیدہ اور غیر مطمئن شوہر کو دوسری عورت سے

شادی کرنے اور اُس کے ساتھ علی الاعلان لیکن ذمہ دارانہ طریقے سے زندگی گزارنے کی اجازت دیتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی لازم ٹھہراتا ہے کہ وہ اپنی پہلی اور دوسری بیوی سے متعلقہ اپنی تمام ذمہ داریاں مساوی طور پر ادا کرے۔ اس طرح غیر شادی شدہ عورتوں کو اپنی ضروریات، خواہشات اور جائز امنگوں اور ولولوں کی تکمیل میں مدد ملتی ہے۔ یہ حل انہیں اجازت دیتا ہے کہ وہ نکاح کے ذریعے مردوں سے تعلق قائم کریں اور ایسے تمام حقوق اور مراعات حاصل کریں جو قانونی بیویوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ اس طرح اسلام لیت و لعل سے کام لینے یا کسی مسئلے کو نظر انداز کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اسلام تو ایک حقیقت پسندانہ، صاف ستھرا، سیدھا سادا اور عملی دین ہے۔ اسلام کا پیش کردہ حل جائز، شائستہ اور سُود مند ہے۔ اسلام نے یہ حل اس لیے پیش کیا ہے کہ یہ انسانی تعلقات میں منافقت ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ اُس شخص کے رویے کو کبھی جائز اور اخلاقی تسلیم نہیں کر سکتا جس کا قانونی نکاح تو ایک بیوی سے ہوا ہو لیکن حقیقت میں اُسے دوسری عورتوں سے میل جول رکھنے اور خفیہ تعلقات قائم کرنے کے غیر محدود ذرائع حاصل ہوں۔ اس کے برعکس اسلام بدکاری کا سخت مخالف ہے اور اسے کسی صورت معاف نہیں کرتا۔ بدکار عورت اور بدکار مرد کی سزا عبرت ناک اور سزائے موت کے برابر ہے۔ زانی اور زانیہ کی سزا اتنی اذیت ناک ہے کہ ہر دو کو سو سو کوڑے لگانے کا حکم دیا گیا ہے۔ جب اسلام نے منافقت، بے وفائی اور بدکاری کی ممانعت کر دی ہے تو پھر قانونی تعددِ ازدواج کی اجازت کے سوا کوئی متبادل راستہ باقی نہیں رہتا اور اسلام نے متذکرہ بالا ضوابط اور شرائط کے ساتھ تعددِ ازدواج کی اجازت دی ہے۔

اگر کچھ لوگ تعددِ ازدواج کو قابلِ قبول نہیں سمجھتے تو انہیں دوسرے متبادل راستے اختیار کرنے پڑیں گے جن کو اسلام قبول نہیں کرتا یا جن کی کبھی حمایت نہیں کرتا۔ پھر بھی اگر بعض لوگ اپنی نفسانی خواہشات پر قابو پا سکتے ہیں اور زندگی کے ہر پہلو میں ضبطِ نفس

کا مظاہرہ کر سکتے ہیں تو انہیں تعددِ ازدواج کی ضرورت نہیں۔ اسلام کے نزدیک اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ فرد کا عزّ و وقار اور تحفظ ہر حالت میں برقرار رہے اور افراد کے ذریعے پورے معاشرے کی سالمیت اور اخلاقیات کی حفاظت ہو سکے۔

اب اس وضاحت کے بعد ہر شخص خود سے استفسار کر سکتا ہے کہ اس قسم کے معاشرے کے لیے کون سا راستہ بہتر ہے۔ کیا یہ بات قابلِ ستائش ہے کہ بد نظمی یا غیر ذمہ دارانہ رویّے کے باعث معاشرے کی بنیادیں تباہ و برباد ہو جائیں۔ یا یہ کہ اسلامی حل کو قبول کرتے ہوئے اس پر عمل کیا جائے؟ کیا یہ بات معاشرے کے مفاد میں ہوگی کہ اس قسم کے سنگین مسائل کو نظر انداز کر دیا جائے، منافقت اور ناشائستگی کو برداشت کیا جائے اور بدکاری اور خفیہ طور پر ناجائز تعلقات سے اغماض برتا جائے؟ کیا حصولِ رفاقت کے لیے مرد اور عورت کی جائز خواہشات اور فطری امنگوں کا گلا گھونٹنا درست ہوگا؟ جبکہ درحقیقت اس جذبے کو مؤثر طور پر دبایا ہی نہیں جا سکتا اور جو لوگ ایسا کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ عموماً بے راہروی کا شکار ہو کر جنسی تسکین کے غیر قانونی اور غیر شائستہ طریقے اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس مسئلے پر معاشرتی، اخلاقی، انسانی، روحانی یا کسی بھی نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو یہ حقیقت آشکار ہو کر رہے گی کہ اگر افراد کو کسی جواز کے تحت اور ذمہ دارانہ طرزِ عمل کی بنیاد پر تعددِ ازدواج کی اجازت دے دی جائے اور انہیں قانون کا تحفظ اور متعلقہ حکام کی نگرانی حاصل ہو تو یہ معاشرے کے لیے کہیں بہتر ہوگا۔

اگر ہم مسئلے کا نسوانی نقطۂ نظر سے بھی جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اسلام عورت کو عزت و احترام کی قرار واقعی ضمانت دیتا ہے، اُس کے حقوق اور اس کی سالمیت کا تحفظ کرتا ہے، آبرو مندانہ رفاقت کے حصول کے لیے اُس کی جائز خواہش کو تسلیم کرتا ہے، اُسے معاشرے میں مقام عطا کرتا ہے اور اُسے اپنے من پسند شخص کا خیال رکھنے اور خود اُس کی پناہ میں رہنے کے مواقع مہیا کرتا ہے۔ یہ بات اُس عورت کو شاید

ناگوار گزرے جس کا پہلے ہی شوہر موجود ہے اور جو پسند نہیں کرتی کہ کوئی دوسری عورت اُس کے شوہر کی رفاقت، حفاظت، حمایت اور محبت میں اُس کی شریک بنے۔ لیکن اُن عورتوں کے احساسات کے بارے میں کیا خیال ہے جن کا کوئی خاوند یا قابلِ اعتماد رفیق نہیں ہے؟ کیا ہم اُن کے وجود کو نظر انداز کر دیں اور سمجھ لیں کہ انہیں کسی قسم کے تحفظ یا تسکین کے حصول کا کوئی حق نہیں؟ اور اگر ہم انہیں نظر انداز کر دیں تو کیا اس سے اُن کا مسئلہ حل ہو جائے گا یا اُن کی تسکین کی کوئی صورت نکل آئے گی؟ جس بیوی کو اپنے شوہر کی مکرر شادی پسند نہیں اگر وہ خود کو اُن عورتوں کی جگہ رکھ کر سوچے جو مرد کی رفاقت کے بغیر زندگی بسر کر رہی ہیں تو کیا اُس کی خواہش نہ ہوتی کہ اُس کا کوئی اپنا ہو، اس کا احترام کیا جائے اور اُسے تسلیم کیا جائے؟ اگر وہ کسی شخص کو بلا شرکتِ غیرے اپنا شوہر نہ بنا سکتی تو کیا وہ کسی کو اپنا نصف یا جزوی شوہر تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوتی؟ کیا وہ مرد کی پناہ اور تحفظ سے مکمل طور پر محروم رہنے کی بجائے کچھ تحفظ حاصل کرنے پر خوش نہ ہوتی؟ اگر اُس کا محبوب شوہر کسی مخلوط محفل یا محفلِ رقص میں کسی "اور" عورت کی طرف مائل ہوتا ہے یا اُس کی توجہ کا مرکز بنتا ہے تو اُس (بیوی) کا اور بچوں کا کیا بنے گا؟ اگر ایسا شخص اپنے خاندان کو چھوڑ دیتا ہے یا اپنا وقت اور پیسہ کسی نئی دلچسپی پر خرچ کرنے لگتا ہے اور یوں اپنی ذمہ داریوں سے غفلت برتتا ہے تو اُس (بیوی) کا کیا بنے گا؟ اگر بیوی کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اُس کے واحد شریکِ حیات نے دوسری عورتوں کے ساتھ تعلقات استوار کر رکھے ہیں یا کسی عورت کو خفیہ طور پر اپنی کفالت میں لے رکھا ہے یا کسی عورت کے ساتھ اُس کا عشق چل رہا ہے اور وہ اُس کے ہاں بکثرت آتا جاتا ہے تو ایسے موقع پر بیوی کے احساسات کیا ہوں گے؟ وہ بیوی کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ ہمیں تسلیم ہے کہ ایسا شخص گھٹیا اور بد طینت ہے لیکن کیا اُس کے گھٹیا پن اور بد طینتی کا فائدہ کسی متعلقہ فریق کو پہنچ سکتا ہے؟ اس طرح کی صورتِ حال سے اُس کی قانونی بیوی اور غیر قانونی داشتہ دونوں ہی

متاثر ہوتی ہیں۔ لیکن کیا دونوں متعلقہ عورتوں کے لیے یہ بہتر نہ ہوگا کہ وہ اس مرد کی حفاظت اور کفالت میں برابر کی شریک ہوں اور اُس کی مساویانہ رفاقت حاصل کریں اور دونوں کو قانون کا تحفظ حاصل ہو؟ ایسا مرد کمینہ اور منافق ہے لیکن اُس کی اس خصلت کا نقصان تو پہنچ چکا ہے، جذبات مجروح ہو چکے ہیں۔ اب تمام متعلقہ فریقوں کو بچانے، بدکاری کا مقابلہ کرنے، اس قسم کے نقصان کو روکنے اور جذبات کو مجروح ہونے سے بچانے کے لیے اسلام مداخلت کرتا ہے اور شادی شدہ مرد کو دوسری شادی کی اجازت دیتا ہے بشرطیکہ اس کی کوئی معقول وجہ یا جواز موجود ہو۔

۲۔ شادی کے بعض واقعات میں بیوی کسی وجہ سے بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوتی ہے۔ صحیح معنوں میں خاندانی زندگی گزارنے اور نسلِ انسانی کی بقاء و تحفظ کے لیے بچوں کی پیدائش نہایت ضروری ہے۔ انسان کی قدرتی طور پر خواہش ہوتی ہے کہ اُس کے بچے ہوں، اُس کا نام زندہ رہے اور خاندانی تعلقات میں استحکام پیدا ہو۔ اگر عورت بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہے تو اس صورتِ حال میں مرد کے سامنے عام طور پر تین راستے ہوتے ہیں جن میں سے اُسے ایک کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔

۱۔ وہ بھول جائے کہ اُس کے کبھی بچے ہوں گے اور اولاد پیدا کرنے کی فطری خواہش کا گلا گھونٹ دے۔

۲۔ اپنی بانجھ بیوی سے علیحدگی اختیار کر کے اُسے طلاق دے دے۔

۳۔ دوسروں کے بچوں کو متبنّٰی بنا لے اور انہیں اپنے نام سے منسوب کرے۔

ان میں سے کوئی بھی متبادل صورت زندگی اور فطرت کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کے شایانِ شان نہیں۔ اسلام کسی بھی شخص کی جائز خواہشات اور فطری امنگوں کو دبانے کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا بلکہ شائستہ انداز میں اور قانونی طریقے سے ان کی تکمیل میں مدد دیتا ہے۔ ان خواہشات اور امنگوں کو دبانا اسلامی نظام کا حصہ نہیں۔

مذکورہ صورتِ حال میں بیوی کو طلاق دینے کا کوئی جواز نہیں کیونکہ اگر بیوی بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تو اس میں اُس کا اپنا کوئی قصور نہیں۔ علاوہ ازیں طلاق اللہ کی نظر میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت چیز ہے اور اس کی صرف اس وقت اجازت ہے جب کوئی دوسرا متبادل راستہ موجود نہ ہو۔ دوسری طرف ممکن ہے بیوی اپنے شوہر کی کفالت اور رفاقت کی محتاج ہو۔ یہ بڑے ظلم کی بات ہوگی کہ ایک ایسے وقت میں اُسے تنہا چھوڑ دیا جائے جب وہ ضرورت مند اور مایوس ہو اور بالخصوص یہ معلوم ہونے کے بعد کہ وہ بانجھ ہے کوئی دوسرا مرد اُس میں دلچسپی نہ رکھتا ہو۔

اسلام میں متبنّٰی بنانے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ اسلام حکم دیتا ہے کہ ہر بچے کو اُس کے حقیقی والد کے نام سے پکارا جائے اور اگر والد کا نام نامعلوم ہے تو اُسے ایمانی بھائی کہا جائے۔

(حوالہ کے لیے دیکھیے قرآن کی سورۃ ۳۳ : آیات ۴ تا ۵)

بلاشبہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جس بچے کے باپ یا کفیل کے بارے میں معلوم نہیں اُسے نگہداشت کے فقدان یا محرومی کا شکار ہونے دیا جائے۔ حقیقتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ آج کل متبنّٰی بنانے کا جو طریقہ رائج ہے اُس سے کسی بچے کی زندگی محفوظ اور خوشحال نہیں ہوتی۔ کوئی شخص کسی بچے کے حقیقی باپ یا حقیقی ماں کی جگہ نہیں لے سکتا۔ روزمرہ کے واقعات، پیچیدہ طریقہ ہائے کار، عدالتوں میں زیرِ سماعت مقدمات اور خاندانوں کے مابین تنازعات اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ متبنّٰی بنانے کا عمل کسی صورت میں بھی مسئلے کا حل نہیں ہے۔ فی زمانہ عدالتوں میں کتنے ہی ایسے مقدمات زیرِ سماعت ہیں جن میں حقیقی والدین اپنے اُن بچوں کی واپسی کا مطالبہ کر رہے ہیں جنہیں اجنبی خاندانوں نے متبنّٰی بنا رکھا ہے اور انہیں مختلف ماحول میں رکھا گیا ہے۔ نارمل والدین یا ان میں سے کوئی ایک کتنی مدت تک اپنے بچے کو کسی اجنبی گھر میں دیکھنا پسند کر سکتے ہیں۔ وہ مصنوعی

یا غیر حقیقی والدین پر کب تک اعتماد کر سکتے ہیں کہ وہ اُن کے بچّے کی پرورش اور نگہداشت مناسب طریقے پر کریں گے؟ بڑا ہونے پر جس بچے کو پتہ چلے گا کہ اُس کے حقیقی والدین نے اُسے ترک کر دیا اور اُس کے موجودہ والدین سوتیلے یا مصنوعی ہیں تو وہ خود کیسا محسوس کرے گا؟ جب اُس پر منکشف ہوگا کہ اُسے اپنے حقیقی والدین کے بارے میں کچھ بھی تو معلوم نہیں یا اُس کی ماں افلاس کے خوف یا شرم یا عدمِ تحفظ کی بنا پر اس سے دست بردار ہو گئی تو اُس کے دل پر کیا گزرے گی اور وہ کیسا ردِّ عمل ظاہر کرے گا؟ متبنّٰی بنانے والے خاندان کے دوسرے ارکان لے پالک بچے سے کتنی محبت کریں گے؟ کیا وہ پسند کریں گے کہ ایک اجنبی بچہ اُن کے خاندان کا نام اختیار کرے اور اُس جائداد کا وارث بنے جس کے حقیقی وارث وہ خود ہیں؟ گود لینے والے مصنوعی والدین اُس وقت کیا محسوس کریں گے جب حقیقی والدین اپنے بچے کی واپسی کا مطالبہ کریں گے اور جب بچہ خود اپنے اصل والدین کے پاس جانے کی خواہش ظاہر کرے گا؟ متبنّٰی بنانے میں بہت سی پیچیدگیاں مضمر ہیں۔ بے شک یہ رسم اپنے اندر بہت سی قباحتیں لیے ہوئے ہے۔ یہ رسم بچّے کے لیے، والدین کے لیے خواہ وہ حقیقی ہوں یا غیر حقیقی، متبنّٰی بنانے والے خاندان کے دوسرے رشتہ داروں کے لیے اور مجموعی طور پر معاشرے کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔

متبنّٰی بنانے کی رسم ان بڑے عوامل میں سے ایک ہے جو غیر ذمّہ دارانہ سرگرمیوں اور ناجائز تعلقات کے فروغ میں بہت سے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ آج کل اس رسم کو تجارتی بنیادوں پر ترقّی دی جا رہی ہے۔ ذرائع ابلاغ کے مطابق بعض لوگ اپنے بچوں کو "برائے فروخت" پیش کرتے ہیں یا اُن کی تجارت کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ افریقہ یا ایشیا کے جنگلوں میں نہیں بلکہ کینیڈا اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ ایسے ترقی یافتہ ممالک میں ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اس رسم کو قبول نہیں کرتا یعنی مسلمانوں میں اس کی ترویج کو برداشت نہیں کرتا۔

عورت کے بانجھ ہونے کی صورت میں اسلام تین متبادل راستوں کو مذکورہ دلائل

کی بنا پر مسترد کرتے ہوئے اس مسئلے کا ایک اپنا حل پیش کرتا ہے۔ اسلام اس قسم کی صورتِ حال میں مرد کو دوسری شادی کی اجازت دیتا ہے تاکہ وہ اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل کر سکے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی بے اولاد بیوی کی بھی کفالت کرے جسے ایسے وقت میں اپنے شوہر کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ دوسری شادی ایک اجازت ہے اور ایسا راستہ ہے جو ایک مایوس شخص کسی کو متبنّیٰ بنانے یا بیوی کو طلاق دینے یا اپنی امنگوں کو برخلافِ فطرت دبانے کی بجائے اختیار کر سکتا ہے۔ یہ ایک اور مثال ہے جس میں شادی ایک بہترین قابلِ عمل انتخاب اور مشکل صورتِ حال سے بچ نکلنے کا ایک راستہ ہے تاکہ لوگ ہر لحاظ سے نارمل اور محفوظ زندگی گزارنے کے قابل ہو سکیں۔

۳۱۔ بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں جب بیوی اپنی ازدواجی ذمہ داریاں پوری کرنے کے قابل نہیں ہوتی۔ وہ اتنی دلکش ساتھی نہیں رہتی جتنا کہ اُسے ہونا چاہیے یا جتنا وہ رہنا چاہتی ہے۔ وہ اس حالت کو بھی پہنچ سکتی ہے جب وہ اپنے شوہر کو پوری محبت، تسکین اور توجہ نہیں دے سکتی جس کا وہ (شوہر) مستحق ہے اور جس کی وہ خواہش رکھتا ہے۔ یہ سب کچھ ہو سکتا ہے اور فی الحقیقت ہوتا ہے۔ اس میں ہمیشہ بیوی قصوروار نہیں ٹھہرتی بلکہ عین ممکن ہے کہ خود قدرت کی طرف سے ایسا ہو۔ یہ طویل علالت ہو سکتی ہے، زچگی کا زمانہ ہو سکتا ہے یا پھر حیض کا دورانیہ۔ ایسی صورتوں میں بھی تمام مرد ضبطِ نفس کا مظاہرہ یا فرشتوں کا سا طرزِ عمل اختیار نہیں کر سکتے۔ بعض مرد ایسے موقعوں پر اخلاق باختگی، دغابازی، منافقت اور بے وفائی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ درحقیقت ایسے واقعات اکثر رونما ہوتے رہتے ہیں کہ بیوی کی رشتہ دار یا بچوں کی آیا یا گھر کی منتظمہ وغیرہ جو بیوی کی علالت یا زچگی کے دوران گھر بھر کی دیکھ بھال کے لیے آتی ہیں تو شوہر ان میں سے کسی ایک کی محبت میں بُری طرح گرفتار ہو جاتا ہے۔ ایسا کئی بار ہو چکا ہے کہ جب

بیویاں وضعِ حمل یا آپریشن کے تکلیف دہ مرحلوں سے گزر رہی ہوتی ہیں تو اُن کے شوہر ِن
کا دوسری عورتوں کے ساتھ تازہ معاشقہ چل رہا ہوتا ہے۔ اس قسم کے کھیل میں بیمار
بیوی کی کزن یا سہیلی منظر پر بار بار نمودار ہوتی ہے۔ شاید وہ بڑی نیک نیتی سے اپنی
بیمار کزن یا پیاری سہیلی کی مدد کے لیے عارضی طور پر بچوں کی یا گھر کی دیکھ بھال کرنے
آتی ہے اور یہیں سے معاملات بڑھ کر پیچیدہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جب بیوی بیمار
ہوتی ہے خواہ وہ گھر پر ہو یا ہسپتال میں شوہر تنہائی محسوس کرتا ہے اور اُس پر یاس کی
کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ گھر میں موجود کوئی بھی دوسری عورت خواہ وہ بیوی کی رشتہ دار
ہو یا سہیلی یا کوئی اور، اُس کے شوہر سے ہمدردی ظاہر کرنا اور کسی حد تک اس کی دلجوئی کرنا
اپنی مدد کا حصہ تصوّر کرتی ہے۔ اُس کا یہ طرزِ عمل خلوص اور نیک نیّتی پر بھی مبنی ہو سکتا ہے
اور اس کے پیچھے نیّت کی خرابی بھی کارفرما ہو سکتی ہے۔ بعض مرد اور خواتین ہمدردی کی
اس سادہ سی ابتدا سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں اور ہر ممکن انجام تک جا پہنچتے ہیں۔ اس
کا نتیجہ شکستہ دلی اور گھر کی بربادی کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔

اس قسم کے مسائل خیالی یا شاذ نہیں ہیں بلکہ یہ عام مسائل ہیں جو بہ جگہ لوگوں کو درپیش
ہیں۔ اخبارات وقتاً فوقتاً اُن مسائل کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ عدالتی کارروائیوں کے ریکارڈ
بھی ایسے واقعات کی شہادت دیتے ہیں۔ اس ضمن میں مرد کے فعل کو آپ گھٹیا، غیر اخلاقی،
ناشائستہ اور مذموم وغیرہ کہہ سکتے ہیں۔ ہمیں یہ سب تسلیم ہے لیکن کیا اس سے مسئلے کے
حل میں کوئی مدد ملتی ہے؟ کیا اس سے حقیقت یا انسانی فطرت تبدیل ہو سکتی ہے؟ فعل
سرزد ہوتا ہے، گناہ کا ارتکاب بار بار کیا جاتا ہے اور ایک سنگین مسئلہ قابلِ عمل اور عمدہ حل
کا تقاضا کرتا ہے۔ کیا قانون ساز اداروں کو ایسے شخص اور اُس کے افعال کی سیدھی سادی
مذمت کرنے کے بعد مطمئن ہو رہنا چاہیے؟ کیا اُسے اپنے کردار اور معاشرے کی اخلاقی
بنیادوں کو تباہ و برباد کرنے کی اجازت دے دی جائے؟ کیا اُسے دیانت داری اور

وفاداری کی بجائے منافقت اور اخلاق باختگی کی راہ دکھائی جائے؛ تجربہ اور مشاہدہ سے یہ بات عیاں ہو چکی ہے کہ صرف ممانعت اور مذمت کی کارروائی بعض مردوں کو جرم کے ارتکاب سے باز رکھنے اور ان کے ضمیر کو جگانے میں مددگار ثابت نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس وہ منافقت، در پردہ بے وفائی اور غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل کی گنجائش پیدا کر لیتے ہیں جس کے آگے قانون اور قانون بنانے والے بے بس ہو کر رہ جاتے ہیں۔

لیکن اسلام بے بس نہیں ہے۔ یہ اخلاقی معیاروں پر مصالحانہ رویّہ یعنی منافقت اور بے وفائی برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ غلط اور جھوٹی تسکین کا سامان فراہم کر کے خود کو اور انسان کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ اسلام مسئلے کے وجود سے انکار کر سکتا ہے نہ اس کی محض مذمت اور ممانعت پر اکتفا کر سکتا ہے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے اس مسئلے کی شدت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔ اس قسم کے مرد کو اپنے آپ سے بچانے، متعلقہ عورت (خواہ وہ بیوی ہو یا خفیہ محبوبہ) کو غیر ضروری پیچیدگیوں سے محفوظ رکھنے، معاشرے کے اخلاقی کردار کو برقرار رکھنے اور برائی کی سطح کو ممکن حد تک کم کرنے کے لیے اسلام نے چند تحفظات اور شرائط (جن کا ذکر ہم اس باب کے آغاز ہی میں کر چکے ہیں) کے تحت تعددِ ازدواج کا راستہ اختیار کرنے کی اجازت دی ہے۔ اس کا اطلاق ہنگامی اقدام کے طور پر ہوگا اور یہ اقدام محض نام کی یک زوجگی اور مرد و زن کے درمیان غیر ذمہ دارانہ تعلقات کے مقابلے میں یقیناً بہتر ہے۔ ایسے مرد اور عورتیں جو ایک دوسرے کو اس حد تک پسند کرنے لگے ہوں کہ نوبت جان پر کھیل جانے تک پہنچ چکی ہو یا فریقین خود کو سخت اُلجھن میں محسوس کرتے ہوں، تعددِ ازدواج اپنا سکتے ہیں۔

۴۔ خود فطرت مردوں سے بعض افعال کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ مرد ہی ہے جو اصولی طور پر کاروباری سلسلے میں اکثر سفر پر جاتا ہے اور اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک طویل اور

مختصر دوروں پر مختلف اوقات کے لیے گھر سے باہر رہتا ہے۔ کوئی شخص اس یقین دہانی کی ذمہ داری قبول نہیں کرسکتا کہ ان حالات میں تمام مرد وفادار اور پاکباز رہتے ہیں۔ تجربہ بتاتا ہے کہ زیادہ تر مرد گھر سے باہر رہنے کی مدت کے دوران، جو کئی مہینوں یا برسوں پر مشتمل ہوسکتی ہے، ڈگمگا جاتے ہیں اور اجنبی عورتوں کے ساتھ غیر اخلاقی جرائم کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ بعض لوگ اخلاقی اعتبار سے کمزور واقع ہوتے ہیں اور اُن خواہشات کے آگے بھی ہتھیار ڈال دیتے ہیں جن کو بآسانی فرو کیا جاسکتا ہے۔ نتیجۃً وہ قعرِ گناہ میں جا گرتے ہیں جس سے خاندان ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ یہ ایک اور صورت ہے جس میں محدود تعددِ ازدواج پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ اس قسم کے آدمی کے لیے کہیں بہتر ہے کہ وہ غیر اخلاقی اور غیر ذمہ دارانہ جرائم کا آزادانہ ارتکاب کرنے کی بجائے ایک دوسری قانونی بیوی کے ساتھ ایک دوسرا گھر بسا لے۔ یہ خود بیوی کے حق میں بھی بہتر ہے کیونکہ جب اُسے معلوم ہوگا کہ اُس کے شوہر نے قانونی ضوابط اور اخلاقی اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے کسی دوسری عورت سے تعلقات استوار کیے ہیں تو اغلب امکان ہے کہ اُسے اتنا رنج نہ ہو جتنا کہ اُسے کسی دوسری عورت کے ساتھ اپنے شوہر کے غیر قانونی اور ناجائز تعلقات کے بارے میں معلوم کرکے ہونا ظاہر ہے کہ کوئی عورت فطرتاً طور پر یہ نہیں چاہتی کہ جو حق وہ اپنے شوہر پر رکھتی ہے اُس میں کوئی دوسری عورت بھی شریک ہو۔ لیکن جب اُسے ایک ایسی صورتِ حال کا سامنا ہوتا ہے کہ اُس کا شوہر دو راستوں میں سے ایک کا انتخاب کرسکتا ہے یعنی یا تو وہ قانونی ضابطوں اور اخلاقی اصولوں کا پابند رہ کر دوسری عورت سے تعلقات قائم کرے یا پھر قانون و اخلاق کی پروا کیے بغیر دوسری عورتوں سے میل ملاپ بڑھاتا پھرے تو یقیناً بیوی اوّل الذکر راستے کا انتخاب کرے گی اور اسی صورتِ حال کو قبول کرے گی۔ تاہم اگر اُسے کوئی نقصان پہنچتا ہے یا اُس کے حقوق پامال ہوتے ہیں تو وہ قانون سے رجوع کرسکتی

ہے یا اگر اُس کے بہترین مفاد میں ہو تو طلاق حاصل کر سکتی ہے۔

متذکرہ صورت میں اسلامی تعددِ ازدواج کے اطلاق سے مرد کی سالمیّتِ کردار، دوسری عورت کے وقار اور معاشرے کی اخلاقی اقدار کی حفاظت بہتر طور پر ہو سکے گی۔ ان واقعات کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ ہماری روزمرّہ زندگی کے حقائق ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ واقعات کم پیش آتے ہوں لیکن مسلمانوں میں تعددِ ازدواج کا رواج بھی شاذ ہی ہے۔ جو مسلمان تعددِ ازدواج پر عمل کرتے ہیں اُن کی تعداد اُن بدچلن شوہروں اور بیویوں کے مقابلے میں بہت کم ہے جو یک زوجگی والے معاشروں میں رہتے ہیں۔

اگرچہ تعددِ ازدواج، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، خطرناک اور بہت سے بنیادی حقوق کے ساتھ مشروط ہے پھر بھی یہ راستہ غفلت اور بے وفائی، منافقت اور عدمِ تحفظ، اخلاق باختگی اور ناشائستگی ایسی برائیوں کی نسبت کہیں بہتر ہے۔ یہ مردوں اور عورتوں کو اپنے مشکل مسائل حقیقت پسندانہ اور ذمہ دارانہ بنیادوں پر حل کرنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ انسانی زندگی کی بہت سی نفسیاتی، فطری اور جذباتی پیچیدگیوں کو کم سے کم کر دیتا ہے۔ یہ ایک احتیاطی اقدام ہے جو تمام متعلقہ فریقوں کے بہترین مفاد میں پیش بندی کے طور پر کیا جاتا ہے۔ پھر بھی یہ اسلام میں ایمان کا جزو نہیں ہے نہ یہ کوئی حکم ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے محض ایک اجازت ہے اور انسانی تعلقات میں بعض انتہائی مشکل مسائل کا حل ہے۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قانونی اور مشروط تعددِ ازدواج دوسرے راستوں پر لائقِ ترجیح ہے جو آجکل بہت سے لوگ اختیار کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی برائے نام شادی یا سطحی نوعیت کی یک زوجگی پر فخر و مباہات کا اظہار کرتے ہیں۔ مسلمانوں کا مؤقف ہے کہ عام حالات میں یک زوجگی نہ صرف لائقِ ترجیح ہے بلکہ اصول کے طور پر یہ تسلیم کی جانی چاہیے۔ ورنہ اگر ضروری ہو تو تعددِ ازدواج کو زیرِ غور اور زیرِ عمل لایا جا سکتا ہے۔

بحث کو سمیٹنے کے لیے ہم قارئین سے گزارش کریں گے کہ وہ پیغمبرِ اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شادیوں کا بغور جائزہ لیں۔ یہ شادیاں اُن مسلمانوں کے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتیں جو رسول اللہ کے مثالی کردار اور اُن حالات کو سمجھتے ہیں جن کے تحت یہ شادیاں طے پائیں۔ لیکن غیر مسلم افراد کے لیے یہ شادیاں آنحضرت کی شخصیت کو سمجھنے میں زبردست رکاوٹ اور آپ کے بارے میں غیر ذمہ دارانہ اور خام نتائج اخذ کرنے کا موجب بنتی ہیں۔ یہ نتائج اسلام اور رسول اللہ کے وقار کے منافی ہیں۔ یہاں ہم اُن شادیوں کے بارے میں نہ تو اپنی طرف سے کوئی استنباط کریں گے نہ دوسروں کے مستنبط نتائج کو جھٹلائیں گے۔ ہم صرف بعض حقائق کی نشان دہی کریں گے اور کسی نتیجے تک پہنچنے کا کام قارئین پر چھوڑ دیں گے۔

۱۔ اسلام میں شادی کے ادارے کو بہت اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ یہ معاشرے کی صحت مند بقا کے لیے لائقِ سفارش اور انتہائی ضروری ہے۔

۲۔ رسول اللہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی نہیں کہا کہ آپ کی ذات غیر فانی یا خدائی صفات کی حامل ہے۔ آپ نے بار بار یہ بات زور دے کر کہی کہ آپ فانی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے بنی نوعِ انسان تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے آپ کو منتخب کیا ہے۔ اگرچہ آپ اپنی زندگی میں منفرد اور ممتاز مقام کے حامل تھے اس کے باوجود آپ ایک عام آدمی کی طرح زندہ رہے اور ایک عام آدمی کی طرح آپ نے اس دنیا سے کوچ فرمایا۔ اس لیے شادی کرنا آپ کے لیے ایک فطری عمل تھا اور اسے نعوذ باللہ کفر یا بدعت سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ آپ ایک انتہائی گرم آب و ہوا والے خطے میں رہتے تھے جہاں انسان پر نفسانی خواہشات کا غلبہ ہوتا ہے، جہاں لوگ چھوٹی عمر میں حدِ بلوغت کو پہنچ جاتے ہیں اور جہاں ہر طبقے کے لوگوں میں بے تامل تسکینِ جذبات کے سامان سے متمتع ہونا

ایک عام سی بات تھی۔ اس کے باوجود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۵ سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے کسی عورت کو چھوا تک نہیں۔ اس عمر میں آپ نے پہلی بار شادی کی۔ پورے ملکِ عرب میں آپ کے کردار کو بے داغ تسلیم کیا جاتا تھا اور آپ الامین کے لقب سے مشہور تھے۔ یہ ایک ایسا لقب تھا جو اعلیٰ معیار کی اخلاقی زندگی کی علامت تھا۔

۴۔ اُس علاقے میں اس غیر معمولی تاخیر سے آپ کی پہلی شادی حضرت بی بی خدیجہؓ سے ہوئی۔ حضرت خدیجہؓ ایک عمر خاتون تھیں جو دو مرتبہ بیوہ ہو چکی تھیں اور عمر میں آپ سے پندرہ برس بڑی تھیں۔ انہوں نے نکاح کی تجویز خود پیش کی اور آپؐ نے یہ جانتے ہوئے کہ وہ عمر میں آپ سے کافی بڑی ہیں اور دو بار بیوہ ہو چکی ہیں حضرت خدیجہؓ کا پیغام قبول کر لیا۔ اگر آپ جذبات سے مغلوب اور نفسانی خواہشات کے غلام ہوتے تو آپ کو بہت سی خوبصورت دوشیزائیں اور کم عمر بیویاں بآسانی میسر آسکتی تھیں۔

۵۔ آپؐ نے پچاس سال سے زیادہ کی عمر کو پہنچنے تک صرف اسی ایک عورت کے ساتھ زندگی بسر کی اور آپؐ کی تمام اولادیں (سوائے ابراہیمؑ کے) اسی خاتون کے بطن سے پیدا ہوئیں۔ حضرت خدیجہؓ نے پینسٹھ سال سے زیادہ کی عمر کو پہنچنے تک آپؐ کے ساتھ زندگی گزاری اور اُن کی زندگی میں آپ نے کوئی دوسری شادی نہیں کی نہ اپنی اکلوتی بیوی کے علاوہ کسی اور عورت سے تعلقات قائم کیے۔

۶۔ اب ایک ایسا مقام آگیا تھا کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کا پیغام لوگوں تک پہنچا رہے تھے آپؐ کی عمر پچاس سال سے تجاوز کر گئی تھی۔ آپؐ اور آپؐ کے اصحابؓ کو مسلسل ایذائیں پہنچائی جا رہی تھیں اور خطرناک دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔ ان مصائب میں آپ کی زوجۂ مطہرہ کا انتقال ہو گیا۔ اُن کی وفات کے بعد آپؐ نے کچھ عرصہ

بغیر بیوی کے گزارا۔ پھر حضرت سودہؓ آپ کے حلقۂ زوجیت میں آئیں جو مصائب و مشکلات کے ابتدائی برسوں میں اپنے سابقہ شوہر کے ساتھ حبشہ ہجرت کر گئی تھیں۔ واپس آتے ہوئے راستے میں اُن کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ اب انہیں پناہ کی تلاش تھی۔ اُن کا رسولؐ اللہ سے رجوع کرنا ایک قدرتی بات تھی۔ آپؐ ہی کے مشن کی خاطر تو اُن کے شوہر نے جان دی تھی۔ رسولؐ اللہ نے حضرت سودہؓ کو پناہ دی اور اُن سے نکاح کر لیا۔ حضرت سودہؓ کوئی خاص جوان یا خوبصورت اور دلکش نہیں تھیں۔ ایک عام سی شکل کی تیز مزاج بیوہ تھیں۔ بعد میں اُسی سال رسولؐ اللہ نے اپنے پیارے صحابی حضرت ابوبکر صدیقؓ کی سات سالہ کمسن بیٹی حضرت عائشہؓ کے لیے شادی کا پیغام بھیجا۔ یہ شادی ہجرتِ مدینہ کے کچھ عرصہ بعد پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ ان دو شادیوں کے محرکات کو جو بہر حال جذبات اور جسمانی کشش کے سوا کچھ اور تھے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ تاہم آپؐ نے پانچ چھ سال کا عرصہ انہی دو بیویوں کے ساتھ گزارا اور یوں چھپن سال کی عمر تک کسی اور عورت کو اپنی زوجہ نہیں بنایا۔

۷۔ زندگی کے ۵۶ ویں سال سے ۶۰ ویں سال کی مدت کے دوران رسولؐ اللہ نے یکے بعد دیگرے نو شادیاں کیں۔ اپنی زندگی کے آخری تین سال میں آپؐ نے کوئی شادی نہیں کی۔ آپؐ کی زیادہ تر شادیاں قریب قریب پانچ سال کی مدت کے دوران ہوئیں جب آپؐ اپنے مشن کے سب سے مشکل اور آزمائشی مرحلے سے گزر رہے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمان فیصلہ کن جنگوں میں مصروف تھے اور اندرونی اور بیرونی مشکلات کے نہ ختم ہونے والے چکر میں پھنسے ہوئے تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب اسلامی قانون تشکیل پا رہا تھا اور اسلامی معاشرے کی بنیادیں رکھی جا رہی تھیں۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ ان واقعات میں رسول اللہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سب سے زیادہ سربرآوردہ شخصیت

اور ایک ایسا مرکز تھے جس کے گرد یہ سارے واقعات گھومتے تھے اور پھر یہ حقیقت کہ آپؐ کی زیادہ تر شادیاں اسی خاص مدت کے دوران ہوئیں ایک نہایت دلچسپ عجیب و غریب اور غیر معمولی بات ہے جو کہ مؤرخین، ماہرینِ عمرانیات، قانون دانوں اور ماہرینِ نفسیات وغیرہ کی خاص توجہ کی طالب ہے۔ ان شادیوں کو محض جسمانی کشش اور نفسانی جذبات پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔

۸۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت سادہ با اصول اور پاکبازانہ زندگی گزاری۔ دن کے وقت آپ اپنے زمانہ کے مصروف ترین انسان تھے کیونکہ آپ بیک وقت سربراہِ مملکت، چیف جسٹس، کمانڈر انچیف اور معلّم تھے۔ رات کے وقت آپ سب سے بڑھ کر عبادت گزار بندے تھے۔ آپؐ ہر رات کا دو تہائی حصہ عبادت اور مراقبے میں گزارتے تھے۔ (حوالے کے لیے ملاحظہ کیجئے قرآن کا سورہ ۷۳: آیت ۲) اگرچہ آپ ملکِ عرب کے سربراہ اور مقتدرِ اعلیٰ تھے لیکن آپ کا گھریلو سازو سامان چٹائیوں، قرابوں، کمبلوں اور اس قسم کی معمولی چیزوں پر مشتمل تھا۔ آپؐ کی زندگی اتنی کٹھن اور اخلاقی اصولوں کی پابند تھی کہ ایک مرتبہ آپؐ کی ازواجِ مطہرات نے دنیوی آسائش کی اشیاء کے لیے آپ سے اصرار کیا لیکن انہیں کبھی کوئی چیز نہ مل سکی۔ (حوالہ کے لیے ملاحظہ کیجئے قرآن کا سورہ ۳۳: آیت ۲۸)
ان حقائق سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ آپؐ نے جس طرح کی زندگی گزاری وہ کسی بندۂ نفس یا مغلوب الہوس انسان کی زندگی ہرگز نہیں تھی۔

۹۔ آپؐ نے جن عورتوں سے نکاح کیا اُن میں سوائے یک کمسن لڑکی حضرت عائشہؓ کے باقی تمام عورتیں بیوائیں اور مطلقہ تھیں۔ ان میں سے کوئی بیوہ یا مطلقہ بیوی جسمانی دلکشی یا حسن و جمال کی وجہ سے مشہور نہیں تھی۔ ان میں سے بعض عمر میں آپؐ سے بڑی تھیں اور فی الواقع ان سب نے آپؐ کا ہاتھ مانگا تھا اور آپؐ کی پناہ

میں آنے کی خواہش ظاہر کی تھی یا پھر بعض عورتیں آپ کو تحفہ میں ملی تھیں جن کو آپ نے اپنی قانونی بیویاں بنالیا۔

یہ ہے پیغمبرِ اسلام کی شادیوں کا ایک عام سا پس منظر۔ اس سے قطعاً یہ تاثر نہیں ملتا کہ یہ شادیاں جسمانی ضروریات یا حیوانی جذبے سے مغلوب ہو کر رچائی گئیں۔ اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ آپؐ نے محض ذاتی مقاصد اور نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے اتنی زیادہ تعداد میں بیویاں رکھیں۔ کوئی بھی شخص خواہ دوست ہو یا دشمن جو زیادہ شادیوں کی بنا پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سالمیتِ کردار اور روحانی فضیلت پر شک کرتا ہو اُسے ان سوالات کی تسلی بخش وضاحتیں مہیا کی جانی چاہئیں۔ آپؐ نے اپنی پہلی شادی پچیس سال کی عمر میں کیوں کی جب کہ اس سے پہلے بھی آپ کی کسی عورت سے وابستگی نہیں رہی؟ آپؐ نے شادی کے لیے ایک ایسی عورت کا انتخاب کیوں کیا جو عمر میں آپؐ سے پندرہ سال بڑی تھی اور جسے دو مرتبہ طلاق ہو چکی تھی؟ آپ اُس کے آخری سانس تک اُس کے ساتھ کیوں رہے جبکہ آپ کی عمر پچاس سال سے تجاوز کر چکی تھی؟ آپؐ نے ان تمام بے بس اور لاچار بیواؤں اور مطلقہ عورتوں کو جو خاص حسن و جمال اور دلکشی بھی نہ رکھتی تھیں کیوں قبول کیا؟ آپؐ نے اتنی بااصول اور کٹھن زندگی کیوں بسر کی جب کہ آپؐ آرام و آسائش کی زندگی بھی گزار سکتے تھے۔ آپؐ نے زیادہ تر شادیاں زندگی کے مصروف ترین پانچ سال کے دوران کیوں کیں جبکہ اس عرصہ میں آپؐ کا مشن مسلسل خطرے سے دوچار تھا: اگر آپ حرم کی زندگی یا نفسانی خواہشات کے ہاتھوں مغلوب ہو جاتے تو اپنی حیثیت کس طرح برقرار رکھ سکتے تھے؟ ان سوالات کے علاوہ بھی بہت سے سوالات اٹھائے جا سکتے ہیں۔ یہ معاملہ اتنا سیدھا سادا نہیں ہے کہ اسے جنسی جذبے یا عورتوں کی ہوس پر محمول کیا جائے۔ اس پر سنجیدگی اور دیانت داری سے غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شادیاں کیں اگر آپ ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ طور پر جائزہ لیں تو آپ کو ان شادیوں کے حقیقی اسباب معلوم ہو جائیں گے۔ ان اسباب کی اس طرح درجہ بندی کی جا سکتی ہے۔

۱۔ پیغمبر اسلام اس دنیا میں بنی نوع انسان کے لیے ایک مثالی نمونہ بن کر آئے اور آپ کی زندگی کا ہر پہلو ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ خاص طور پر آپ کی ازدواجی زندگی ہمارے لیے ایک اعلیٰ مثال کا درجہ رکھتی ہے۔ آپ ایک نہایت شفیق شوہر اور بے حد محبت کرنے والے اور پیارے رفیق تھے۔ آپ کو انسانی تجربے اور اخلاقی امتحان کے تمام مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ آپ نے صرف ایک بیوی کے ساتھ بھی زندگی گزاری اور ایک سے زیادہ بیویوں کے ساتھ بھی، معمر بیوی کے ساتھ بھی اور جوان بیوی کے ساتھ بھی، بیوہ کے ساتھ بھی اور مطلقہ کے ساتھ بھی، خوش طبع کے ساتھ بھی اور زود رنج کے ساتھ بھی، مشہور و معروف کے ساتھ بھی اور ادنیٰ و مسکین کے ساتھ بھی۔ لیکن ان تمام صورتوں میں آپ شفقت و دلجوئی کا ایک نمونۂ کامل تھے۔ آپ کو انسانی رویے کے ان مختلف پہلوؤں کا تجربہ حاصل کرنے کا فریضہ سونپا گیا تھا۔ آپ کے لیے شادی محض جسمانی لذت کے حصول کا ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا بلکہ یہ ایک اخلاقی آزمائش ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی فعل اور ایک کٹھن کام بھی تھا۔

۲۔ رسول اللہ دنیا میں نظامِ اخلاقیات قائم کرنے اور ہر مسلمان کو سلامتی، تحفظ، اخلاقی سالمیت اور شائستہ زندگی کی ضمانت دینے کے لیے تشریف لائے تھے۔ آپ کے مشن کی عملی آزمائش آپ کی زندگی میں ہوئی اور اس طرح یہ عظیم مشن محض ایک نظریے کی شکل میں جامد و ساکت نہیں رہا۔ اصولی طور پر آپ نے کام کا مشکل ترین حصہ اپنے ذمہ لیا اور اسے انتہائی دشوار حالات میں پایۂ تکمیل تک

پہنچایا۔ جنگوں اور کفار کی اذیت رسانیوں کی وجہ سے مسلمانوں پر بہت سی بیواؤں، یتیموں اور طلاق یافتہ عورتوں کا بوجھ آن پڑا تھا۔ اُن کی حفاظت و رکفالت کی ذمہ داری زندہ بچ رہنے والے مسلمانوں پر عائد ہوتی تھی۔ آنحضرتؐ بے سہارا خواتین کے گھر نئے سرے سے آباد کرنے کے لیے اُن کا نکاح اپنے اصحابؓ سے کرا دیتے تھے۔ اصحابؓ بعض عورتوں کو مسترد کر دیتے تھے اور بعض خواتین خود آنحضرتؐ کی ذاتی سرپرستی اور حفاظت میں آنے کی خواہش مند ہوتی تھیں۔ از روئے اسلام اُن کی ابتر حالت اور قربانیوں کا پورا پورا احساس کرتے ہوئے اور اُن کی صعوبتوں کو کم کرنے کے لیے آپؐ کو کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا تھا۔ ان عورتوں کو مصائب سے نجات دلانے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ انہیں اپنی بیویاں بنا کر بھاری ذمہ داریوں کا چیلنج قبول کیا جائے۔ یہی آپؐ نے کیا اور ایک وقت میں ایک سے زیادہ بیویوں کی کفالت کا ذمہ اُٹھایا۔ اور یہ کوئی کھیل یا آسان راستہ نہیں تھا۔ آپؐ کو ان بیواؤں، یتیموں اور مطلقات کی بحالی کے کام میں حصہ لینا پڑا کیونکہ آپؐ اپنے اصحابؓ کو ایسے کاموں کا حکم نہیں دے سکتے تھے جو آپؐ خود کرنے کے لیے تیار نہیں تھے یا جن میں آپؐ خود حصہ نہیں لیتے تھے۔ یہ عورتیں مسلمانوں کی امانتیں تھیں اور سب کو مل کر اُن کا بوجھ اُٹھانا تھا۔ آپؐ نے ایسے وقت میں جو کچھ کیا وہ آپؐ کی ذمہ داری کا حصہ تھا اور ہمیشہ کی طرح اس ذمہ داری میں بھی آپ کا حصہ سب سے بڑا اور بھاری تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے ایک سے زیادہ بیویاں رکھیں اور آپؐ کی بیویوں کی تعداد آپؐ کے کسی بھی صحابی کی بیویوں سے زیادہ تھی۔

۲۔ مسلمانوں کے قبضے میں بہت سی جنگی قیدی عورتیں آجاتی تھیں جنہیں سلامتی اور تحفظ کی ضمانت دی جاتی تھی۔ انہیں نہ تو ہلاک کیا جاتا تھا نہ انہیں کسی قسم کے انسانی یا مادی حق سے محروم کیا جاتا تھا۔ اس کے برعکس داشتائیں یا مشترکہ محبوبائیں بنانے کی بجائے مسلمانوں کے ساتھ

قانونی شادیوں کے ذریعے انہیں آباد کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ یہ بھی مسلمانوں پر ایک اضافی اخلاقی بوجھ تھا جسے مشترکہ ذمہ داری سمجھتے ہوئے مل جل کر اٹھایا جاتا تھا۔ ایسے موقع پر بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے حصے کا بوجھ اُٹھایا اور جنگی قیدی عورتوں میں سے دو کے ساتھ نکاح کر کے کچھ ذمہ داریاں اپنے سر لے لیں۔

۴۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ شادیاں سماجی و سیاسی وجوہات کی بنا پر کیں۔ آپؐ اسلام کے مستقبل کے بارے میں بہت فکر مند تھے۔ آپؐ ہر لحاظ سے مسلمانوں کو مضبوط دیکھنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے اپنے پہلے جانشین حضرت ابوبکرؓ کی کمسن بیٹی اور دوسرے جانشین حضرت عمرؓ کی بیٹی سے شادی کی۔ یہ حضرت جویریہؓ سے شادی کا نتیجہ تھا کہ آپؐ کو اسلام کے لیے بنی المصطلق کے پورے قبیلے اور اُن کے حلیف قبائل کی حمایت حاصل ہوئی۔ حضرت صفیہؓ سے شادی کے ذریعے عرب کے متشدد یہودیوں کے ایک بڑے فرقے کی دشمنی کو بے اثر بنایا جا سکا۔ مصر کی ماریہ قبطیہ کو حلقۂ زوجیت میں لے کر آپؐ نے ایک بڑے اہم بادشاہ کے ساتھ سیاسی اتحاد قائم کیا۔ آنحضرتؐ نے ایک حبشی عورت سے جسے نجاشیِ حبشہ نے بطورِ تحفہ حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا تھا شادی کر کے ایک پڑوسی بادشاہ کے ساتھ دوستی کا رشتہ استوار کیا۔ یہ وہی بادشاہ تھا جس کے علاقہ میں ابتدائی مسلمانوں نے پناہ لی تھی۔

۵۔ ان میں سے زیادہ تر شادیاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مقصد کے پیشِ نظر کیں کہ ذات پات کے نظام، نسلی امتیاز، قومی اور خاندانی غرور اور مذہبی تعصب کا خاتمہ ہو سکے۔ آپؐ نے بعض بہت سی ادنیٰ اور مسکین عورتوں سے بھی شادی کی۔ مصر کی ایک قبطی لڑکی، ایک مختلف المذہب اور مختلف النسل یہودی لڑکی اور ملکِ حبشہ سے تعلق رکھنے والی ایک حبشن بھی آپؐ کے عقدِ نکاح میں

آئی۔ آپؐ محض اخوت اور مساوات کی تعلیم دینے پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ جس بات کا درس دیتے تھے اُسے جامۂ عمل بھی پہناتے تھے۔

۶۔ رسولؐ اللہ نے بعض شادیاں قانونی وجوہات کی بنا پر اور بعض غلط روایات کے خاتمے کے لیے کیں۔ حضورؐ نے ایسی ہی ایک شادی آپؐ کے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ کی مطلّقہ حضرت زینبؓ بنتِ جحش سے کی۔ قبل از اسلام اہلِ عرب مطلقہ کو دوبارہ شادی کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اُس زمانے کی رسم کے مطابق رسولِ اکرم نے حضرت زیدؓ کو متبنّٰی بنایا تھا اور آپؐ انہیں بیٹا کہہ کر پکارتے تھے لیکن اسلام نے اس رسم کو منسوخ اور اس رواج کو ناپسند کیا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پہلے شخص تھے جنہوں نے اس رسم کے خلاف اپنی ناپسندیدگی کا عملی اظہار کیا چنانچہ یہ بتانے کے لیے کہ کوئی لے پالک بچہ متبنّٰی بنانے والے باپ کا حقیقی بیٹا نہیں بن سکتا نیز مطلقہ سے نکاح جائز قرار دینے کے لیے آپ نے اپنے "متبنّٰی" بیٹے کی مطلقہ سے شادی کی۔ اتّفاق کی بات ہے کہ یہ زینبؓ نامی خاتون آپ کی پھوپھی زاد تھیں اور حضرت زیدؓ کے عقدِ نکاح میں آنے سے پہلے آپؐ کو اُن کے رشتے کی پیش کش کی گئی تھی۔ اُس وقت آپؐ نے یہ رشتہ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن طلاق کے بعد آپؐ نے حضرت زینبؓ کو ان دو قانونی مقاصد کی تکمیل کیلئے قبول کر لیا —— مطلقہ کو شادی کا قانونی حق دلانے کے لیے اور متبنّٰی بچوں کا صحیح مقام متعین کرنے کے لیے بعض اذہان میں حضرت زینبؓ کے حوالے سے حضورؐ کی اخلاقی سالمیت سے متعلّق مضحکہ خیز من گھڑت قصے جاگزین ہیں۔ یہ کینہ پرور اور جھوٹی باتیں ہرگز لائقِ توجہ نہیں ہیں۔

(دیکھیے قرآن کی سورۃ ۳۳: آیت ۳۶، ۳۷، ۴۰)

یہ ہیں وہ حالات جن میں رسولؐ اللہ نے شادیاں کیں۔ مسلمانوں کے لیے

اس بات میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاقی معیار بہت بلند تھا اور آپؐ ہر قسم کے حالات میں انسان کے لیے ایک نمونۂ کامل تھے۔ غیر مسلموں سے ہماری گزارش ہے کہ وہ اس موضوع پر سنجیدگی سے غور کریں تب وہ صحیح نتائج اخذ کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔

۴۔ شادی اور طلاق ؏

شادی کا صحیح اسلامی مفہوم بھی انہی اسلامی تصورات میں شامل ہے جن کو بہت بری طرح مسخ کر دیا گیا ہے۔ ہم نے سطورِ بالا میں شادی سے متعلق جو مختصر جائزہ پیش کیا ہے اس کے علاوہ کچھ مزید باتیں بھی مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ اسلام میں شادی کوئی کاروباری معاملہ نہیں ہے جو فریقین میں طے پاتا ہے نہ یہ کوئی دنیوی معاہدہ ہے جس میں مادی فوائد اور ذمہ داریوں کو ایک دوسرے کے مقابل رکھ کر جانچا جاتا ہے۔ یہ ایک قسم کا سنجیدہ اور مقدس معاملہ ہے اور اس کی تعریف محض جسمانی، مادی اور دنیوی معنوں میں کرنا یکسر غلط ہوگا۔ شادی دراصل اخلاقی فیاضی، روحانی بلندی، معاشرتی سالمیت، انسانی استحکام، امن و سلامتی اور شفقت و رحمدلی ایسے عناصر کا مرکب ہے۔ یہ ایک ایسا معاہدہ ہے جس کا اوّلین شاہد اور اوّلین فریق خود اللہ تعالیٰ ہے۔ یہ اُسی ذاتِ برتر کے پاک نام، اُس کی اطاعت اور اُس کے احکام کے مطابق طے پاتا ہے۔ یہ ایک نہایت شائستہ انسانی رفاقت ہے جس کی اجازت خود اللہ نے دی ہے اور وہی اس کا نگران ہے۔ یہ اُس کی عنایت اور بے پایاں رحمت کی ایک علامت ہے جیسا کہ وہ خود قرآن میں فرماتا ہے۔ (حوالہ کے لیے دیکھیے قرآن کا سورہ ۳۰: آیت ۲۱)

لہٰذا یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں شادی ایک مستقل تعلق اور

؏ اس موضوع کے سلسلے میں کتاب ہٰذا کے باب چہارم میں "خاندانی زندگی" کے حصے کا مطالعہ بھی کیجیے۔

مسلسل ہم آہنگی کا ذریعہ ہے۔ یہ مستقل تعلق اور ہم آہنگی نہ صرف مرد اور عورت کے درمیان ہوتی ہے بلکہ اُن کے اور اللہ کے درمیان بھی ہوتی ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ جب دو مسلمان شادی کا معاہدہ طے کرتے ہیں تو اس نیت سے کرتے ہیں کہ وہ اچھے بُرے ہر قسم کے حالات میں اسے آخر تک کامیابی سے نبھائیں گے۔ یہ نتیجہ حاصل کرنے کے لیے اسلام نے کچھ ضوابط مقرر کیے ہیں تاکہ اس بات کی ہر ممکن ضمانت دی جا سکے کہ شادی ہر لحاظ سے کامیاب رہے گی اور اس کے مقاصد کی بطریقِ احسن تکمیل ہو سکے گی۔ یہ ضوابط حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ فریقین کو ایک دوسرے کے بارے میں مناسب حد تک آگاہی حاصل کر لینی چاہیے اور یہ کام اس طریقے سے انجام پانا چاہیے کہ اس میں کوئی غیر اخلاقی، پُرفریب اور استحصالی رویہ شامل نہ ہونے پائے۔

۲۔ مرد کو بالخصوص تاکید کی گئی ہے کہ وہ شریکِ حیات کا انتخاب مذہبی اخلاص، اخلاقی سالمیت، کردار اور چال چلن کی بنیاد پر کرے۔ اُس کی دولت یا اعلیٰ نسبی یا محض جسمانی دلکشی کی پروا نہ کرے۔

۳۔ عورت کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ اس بات کا یقین کر لے کہ شادی کے لیے جس مرد کا پیغام آیا ہے وہ واقعی اُس سے میل کھاتا ہے، محبت اور عزت دیے جانے کے قابل ہے اور اُسے (بیوی کو) خوش رکھ سکے گا۔ اس بنیاد پر وہ کسی ایسے مرد کا پیغام جسے وہ اپنی سطح سے کم تر یا غیر موزوں سمجھتی ہے مسترد کر سکتی ہے کیونکہ ایسی شادی کے بعد وہ زوجہ کی حیثیت میں اپنے فرائض صحیح طور پر ادا نہیں کر پائے گی۔ ایسی صورت میں وہ اپنی ہونے والی شادی کو منسوخ بھی کر سکتی ہے۔

۴۔ عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ شادی کے امیدوار سے اپنے معیار اور اُس (امیدوار) کے وسائل کے مطابق جہیز کا مطالبہ کرے۔ اگر وہ اس حق سے دستبردار ہونا چاہے

اور معمولی جہیز یا بغیر جہیز کے ہی مرد کو قبول کرنے پر رضامند ہو تو وہ ایسا کر سکتی ہے۔ مرد کے لیے جہیز کی ادائی کا جو حکم دیا گیا ہے اس کا مقصد عورت کو یہ یقین دلانا ہے کہ پیغام بھیجنے والا واقعی اُسے چاہتا ہے، اُس کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور شوہر کی حیثیت میں معاشی اور دیگر ذمہ داریاں جو اُس پر عائد ہوتی ہیں نبھانے کیلئے تیار اور آمادہ ہے۔ اس کے علاوہ جہیز ایک علامتی اشارہ ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ عورت محفوظ و مامون رہے گی نیز مرد کسی مادی فائدے کے پیشِ نظر شادی نہیں کر رہا۔ علاوہ ازیں جہیز فریقین کی توقعات کے درمیان ایک واضح خط کھینچ دیتا ہے اور ہر فریق بخوبی جان لیتا ہے کہ اُسے دوسرے فریق سے کونسی توقعات وابستہ کرنی چاہئیں اور کون سی نہیں کرنی چاہئیں۔

۵۔ شادی علی الاعلان ہونی چاہیے اور اس کی تقریب نہایت پُرمسرت انداز میں منائی جانی چاہیے۔ ہر دو فریق کی بلا جبر و اکراہ رضامندی نکاح کی لازمی شرط ہے جس کے بغیر عقدِ نکاح درست اور جائز نہیں۔

۶۔ ہر شادی کو قانونی طور پر جائز بنانے کے لیے دو بالغ افراد کی شہادت اور سرکاری دستاویزات میں ضروری تفصیلات کا اندراج لازم ہے۔

۷۔ بیوی کی مکمل کفالت شوہر کے فرائض میں شامل ہے۔ بیوی کو نان نفقے کا حق شادی کی بدولت ملتا ہے۔ اگر اُس کی کوئی جائداد یا املاک وغیرہ ہے تو شادی سے پہلے اور شادی کے بعد یہ سب چیزیں اُسی کی ملکیت میں رہیں گی۔ شوہر کا اپنی بیوی کی جائداد کے کسی حصے پر کوئی حق نہیں۔ شوہر کو اس لیے یہ حق نہیں دیا گیا تاکہ شادی کے نیک اور اعلیٰ مقاصد کو برقرار رکھا جا سکے اور یہ ادارہ گھٹیا محرکات میں اُلجھ کر نہ رہ جائے۔

آپ ملاحظہ کر سکتے ہیں کہ اسلام نے مندرجہ بالا اقدامات کے ذریعے شادی کو

ایک خوشگوار رفاقت بنانے اور مسلسل ہم آہنگی اور مستقل سلامتی کی ٹھوس بنیادیں فراہم کرنے کی ہر ممکن ضمانت دی ہے لیکن انسانی رویّے کے تغیر پذیر ہونے اور بعض اوقات اس کا قبل از وقت اندازہ نہ ہو سکنے کے پیشِ نظر اسلام انسانی زندگی کے بارے میں حقیقت پسندانہ طرزِ عمل اختیار کرتا ہے اور ہر قسم کے غیر متوقع طور پر پیش آنے والے واقعات کے لیے گنجائش دیتا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے شادی کا ادارہ اعلیٰ اور نیک مقاصد کا حامل ہے جن کی تکمیل نہایت ضروری ہے۔ اسلام کسی ایسی شادی کو قبول اور تسلیم نہیں کرتا جو غیر مؤثر ہو اور جس سے مقاصد کی تکمیل نہ ہوتی ہو۔ محض نام کی یا بے بنیاد شادی کوئی شادی نہیں۔ شادی کو ہر لحاظ سے کامیاب ہونا چاہیے یا سرے سے شادی ہونی ہی نہیں چاہیے۔ شادی اتنا سنجیدہ اور مقدس معاہدہ ہے کہ یہ بے عمل یا غیر مؤثر نہیں رہ سکتا۔ پس اگر اس معاہدے کا مقصد مناسب طور پر پورا نہیں ہوتا تو اسے بذریعہ طلاق اس طرح ختم کیا جا سکتا ہے کہ فریقین کے تمام حقوق کا تحفظ ہو سکے۔ ایسا اس لیے کیا جاتا ہے کہ محض نام کا یا بیکار کا معاہدہ برقرار رکھنے میں کوئی معقولیت نہیں اور اس لیے بھی کہ انسان کو ایسے عہد و پیمان کے بندھن سے نجات دلائی جائے جس پر وہ پورا نہیں اتر سکتا۔

جب اسلامی شادی جو متذکرہ ضوابط اور احتیاطی اقدامات کی بنیاد پہ طے پاتی ہے اپنے فرائضِ منصبی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی تو اس کا مطلب ہے کہ راستے میں نہ دور کوئی بہت بڑی رکاوٹ موجود ہے ایسی رکاوٹ جسے مصالحت کے ذریعے دور نہیں کیا جا سکتا۔ اس قسم کی صورتِ حال میں طلاق پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ تاہم طلاق مسئلے سے نمٹنے کی آخری تدبیر ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "اللہ تعالیٰ کے نزدیک جائز چیزوں میں سب سے زیادہ مکروہ چیز طلاق ہے۔" لیکن یہ آخری اور مایوسانہ قدم اٹھانے سے قبل مسئلے کو سلجھانے کی کچھ کوششیں ضرور کی جانی چاہئیں جن کی ترتیب یہ ہے۔

۱۔ متعلقہ فریقین کے لیے لازم ہے کہ وہ آپس میں مل بیٹھ کر اپنے تنازعات کا خود تصفیہ کرنے اور اپنے مسائل کا حل خود تلاش کرنے کی کوشش کریں۔

۲۔ اگر وہ ایسا کرنے میں ناکام رہیں تو دو ثالث مقرر کیے جائیں جن میں سے ایک شوہر کے رشتہ داروں میں سے اور دوسرا بیوی کے رشتہ داروں میں سے ہو۔ یہ دونوں ثالث فریقین کے درمیان صلح کرانے اور اُن کے اختلافات کا تصفیہ کرانے کی کوشش کریں۔

۳۔ اگر یہ کوشش بھی ناکام ہو جاتی ہے تو طلاق پر عملدر آمد ہو سکتا ہے۔

اس قسم کی مشکل صورتِ حال میں طلاق پر عملدر آمد کرانے کے لیے اسلامی قانون کا تقاضا یہ ہے کہ ہر دو فریق اس فیصلے پر متفق ہوں اور ہر ایک کو طلاق طلب کرنے کا حق حاصل ہو۔ اسلام طلاق کے حق کو صرف مرد تک یا صرف عورت تک محدود نہیں کرتا۔ دونوں اس حق کو استعمال کر سکتے ہیں۔ اگر دونوں میں سے ایک فریق من مانی کرتے ہوئے طلاق منظور کرنے سے انکار کر دیتا ہے اور دوسرا فریق اُس کے اس فیصلے سے مطمئن اور خوش نہیں ہے اور اگر طلاق کا مطالبہ جائز نظر آتا ہے تو عدالت کے لیے لازم ہے کہ وہ مداخلت کرتے ہوئے طلاق حاصل کرنے میں اُس فریق کی مدد کرے جس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ قانون کے محافظین کا فرض ہے کہ وہ اس بات کی اچھی طرح تسلی کرلیں کہ ہر فریق کے تمام حقوق محفوظ ہیں اور فریقین کو کم سے کم گزند پہنچا ہے۔

طلاق واقع ہونے کے بعد عدّت کا زمانہ آتا ہے۔ عدّت عام طور پر تین ماہ سے بارہ ماہ تک کی مدت کی ہو سکتی ہے۔ عدت کے دوران مطلّقہ کی مکمل کفالت اور نان نفقہ کی ذمہ داری سابقہ شوہر پر عائد ہوتی ہے۔ عدّت کی مدّت ختم ہونے سے پہلے وہ کسی دوسرے مرد سے شادی نہیں کر سکتی۔ عدّت کا زمانہ فریقین کے لیے اپنے رویّوں پر زیادہ سنجیدگی سے غور کرنے اور علیحدگی کے اثرات پر سوچ بچار کرنے کا ایک اور موقع

ہوتا ہے۔ اگر اس دوران دوبارہ متحد ہونا چاہیں تو وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ درحقیقت عدت کے ذریعے اُن کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ دوبارہ ایک دوسرے سے آ ملیں کیونکہ یہ علیحدگی انہیں ایک دوسرے کو مزید سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ جب عدت کی مدت ختم ہو جاتی ہے تو مطلقہ کسی دوسرے مرد سے شادی کرنے میں آزاد ہوتی ہے۔ اب وہ ایک دوسرے کے ذمّہ دار نہیں رہتے۔

اگر عدت کے دوران مطلّقہ اور اُس کا سابق شوہر دوبارہ ایک ہونے کے خواہش مند ہوں تو اُن کا نئے سرے سے نکاح ہوگا۔ اگر اس کے بعد اُن کے تعلقات میں بہتری پیدا نہیں ہوتی تو وہ دوبارہ پہلے کی طرح طلاق کی تدبیر اختیار کر سکتے ہیں۔ اس دوسری مرتبہ کی طلاق کے بعد بھی وہ عدت کے دوران نکاح کے ذریعے دوبارہ متحد ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر یہ دوسری مرتبہ کا اکٹھ بھی کامیاب نہ ہو تو پھر طلاق کو حتمی اور آخری شکل دی جا سکتی ہے۔

پہلی مرتبہ طلاق کی اجازت دیتے ہوئے اسلام اپنی پالیسی کی وضاحت کرتا ہے کہ اسلام شادیوں میں رنجیدگی سرد مہری اور جمود کو برداشت نہیں کرتا کیونکہ یہ کیفیتیں طلاق سے بڑھ کر مضرت رساں ہیں۔ یکے بعد دیگرے دو مرتبہ کی طلاق اور ہر طلاق کے بعد فریقین کو دوبارہ ایک دوسرے سے آملنے کا اختیار دے کر اسلام شادی کو مؤثر اور بامقصد بنانے کا ہر قابلِ فہم موقع فراہم کرتا ہے۔ اس طرح اسلام ہر قسم کے مسائل کو حل کرنے اور ہر قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار ہے۔ یہ طلاق کی اجازت تو دیتا ہے لیکن ایسا کر کے شادی کو خطرے میں نہیں ڈالتا۔ اس کے برعکس اسلام اس اقدام کی اجازت دے کر شادی کو مستحکم بناتا ہے۔ کیونکہ زیادتی کرنے والا فریق جانتا ہے کہ جس فریق کے ساتھ زیادتی ہوگی وہ طلاق کے ذریعے ناانصافی اور ضرر سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ یہ جان لینے کے بعد کہ شادی صرف اُس وقت تک مؤثر ہے جب تک یہ بامقصد اور کامیاب ہے، فریقین کوئی ایسی بات کرنے سے پہلے جس سے شادی کا تسلسل متاثر ہوتا ہو ہر ممکن

کوشش کرتے ہیں کہ اُن کی شادی اپنے فرضِ منصبی سے بطریقِ احسن عہدہ برآ ہوتی ہے۔ ایسی شادی
کی اجازت سے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہر فریق شادی سے پہلے اپنے ساتھی کے انتخاب
میں اور شادی کے بعد اُس کے ساتھ برتاؤ میں محتاط رویّہ اختیار کرتا ہے۔

جب اسلام فریقین کی باہمی رضامندی سے یا زیادتی کا شکار ہونے والے فریق کی
جانب سے عدالت کی مداخلت کے ذریعے طلاق کو قابلِ حصول بناتا ہے تو یہ اس دوران
نظامِ اخلاقیات اور انسانی وقار کا سختی سے خیال رکھتا ہے۔ یہ کسی شخص کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ
اپنے بے وفا شریکِ حیات کی ناانصافی اور مضرت رسانی کا شکار ہوتا رہے۔ یہ لوگوں کو اخلاق
باختگی اور ناشائستگی کی طرف نہیں لے جاتا۔ یہ انہیں صاف صاف بتا دیتا ہے کہ یا تو آپس میں
مِل جُل کر جائز اور پُرمسرت زندگی گزارو اور اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو باوقار اور عمدہ طریقے
سے ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر لو۔ اس ضمن میں اخلاقی اور انسانی لحاظ سے اسلام
سے متعلق سب سے زیادہ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ طلاق حاصل کرنے کے لیے کسی مرد یا
عورت کو اپنا عزّ و وقار یا اصولِ اخلاق مجروح کرنے پر مجبور نہیں کرتا۔ مسلمان مرد یا عورت
کے لیے طلاق منظور ہونے سے پہلے برسوں تک اپنے شریکِ حیات سے علیحدہ رہنا ضروری
نہیں، نہ طلاق کی منظوری بدکاری سے مشروط ہے۔ بہت سے دوسرے نظام یا طریقہ ہائے
کار جس "علیحدگی" کی تائید کرتے ہیں اُس میں بہت سی غیر اخلاقی اور ناشائستہ حرکات کا
امکان ہوتا ہے۔ بلکہ اس قسم کی برائیاں یقینی طور پر وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ اس قسم کی "علیحدگی"
کی صورت میں انسان نہ تو اپنے حقوق سے بہرہ ور ہو سکتا ہے نہ شادی کے فرائض سے
عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ فریقین میں سے ہر ایک فریق سرکاری طور پر
شادی شدہ ہوتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ اپنی ازدواجی زندگی سے کس حد تک لطف اندوز
ہو رہا ہوتا ہے؟ وہ شادی کے بندھن میں بہت بُری طرح جکڑا ہوا ہوتا ہے اس کے
باوجود وہ اتنا آزاد ہوتا ہے کہ کوئی پابندی اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ مرد طلاق

حاصل کر سکتا ہے نہ دوسری شادی ہی کر سکتا ہے۔ لیکن کیا اُس کے لیے دوسری عورتوں سے اختلاط کی کوئی قانونی حد مقرر ہے؛ وہ جس کے ساتھ چاہے بلا روک ٹوک آزادانہ گھوم پھر سکتا ہے۔ یہ ایسے واقعات ہیں جو ہر روز رونما ہوتے ہیں اور ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اس قسم کی "علیحدگی" طلاق حاصل کرنے میں ممد ثابت ہو سکتی ہے لیکن یہ اخلاقیات کے لیے کتنی مہنگی ہے اور اس کے لیے معاشرے کو کتنی بھاری قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ یہ ایک ایسی صورتِ حال ہے جسے اسلام کبھی قبول نہیں کر سکتا یا اس کی تائید نہیں کر سکتا کیوں کہ اس سے اخلاقی اقدار کا پورے کا پورا نظام جس کی آبیاری اسلام کرتا ہے تہس نہس ہو کر رہ جائے گا۔

بدکاری اور بعض نظاموں کی طرف سے طلاق کی بنیاد پر اس کی تائید کے بارے میں ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بات انسانی وقار کے لیے انتہائی ذلت آمیز اور نظامِ اخلاقیات کے لیے سخت نقصان دہ ہے کہ کوئی شخص طلاق حاصل کرنے کے لیے بدکاری کا ارتکاب کرے یا یہ ظاہر کرے کہ وہ بدکاری کا مرتکب ہوا ہے۔ بدکاری کے ضمن میں اسلام کا نقطۂ نظر اوپر بیان کیا جا چکا ہے تاہم اکثر حالات میں ہوتا یہ ہے کہ طلاق کے خواہشمندوں کو طلاق اس لیے نہیں دی جاتی کہ وہ بدکاری کے مرتکب ہوئے ہیں یا انھوں نے خود کو بدکار ظاہر کیا ہے بلکہ وہ اس لیے بدکاری کا ارتکاب کرتے ہیں اور خود کو بدکار ظاہر کرتے ہیں کہ طلاق کا فیصلہ حاصل کر سکیں کیونکہ کسی اور سبب کی بنا پر اُن کی طلاق منظور نہیں ہوتی۔ یہ طریقۂ کار انسانی تعلقات پر کس قدر منفی اور شرمناک اثرات مرتب کرتا ہے۔

یہ ہے طلاق کے مسئلے پر اسلام کا موقف۔ اگر آخری چارۂ کار کے طور پر طلاق ہی حاصل کرنا ہے تو یہ باوقار اور باعزت طریقے سے منظور کی جانی چاہیے۔ جب اسلام کا اطلاق ازدواجی زندگی پر ہوتا ہے تو طلاق کی بنیاد پر "علیحدگی" یا "بدکاری" کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی نہ اسلام ہالی ووڈ طرز کی آسان طلاق کا اہتمام کرتا ہے جو انتہا پسندانہ ردِعمل کا

نتیجہ ہوتی ہے اور جس میں لچک کی ذرا گنجائش نہیں ہوتی۔ کوئی بھی نظام جس کا تعلق فطرتِ انسانی سے ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ حقیقت پسندانہ اور اعتدال پسندانہ ہو اور جو ہر قسم کے حالات میں پوری تیاری کے ساتھ ہر قسم کے مسائل سے نمٹنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ (حوالے کے لیے دیکھیے قرآن کا سورہ ۲ : آیات ۲۲۴ تا ۲۳۲، سورہ ۴ : آیات ۳۴ تا ۳۵، سورہ ۴ : آیات ۱۲۷ تا ۱۳۰)

بحث کو سمیٹتے ہوئے ہم آخر میں عرض کرنا چاہیں گے کہ ہر معروف معاشرے اور مذہب میں عملاً کسی بھی شادی کو ختم کرنے کے کچھ طریقے ہوتے ہیں۔ صنعتی طور پر ترقی یافتہ دنیا میں طلاق کی شرح میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور طلاق کے قوانین میں مسلسل نرمی کی جا رہی ہے تاہم اسلامی طلاق اب بھی ایک ایسا اقدام ہے جو نمایاں طور پر اخلاقی اقدار کا پابند ہے۔ زوجین کے لیے اللہ کا حکم ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ نرمی اور رواداری سے پیش آئیں۔ انہیں یاد دلایا گیا ہے کہ کوئی انسان اپنے شریکِ حیات کی کسی بات کو بھلا کیسے ناپسند کر سکتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی خوبیاں اور نیکیاں ودیعت کر دی ہیں۔ اگر زوجین ایک دوسرے کے لیے نیک جذبات رکھتے ہیں اور اکٹھے رہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں اپنی مدد کا یقین دلاتا ہے۔ لیکن اگر انہیں طلاق کے ذریعے ایک دوسرے سے الگ ہونا ہی ہے تو طلاق کا حصول دوسرے فریق کو کسی قسم کی ٹھیس یا گزند پہنچانے کی نیت کے بغیر ہونا چاہیے۔ اگر وہ سلیقے اور باعزت طریقے سے الگ ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں اپنی ہمہ گیر فیاضیوں سے مالا مال کرنے کا یقین دلاتا ہے۔ پوری ازدواجی زندگی از اوّل تا آخر ایمان باللہ کے گرد گھومتی ہے اور اللہ ہی کی سمت اپنا رُخ متعین کرتی ہے۔ طلاق سے متعلق قرآنی آیات خشک قسم کی قانونی شرائط نہیں ہیں بلکہ اُن کے آغاز اور اختتام میں اعلیٰ درجے کی اخلاقی تعلیمات مضمر ہیں۔ فریقین کی اخلاقی ذمہ داریاں طلاق کی تاریخ سے کہیں آگے تک پھیلی ہوئی ہیں۔

بے شک یہ پورا مسئلہ اعلیٰ درجے کے اخلاقی نظام میں اس طرح رچا بسا ہوا ہے کہ طلاق کو بجا طور پر ایک اخلاقی اقدام کہا جا سکتا ہے۔

۵۔ اسلام میں عورت کا مقام

اسلام میں عورت کا مقام کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتا۔ عورتوں کے بارے میں قرآن کے نقطۂ نظر اور ابتدائی مسلمانوں کے طرزِ عمل سے اس حقیقت کی شہادت ملتی ہے کہ عورت زندگی کے لیے کم از کم اتنی ہی اہم ہے جتنا کہ خود مرد۔ وہ مرد سے کم تر نہیں ہے نہ وہ کوئی پست درجے کی مخلوق ہے۔ اگر اسلامی دنیا سے غیر ملکی ثقافتوں اور بیرونی اثرات کی مڈبھیڑ نہ ہوتی تو مسلمانوں میں یہ مسئلہ کبھی سر نہ اُٹھاتا۔ اسلام میں عورت کا مقام مرد کے مساوی تسلیم کیا گیا تھا۔ یہ ایک معمول کی بات اور ایک عام سی حقیقت تھی اور اُس وقت اسے کوئی مسئلہ تصوّر نہیں کیا جاتا تھا۔

یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اسلام نے عورتوں کا مقام متعین کرنے کے لیے معاشرے میں کون سی مستقل بنیادیں فراہم کیں ہمیں قبل از اسلام کے زمانے کی عورت اور آج کی جدید دنیا کی عورت کی قابلِ رحم حالت پر ماتم کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسلام نے عورت کو وہ حقوق اور مراعات بخشیں جو اُسے دوسرے مذہبی یا آئینی نظاموں میں کبھی حاصل نہیں رہیں۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس مسئلہ کے جزوی مطالعہ کی بجائے اس کا من حیث المجموع تقابلی انداز میں جائزہ لیا جائے۔ عورت کے حقوق اور فرائض مرد کے حقوق اور فرائض کے مساوی ہیں لیکن ضروری نہیں کہ ان میں یکسانی بھی ہو۔ مساوی ہونا اور یکساں ہونا دو بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ یہ اختلاف سمجھ میں آتا ہے کیونکہ مرد اور عورت یکساں یا ایک جیسے نہیں ہیں بلکہ انہیں ایک دوسرے کے مساوی پیدا کیا گیا

ہے۔ اگر اس فرق کو ذہن میں رکھا جائے تو کوئی مسئلہ باقی نہیں رہتا۔ دو ایک جیسے مرد یا دو ایک جیسی عورتیں تلاش کرنا بھی تو قریب قریب ناممکن ہے۔

مساوات اور یکسانیت میں یہ فرق بہت اہمیت رکھتا ہے۔ مساوات ایک پسندیدہ، مبنی بر انصاف اور اچھی چیز ہے لیکن یکسانیت کے بارے میں ہم یہ بات نہیں کہہ سکتے۔ قدرت لوگوں کو یکساں یا بالکل ایک جیسا پیدا نہیں کرتی بلکہ انہیں مساوی یا بالفاظِ دیگر ایک دوسرے کے برابر پیدا کرتی ہے۔ اگر یہ فرق ذہن نشین کر لیا جائے تو پھر اس سوچ کی گنجائش نہیں رہتی کہ عورت مرد سے کم تر ہے۔ یہ مفروضہ قائم کرنے کا کوئی جواز موجود نہیں کہ عورت مرد سے اس لیے کم اہم ہے کہ اس کے حقوق مرد کے حقوق سے یکسانیت نہیں رکھتے۔ اگر عورت کی حیثیت مرد کی حیثیت سے یکسانیت رکھتی تو وہ مرد کی ہُو بہُو نقل ہوتی جو کہ وہ نہیں ہے۔ یہ حقیقت کہ اسلام اُسے مرد کے مساوی حقوق دیتا ہے لیکن یکساں نہیں اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام عورت کو پوری طرح اہمیت دیتا ہے، اُس کا خیال رکھتا ہے اور اُس کی جداگانہ شخصیت کو تسلیم کرتا ہے۔

عورت سے متعلق بات کرتے ہوئے اسلام ایسا لہجہ اختیار نہیں کرتا کہ اُس پر شیطانی مخلوق یا بدی کا بیج ہونے کی چھاپ لگ جائے۔ نہ قرآن مرد کو عورت کے حاکمِ اعلیٰ کی حیثیت دیتا ہے جس کی حاکمیت کے آگے سر انداز ہونے اور جس کی اطاعت کرنے کے سوا عورت کے پاس کوئی چارہ نہ ہو۔ پھر یہ مسئلہ کہ عورت میں روح ہے یا نہیں اسلام کا پیش کردہ نہیں ہے۔ اسلامی تاریخ میں کسی بھی مسلمان نے عورت کے انسانی مقام یا اُس کے ذی روح ہونے اور دیگر اعلیٰ روحانی صفات کے حامل ہونے پر شبہ نہیں کیا۔ دوسرے عام عقائد کے برعکس اسلام انسان کے اوّلین گناہ کا الزام صرف حوّا کو نہیں دیتا۔ قرآن بڑی وضاحت سے بیان کرتا ہے کہ آدمؑ اور حوّا دونوں گناہ کی طرف راغب ہوئے اور دونوں نے گناہ کا ارتکاب کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے پشیمان ہونے پر دونوں کے گناہ

معاف کیے اور خدا دونوں سے مشترکہ طور پر مخاطب ہوا۔ (حوالہ کے لیے دیکھیے قرآن کا سورہ ۲: آیات ۳۵ تا ۳۶، سورہ ۷: آیات ۱۹، ۲۷، سورہ ۲۰: آیات ۱۱۷ تا ۱۲۳)

درحقیقت قرآن یہ تاثر دیتا ہے کہ اولین گناہ کی زیادہ ذمہ داری حضرت آدمؑ پر عائد ہوتی ہے کیونکہ اُن کے اس گناہ کی وجہ سے عورت کے خلاف تعصب پیدا ہوا اور اُس کے افعال کو شک کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ لیکن اسلام اس تعصب اور شک کو جائز قرار نہیں دیتا کیونکہ آدمؑ اور حوا دونوں برابر کے خطاکار تھے اور اگر ہم حوا کو قصوروار ٹھہراتے ہیں تو آدمؑ کو بھی اتنا ہی بلکہ اس سے زیادہ قصوروار ٹھہرایا جانا چاہیے[۱۳]

اسلام میں عورت کا مقام یکسر منفرد اور نیا ہے اور اس حد تک جداگانہ ہے کہ کسی دوسرے نظام میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اگر ہم مشرق کی کمیونسٹ دنیا یا جمہوری اقوام پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ عورت فی الحقیقت خوش نہیں ہے۔ اُسے زندہ رہنے کے لیے بڑی مشقت کرنا پڑتی ہے اور بعض اوقات تو وہ وہی کام کر رہی ہوتی ہے جو مرد کرتا ہے لیکن اُسے اُجرت مرد کے مقابلے میں کم ملتی ہے۔ اُسے ایک قسم کی آزادی حاصل ہے جو بعض حالات میں آوارگی یا فحاشی کی حدوں کو چھُونے لگتی ہے۔ عورت آج جس مقام پر کھڑی ہے اُسے وہاں تک پہنچنے کے لیے کئی عشروں بلکہ صدیوں تک سخت جدوجہد کرنا پڑی ہے۔ تعلیم کا حق اور محنت کر کے کمانے اور آزادی حاصل کرنے کے لیے اُسے بڑی تکلیف دہ قربانیاں دینی پڑیں اور اپنے بہت سے فطری حقوق سے دستبردار ہونا پڑا۔ ایک ذی روح انسان کا درجہ حاصل کرنے کے لیے اُس نے بڑی بھاری قیمت ادا کی ہے۔

---

[۱۳] زیرِ بحث مضمون کے سلسلے میں اس کتاب کے باب دوم کے حصہ "تصورِ گناہ" کا مطالعہ بھی کیجیے۔

لیکن ان تمام بھاری قربانیوں اور طویل جد و جہد کے بعد اُس نے وہ مقام حاصل نہیں کیا جو اسلام نے آسمانی ہدایت کے ذریعے مسلمان عورت کو دیا ہے۔

عہد جدید میں عورت کو جو حقوق حاصل ہیں وہ معاشرے نے اُسے اپنی خوشی سے یا ازراہِ نوازش نہیں دیے۔ آج کی عورت اپنے موجودہ مقام تک قدرتی طریق کار یا باہمی رضامندی یا مذہبی تعلیمات کے ذریعے نہیں بلکہ اپنی جدوجہد کے زور سے پہنچی ہے۔ اُسے اپنی طاقت سے اپنا راستہ خود بنانا پڑا اور اس طریقہ کار میں بہت سے عوامل نے اُس کی مدد کی۔ جنگوں کے دوران افرادی قوت کی کمی، اقتصادی دباؤ اور صنعتی ترقی کی ضروریات نے عورت کو گھر سے باہر نکلنے پر مجبور کیا۔ اُسے کام کرنا پڑا، علم حاصل کرنا پڑا، اپنی روزی کے لیے جد وجہد کرنا پڑی، خود کو مرد کے برابر ظاہر کرنا پڑا اور جدوجہد حیات میں اُسے مرد کے شانہ بشانہ دوڑنا پڑا۔ حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُسے بزور آگے آنا پڑا اور اس طرح اُس نے ایک نیا مقام حاصل کر لیا۔ کیا تمام عورتیں ان حالات سے خوش تھیں جو اُن کے اردگرد پیدا ہو گئے تھے اور کیا اب وہ اِن حالات سے برآمد ہونے والے نتائج سے مطمئن ہیں؟ یہ ایک بالکل مختلف مسئلہ ہے۔

لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ عہدِ جدید کی عورت کو جو حقوق بھی حاصل ہیں وہ مسلمان عورت کو حاصل ہونے والے حقوق سے کم ہیں۔ اسلام نے عورت کے لیے ہر اُس چیز کی ضمانت دی ہے جو اُس کی فطرت سے مطابقت رکھتی ہے، اُسے مکمل تحفظ عطا کرتی ہے، رسوائی کا باعث بننے والے حالات سے محفوظ رکھتی ہے اور زندگی کے غیر یقینی راستوں سے بچاتی ہے۔

ہم یہاں جدید عورت کے مقام کی وضاحت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے،

نہ ہم اُن خطرات کی تفصیل میں جانا چاہتے ہیں جن کا سامنا آج کی عورت کو اپنی روزی کمانے اور معاشرے میں قدم جمانے کے لیے کرنا پڑتا ہے۔ ہمیں اُن مصائب اور رکاوٹوں کا جائزہ لینے کی بھی ضرورت نہیں جن کے نرغے میں آج کی عورت نام نہاد حقوق کی وجہ سے گھری ہوئی ہے نہ ہم اپنے موقف کی تائید میں اُن بے شمار دکھی گھروں کی صورتحال سے کوئی فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں جو اُس "آزادی" اور "حقوق" کی نذر ہو گئے جن پر دورِ جدید کی عورت فخر کرتی ہے۔ آج کی بہت سی خواتین آزادی کے حق کو آزادانہ گھومنے پھرنے، کام کر کے روزی کمانے اور خود کو مردوں کے برابر ظاہر کرنے کے لیے استعمال کرتی ہیں لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ گھروں کی قیمت پر کیا جاتا ہے۔ یہ تو وہ حقیقت ہے جو اظہر من الشمس ہے اور جسے سب جانتے ہیں لیکن جس حقیقت کو لوگ نہیں جانتے وہ اسلام میں عورت کا مقام ہے۔ یہاں عورت سے متعلق اسلام کے نقطۂ نظر کو مختصراً بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

۱۔ اسلام افزائشِ نسل کے ضمن میں عورت کو مرد کا ایک مکمل اور برابر کا شریکِ کار تسلیم کرتا ہے۔ مرد باپ ہے اور عورت ماں۔ دونوں ہی زندگی کے لیے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ افزائشِ نسل میں عورت کا کردار کسی طرح بھی مرد سے کم اہم نہیں ہے۔ اس شرکتِ کار کی وجہ سے عورت زندگی کے ہر پہلو میں مرد کے بالمقابل برابر کی حصہ دار، مساوی حقوق کی حقدار اور فرائض کی انجام دہی میں برابر کی ذمہ دار ہے۔ اُس کی ذات میں اتنی ہی خوبیاں اور اتنی ہی انسانی صفات مجتمع ہیں جتنی کہ مرد میں ہیں نسلِ انسانی کی افزائش میں اس مساویانہ شرکت کے بارے میں ارشادِ ربانی ہے۔

> لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو......
>
> (قرآن کا سورہ ۴۹: آیت ۱۳، سورہ ۴: آیت ۱)

۲۔ عورت ذاتی اور مشترکہ ذمہ داریاں اُٹھانے اور اپنے کام کے بدلے صلہ وصول کرنے میں مرد کے ہم پلہ ہے۔ انسانی صفات سے مرصّع ہونے اور روحانی بلندیوں تک پہنچنے کی آرزومندی میں اُسے ایک خودمختار شخصیت کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اُس کی انسانی فطرت نہ تو مرد کی فطرت سے کم تر ہے نہ اُس سے مختلف ہے۔ دونوں ایک دوسرے کا جزوِ لاینفک ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے۔

جواب میں اُن کے رب نے فرمایا "میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں۔ خواہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو....." (سورہ ۳: آیت ۱۹۵، سورہ ۹: آیت ۷۱، سورہ ۳۳: آیات ۳۵ تا ۳۶، سورہ ۶۶: آیات ۱۹ تا ۲۱)

۳۔ عورت علم و دانش کے حصول کی کوشش میں مرد کے ہم پلہ ہے۔ جب اسلام مسلمانوں کو علم حاصل کرنے کا حکم دیتا ہے تو مرد اور عورت میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھتا۔ قریباً چودہ صدیاں پہلے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اعلان فرمایا تھا کہ تحصیلِ علم ہر مسلمان مرد اور ہر مسلمان عورت کے لیے فرض ہے۔ یہ ایک واضح حکم تھا اور تاریخ کے ہر دور میں مسلمانوں نے اس پر عمل کیا۔

۴۔ عورت کو آزادیٔ اظہار کا اتنا ہی حق حاصل ہے جتنا مرد کو ہے۔ اس کی صائب تجاویز کو پوری اہمیت دی جاتی ہے اور کوئی رائے محض اس لیے مسترد نہیں کی جاتی کہ اس کے پیش کنندہ کا تعلق جنسِ نسوانی سے ہے۔ قرآن اور تاریخ سے ثابت ہے کہ عورتیں نہ صرف اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کیا کرتی تھیں بلکہ بحث مباحثہ میں حصہ لیتی تھیں اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور دوسرے مسلمان رہنماؤں کے ساتھ سنجیدہ گفتگو میں بھرپور انداز میں شرکت کرتی تھیں۔ (حوالہ کے لیے دیکھیے قرآن کا سورہ ۵۸: آیات ۱ تا ۴، سورہ ۶۰: آیات ۱۰ تا ۱۲)

علاوہ ازیں ایسے مواقع بھی آئے جب مسلم خواتین نے مفادِ عامہ سے متعلق قانون سازی کے امور پر اظہارِ خیال کیا اور خلفائے سے اختلافِ رائے کیا حتٰی کہ خلفاء کو ان عورتوں کے ٹھوس دلائل تسلیم کرنے پڑے۔ اس نوع کی ایک خاص مثال حضرت عمرؓ ابن خطاب کے دورِ حکومت میں پیش آئی۔

۵۔ تاریخی واقعات بتاتے ہیں کہ مسلم خواتین ابتدائی زمانہ کے مسلمان مردوں کے ساتھ خاص طور پر ہنگامی حالات میں قومی زندگی کے کاموں میں حصہ لیتی تھیں۔ وہ زخمی سپاہیوں کی مرہم پٹی کرنے، انہیں رسد پہنچانے اور اُن کی خدمت کے لیے میدان جنگ میں اسلامی لشکر کے ساتھ رہتی تھیں۔ انہیں آہنی سلاخوں کے پیچھے نہیں دھکیلا گیا تھا اور ناکارہ اور بے روح مخلوق جان کر نظر انداز نہیں کیا گیا تھا۔

۶۔ اسلام عورتوں کو معاہدات طے کرنے، کاروبار کرنے، کمانے اور بلا شرکتِ غیرے اِملاک رکھنے کے مساویانہ حقوق دیتا ہے۔ اُس کی زندگی، اُس کی جائداد، اُس کی عزت یہ سب چیزیں اتنی ہی مقدس ہیں جتنی مرد کی۔ اگر وہ کسی جرم کا ارتکاب کرتی ہے تو اُسے وہی سزا ملے گی جو اسی قسم کے جرم میں ملوث کسی مرد کو مل سکتی ہے۔ اگر اُس کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے یا اُسے کوئی گزند پہنچتا ہے تو وہ اتنا ہی معاوضہ وصول کرنے کی حقدار ہیں جو اُس کی جگہ کسی مرد کو مل سکتا تھا۔

(حوالہ کے لیے دیکھیے قرآن کا سورہ ۲ : آیت ۱۷۸، سورہ ۴ : آیت ۴۵،

۹۲ تا ۹۳)

۷۔ اسلام یہ حقوق شماریاتی شکل میں بیان نہیں کرتا نہ ان سے بے تعلق ہوتا ہے۔ بلکہ ان حقوق کو ایمان کی لازمی شرائط کا درجہ دیا گیا ہے اور ان کی حفاظت اور ان کو عملی شکل دینے کے لیے تمام تر اقدامات کیے گئے ہیں۔ اسلام اُن لوگوں کو بھی برداشت نہیں کرتا جو عورتوں کے خلاف تعصب برتتے ہیں یا مرد اور عورت میں

امتیاز روا رکھتے ہیں۔ قرآن بار بار اُن لوگوں کو ملامت کرتا ہے جو عورت کو مرد سے کم تر خیال کرتے ہیں۔ (حوالہ کے لیے دیکھئے قرآن کا سورہ ۱۶: آیات ۵۷ تا ۵۹، ۶۲، سورہ ۲۲: آیات ۴۷ تا ۵۰، سورہ ۴۳: آیات ۱۵ تا ۱۹، سورہ ۵۳: آیات ۲۱ تا ۲۳)

۸۔ عورت کو آزاد اور خود مختار انسان تسلیم کرنے کے علاوہ اُس کے وجود کو عالمِ انسانیت کی بقا کے لیے مرد کے بالمقابل مساوی طور پر ضروری سمجھا گیا ہے اور اس بنیاد پر اُسے وراثت میں حصہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ اسلام سے قبل اُسے نہ صرف اس حصّے سے محروم رکھا جاتا تھا بلکہ خود اُسے ایک ملکیت تصوّر کیا جاتا تھا جو وراثت کے طور پر مرد کے حصّے میں آتی تھی۔ اسلام نے عورت میں موجود انسانی صفات کو تسلیم کرتے ہوئے اس قابلِ انتقال جائداد کو وارث بنا دیا۔ عورت خواہ بیوی ہو یا ماں، بہن ہو یا بیٹی اپنے رشتہ دار کے مرنے پر اس کی جائداد میں ایک مخصوص حصّے کی حقدار ہوتی ہے۔ اس حصّے کا تناسب مرنے والے کے ساتھ اُس کی قرابت داری کی نوعیّت اور ورثاء کی تعداد پر منحصر ہوتا ہے۔ یہ حصہ کُلّیتہً اُس کا ہے اور کوئی دوسرا شخص اسے چھین نہیں سکتا یا اُسے وراثت سے محروم نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ اگر مرنے والا بھی اپنی زندگی میں وصیت کے ذریعے دوسرے رشتہ داروں کے حق میں یا کسی مقصد کی خاطر اُسے وراثت سے محروم کرنا چاہے تو قانون اُسے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ ہر صاحبِ جائداد شخص اپنی جائداد کے ایک تہائی حصے کی وصیت لکھ سکتا ہے۔ چنانچہ اُس کی وصیت سے اُس کے ورثاء جن میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں کے حقوق متاثر نہیں ہوتے۔ وراثت کی صورت میں مساوات اور یکسانیت کے مسئلے کا کُلّی طور پر اطلاق ہوتا ہے۔ اصولاً مرد اور عورت دونوں ہی مرنے والے رشتہ داروں کی جائداد کی وراثت کے

مساوی طور پر حقدار ہیں لیکن اُن کے حصوں میں فرق ہوگا۔ بعض مواقع پر مرد دو حصے اور عورت صرف ایک حصہ وصول کرتی ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ مردوں کو ترجیح دی گئی ہے یا انہیں عورتوں پر برتری حاصل ہے۔ ان مواقع پر مرد کو حسبِ ذیل وجوہات کی بناء پر عورت سے زیادہ حصہ ملتا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ خاندان میں مرد ہی اپنی بیوی، اپنے خاندان اور دوسرے حاجتمند رشتہ داروں کی کفالت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اسلامی قانون کے تحت تمام اقتصادی ذمہ داریوں کو نبھانا اور اپنے متوسلین کی مناسب کفالت کرنا اُس کے فرائض میں شامل ہے۔ اُس کا یہ فرض بھی ہے کہ اپنے معاشرے میں تمام نیک مقاصد کے فروغ کے لیے مالی طور پر معاونت کرے۔ غرض ہر قسم کا اقتصادی بوجھ مرد ہی کو اُٹھانا ہوتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اس کے برعکس عورت پر کسی قسم کی اقتصادی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ اُس کے ذاتی اخراجات معمولی نوعیت کے ہوتے ہیں یا پھر اگر وہ چاہے تو اعلیٰ درجے کا سامانِ تعیّش خرید سکتی ہے۔ اقتصادی لحاظ سے اُسے پورا تحفظ حاصل ہے اور ضرورت کی ہر چیز اُسے مہیّا ہو جاتی ہے۔ اگر وہ بیوی ہے تو شوہر اُس کا کفیل ہے، اگر ماں ہے تو بیٹا کفیل ہے، اگر بیٹی ہے تو باپ کفیل ہے، اگر بہن ہے تو بھائی کفیل ہے وعلیٰ ہٰذا القیاس۔ اگر اُس کا کوئی رشتہ دار نہیں جس پر وہ انحصار کر سکے تو پھر وراثت کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اس صورت میں نہ تو کوئی ترکہ ہوگا نہ وصیت کرنے والا۔ تاہم اُسے فاقوں نہیں مرنے دیا جائیگا۔ ایسی عورت کی کفالت پورے معاشرے یعنی ریاست کی ذمہ داری ہے۔ اُسے امداد مہیّا کی جائے گی یا روزی کمانے کے لیے ملازمت دی جائے گی اور جو رقم وہ کمائے گی وہ اس کی بلا شرکتِ غیرے مالک ہوگی۔ وہ اپنے علاوہ کسی اور شخص کی کفالت کی ذمہ دار نہیں ہوگی۔ اگر اُس کی جگہ کوئی مرد ہے تو وہ اپنے خاندان کا یا اگر کسی رشتہ دار کو اُس کی مدد کی ضرورت ہے تو اُس کا بھی کفیل ہوگا۔ پس آپ نے دیکھا کہ مشکل ترین

حالات میں عورت کی اقتصادی ذمہ داریاں محدود ہیں جبکہ مرد کی لامحدود ہیں۔

تیسرے یہ کہ جب عورت وراثت میں مرد سے کم حصہ وصول کرتی ہے تو درحقیقت اُسے کسی ایسی چیز سے محروم نہیں کیا جا رہا جس کے لیے اُس نے محنت کی ہے۔ موروثی جائداد عورت کی کمائی یا اُس کی جدوجہد کا پھل نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو ورثاء کو غیر معین ذریعے سے ملی ہے یعنی یہ ایک اضافی یا فاضل چیز ہے اس کے لیے ورثاء میں سے نہ مرد نے جدوجہد کی ہے نہ عورت نے۔ یہ ایک قسم کی امداد ہے اور اللہ کے قانون کے مطابق امداد کی تقسیم فوری ضروریات اور ذمہ داریوں کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔

اب ذرا غور کیجیے کہ ایک طرف ایک مرد وارث ہے جس پر ہر قسم کی اقتصادی ذمہ داریوں اور واجبات کا بوجھ ہے اور دوسری طرف ایک عورت وارث ہے جو تمام اقتصادی ذمہ داریوں سے آزاد ہے یا اس پر بہت کم ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اب کچھ جائداد یا امداد بطورِ وراثت ان دونوں میں تقسیم کی جاتی ہے۔ اگر ہم عورت کو مکمل طور پر اس ورثے سے محروم کر دیتے ہیں تو یہ اُس کے ساتھ ناانصافی ہو گی کیونکہ وہ مرنے والے کی رشتہ دار ہے۔ اسی طرح اگر ہم ہمیشہ اُسے مرد کے برابر حصہ دیں گے تو یہ مرد کے ساتھ ناانصافی ہو گی۔ چنانچہ کسی ایک کے ساتھ ناانصافی کرنے کی بجائے اسلام موروثی جائداد میں سے مرد کو بڑا حصہ دیتا ہے تاکہ وہ اپنے خاندان کی ضروریات اور معاشرتی ذمہ داریوں کو پورا کر سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے عورت کو یکسر فراموش نہیں کیا بلکہ اُسے اپنی ذاتی ضروریات کی تکمیل کے لیے ورثے کے ایک حصے کا حقدار قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں اسلام مرد سے زیادہ عورت پر مہربان ہے۔ اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ عورت کے حقوق مرد کے حقوق کے برابر ہیں۔ اگرچہ اُن کا یکساں یا ایک جیسا ہونا ضروری نہیں۔ (حوالہ کے لیے دیکھیے قرآن کا سورہ ۴: آیات ۱۱ تا ۱۴ و ۱۷۶)

۹۔ بعض قانونی معاہدوں کی شہادت کے لیے دو مردوں کی یا ایک مرد اور دو عورتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عورت مرد سے کم تر ہے۔ یہ تو شرکائے معاہدہ کے حقوق کی محافظت کے لیے ایک اقدام ہے کیونکہ اصولی طور پر عورت عملی زندگی میں اتنی تجربہ کار نہیں ہوتی جتنا کہ مرد ہوتا ہے۔ تجربے کی یہ کمی معاہدے کے کسی فریق کے لیے نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔ چنانچہ قانون کا تقاضا ہے کہ ایک مرد کے ہمراہ کم از کم دو عورتیں گواہی دیں تاکہ اگر ایک عورت کوئی بات بھول جائے تو دوسری اُسے یاد دلا دے یا اگر ایک عورت تجربے کی کمی کی بنا پر کوئی غلطی کرے تو دوسری عورت غلطی کی تصحیح میں اُس کی مدد کرے۔ یہ ایک احتیاطی اقدام ہے جو لوگوں کے درمیان دیانتدارانہ لین دین اور درست کاروباری معاملات کو یقینی بنانے کے لیے عمل میں لایا جاتا ہے۔ دراصل اس سے عورت کو قومی زندگی میں اپنا کردار ادا کرنے کا موقع ملتا ہے اور معاشرے میں انصاف کے قیام کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ بہرحال قومی زندگی میں تجربے کی کمی کا لازمی طور پر یہ مطلب نہیں کہ عورت کا مرتبہ مرد سے کم تر ہے۔ ہر انسان میں کسی نہ کسی چیز کی کمی ہوتی ہے لیکن کوئی شخص اُس کے انسانی مرتبے پر معترض نہیں ہوتا (حوالہ کے لیے دیکھیے سورہ ۲: آیت ۲۸۲)[۵]

---

۵ دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض امور میں ایک عورت کی بلا شرکتِ غیرے گواہی قابلِ قبول اور اُس کی ماہرانہ رائے فیصلہ کن تسلیم کی جاتی ہے۔ ان امور میں کسی مرد کی گواہی قبول نہیں کی جاتی اور گواہی کے لیے ایک سے زیادہ عورتوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مزید برآں معاہدات اور کاروباری معاملات کے سلسلے میں گواہی کوئی استحقاق نہیں بلکہ ایک فریضہ ہے جس کی انجام دہی ضروری ہے۔ (حوالہ کے لیے دیکھیے قرآن

۱۰۔ عورت کو بعض ایسی مراعات حاصل ہیں جن سے مرد محروم ہے۔ اُسے ایامِ حیض اور زچگی کے دوران بعض مذہبی فرائض کی ادائیگی مثلاً نماز اور روزہ سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ وہ جمعہ کی باجماعت فرض نماز سے بھی مستثنیٰ ہے۔ اُسے تمام اقتصادی ذمہ داریوں کے بوجھ سے آزاد رکھا گیا ہے۔ وہ اللہ کے نزدیک ماں کی حیثیت میں مرد سے زیادہ قدر و منزلت کی حامل ہے (حوالہ کے لیے دیکھیے قرآن کا سورہ ۳۱: آیات ۱۴ تا ۱۵، سورہ ۴۶ : آیت ۱۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرما کر کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے عورت کی اس قدر و منزلت کو تسلیم کیا ہے۔ وہ اپنے بیٹے کی طرف سے تین چوتھائی محبت و شفقت کی حقدار ہے جبکہ باپ کے حصے میں بیٹے کی ایک چوتھائی محبت رہ جاتی ہے۔ بیوی کی حیثیت میں وہ اپنے ہونے والے شوہر سے تمام اشیائے ضرورت اور مکمل نان نفقہ حاصل کرنے کا حق رکھتی ہے۔ اُسے پیسے کمانے کے لیے کام کرنے یا گھریلو اخراجات میں شوہر کا بوجھ کم کرنے کے لیے اپنا حصہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ شادی سے پہلے جو کچھ اُس کی ملکیت میں تھا شادی کے بعد اُسے برقرار رکھ سکتی ہے اور اُس کی کسی چیز پر شوہر کا کوئی حق نہیں۔ بیٹی یا بہن ہونے کی حیثیت میں وہ بالترتیب اپنے باپ یا بھائی سے ہر قسم کے تحفظ اور اشیائے ضرورت کے حصول کا اختیار رکھتی ہے یہ اس کا استحقاق ہے۔ اگر وہ اپنا بوجھ خود اُٹھانے اور گھریلو ذمہ داریوں کی انجام دہی میں حصہ لینا چاہتی ہے تو ایسا کرنے میں وہ مکمل طور پر آزاد ہے بشرطیکہ اس کی سالمیت

کی سورۃ ۲ : آیات ۲۸۲ تا ۲۸۳)

اگر اس فریضہ میں عورت کے حصے کا کام نصف کر دیا گیا ہے تو اس سے اُس کے حقوق کی تردید نہیں ہوتی بلکہ یہ بات اُس کے لیے ایک قسم کی کرم فرمائی اور استثناء کا درجہ رکھتی ہے۔

کردار اور عزت محفوظ رہے۔

۱۱۔ نماز میں عورت کا مرد کے پیچھے قیام کرنے سے کسی بھی مفہوم میں یہ اشارہ نہیں ملتا کہ وہ مرد سے کم تر ہے۔ سطور بالا میں پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے کہ عورت کو با جماعت نمازوں سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے جبکہ مرد کیلیے ان نمازوں میں شریک ہونا عین فرض ہے۔ لیکن اگر وہ باجماعت نماز میں شرکت کرتی ہے تو وہ الگ صفوں میں کھڑی ہوتی ہے جو صرف خواتین پر مشتمل ہوتی ہیں جس طرح کم عمر بچے بالغ مردوں کے پیچھے الگ صفیں بناتے ہیں۔ یہ اہتمام نظم وضبط کی پابندی کے لیے کیا جاتا ہے نہ کہ اہمیت کی درجہ بندی کے لیے۔ مردوں کی صفوں میں ریاست کا سربراہ ایک کنگال شخص کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہوتا ہے۔ معاشرے کے اعلیٰ ترین طبقوں کے مرد ادنیٰ سے ادنیٰ طبقوں سے تعلق رکھنے والے مردوں کے پہلو میں کھڑے ہوتے ہیں۔ نماز میں صف بندی اس لیے کی جاتی ہے کہ ہر شخص یکسوئی سے عبادت کر سکے۔ یہ بات بہت اہم ہے کیونکہ اسلامی عبادت محض گیت یا موسیقی کی دھن نہیں ہے۔ یہ عبادت افعال، حرکات، قیام، رکوع اور سجود وغیرہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر مرد اور خواتین مخلوط طور پر مشترکہ صفوں میں نماز ادا کریں تو عبادت میں خلل اور انتشار پیدا ہونے کا امکان ہے۔ یوں ذہن نماز سے ہٹ کر غیر متعلقہ سوچوں میں اُلجھ جائے گا اور یکسوئی نہیں رہے گی۔ نتیجۃً نماز کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ علاوہ ازیں آنکھیں بدکاری کے جُرم میں ملوث ہوں گی۔ ممنوعہ چیزوں کو دیکھنے سے آنکھ کے علاوہ قلب بھی بدکاری کی طرف مائل ہو سکتا ہے۔ مزید برآں کسی مسلمان مرد یا عورت کو نماز کے دوران جنسِ مخالف سے تعلق رکھنے والے شخص سے مَس ہونے کی اجازت نہیں۔ اگر نماز میں مرد اور خواتین پہلو بہ پہلو کھڑے ہوں گے تو وہ ایک دوسرے کے لمس سے گریز نہیں کر سکیں گے۔ مزید

برآں جب کوئی عورت کسی مرد کے آگے نماز ادا کر رہی ہوگی تو بہت ممکن ہے کہ رکوع یا سجدے کی مخصوص حرکات کے باعث اُس کے جسم کا کوئی حصہ لباس کے سرک جانے سے برہنہ ہو جائے اور مرد کی نظر اس برہنہ حصے پر جا پڑے جس کے نتیجے میں قدرتی طور پر عورت پریشان ہو جائیگی اور مرد ذہنی انتشار کا شکار ہو جائے گا بلکہ ممکن ہے اُس کے ذہن میں فاسد خیالات در آئیں۔ چنانچہ کسی قسم کی پریشانی یا انتشار کے امکان کو ختم کرنے، سوچ اور پاکیزہ خیالات میں یکسوئی پیدا کرنے، نمازیوں میں ہم آہنگی اور نظم و ضبط برقرار رکھنے اور نماز کے مقاصد کی تکمیل کرنے کے لیے اسلام نے صفوں کو درست اور منظم رکھنے کا حکم دیا ہے جس کے مطابق اگلی صفوں میں مرد، اُن کے پیچھے بچے اور بچوں کے پیچھے خواتین کھڑی ہوتی ہیں۔ کوئی بھی شخص جو اسلامی عبادت کی نوعیت اور مقصد سے آگاہ ہے نمازیوں کی صفوں کو اس طرح منظم کرنے کی حکمت بآسانی سمجھ سکتا ہے۔

۱۲۔ مسلمان عورت کو ہمیشہ ایک قدیم روایت سے وابستہ خیال کیا جاتا ہے اور یہ روایت ہے "حجاب" یا "پردہ"۔ اسلامی طریقے کے مطابق عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو عزت، وقار، عفت، پاکدامنی اور سالمیتِ کردار کے حجاب سے مزین کرے۔ اُسے ان تمام افعال اور حرکات سے اجتناب کرنا چاہیے جن سے اپنے قانونی شوہر کے سوا دوسرے لوگوں کے جذبات کے بھڑکنے کا امکان ہو یا جن سے اُس کا چال چلن مشکوک نظر آتا ہو۔ اُسے تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ اجنبی لوگوں کے سامنے اپنے حسن و جمال کی نمود و نمائش یا جسمانی دلآویزیوں کو بے نقاب نہ کرے۔ جو حجاب یا پردہ اُس کے لیے ضروری ہے وہ ایسا ہونا چاہیے جو اُس کی روح کو کمزوری سے، ذہن کو آزادہ روی سے، آنکھوں کو حریصانہ نظروں سے اور شخصیت کو اخلاقی پستی سے محفوظ رکھے۔ اسلام عورت

کی سالمیّت کو بہت اہمیت دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ اُس کے اخلاقی معیار، بلند ہمتی، کردار اور شخصیت کے تحفظ کی ہر ممکن ضمانت فراہم کرتا ہے۔

(حوالہ کے لیے دیکھیے قرآن کا سورہ ۲۴: آیات ۳۰ تا ۳۱)

۱۳۔ اِن معروضات سے یہ بات واضح ہے کہ اسلام میں عورت کا مقام اس قدر بلند اور اُس کی نسوانی فطرت سے اس قدر حقیقت پسندانہ مطابقت رکھتا ہے جس کی کسی اور نظام یا معاشرے میں نظیر نہیں ملتی۔ اُس کے حقوق و فرائض مرد کے حقوق و فرائض کے مساوی ہیں لیکن اُن کا یکساں یا ایک جیسا ہونا ضروری نہیں۔ اگر کسی ایک پہلو سے وہ کسی ایک چیز سے محروم ہے تو بہت سے دوسرے پہلوؤں سے اس کمی کی تلافی زیادہ چیزوں سے کر دی گئی ہے۔ نسوانی جنس سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اُس کے انسانی مرتبے یا اُس کی آزاد و خود مختار شخصیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا اور اس بنیاد پر اُس کے خلاف تعصب روا رکھنے یا اُس سے ناانصافی کرنے کا کوئی جواز موجود نہیں۔ اسلام اُسے وہ سب کچھ دیتا ہے جس کی اُسے ضرورت ہے۔ اُس کے حقوق اور فرائض میں ایک خوب صورت ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور ان دونوں میں ایک توازن برقرار رکھا گیا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک چیز دوسری چیز سے بھاری نہیں ہے۔ مجموعی لحاظ سے عورت کا مقام اس آیتِ قرآنی میں بڑی وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے۔

"...... عورتوں کے لیے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں، جیسے مردوں کے حقوق اُن پر ہیں۔ البتہ مردوں کو اُن پر ایک درجہ حاصل ہے اور سب پر اللہ غالب اقتدار رکھنے والا اور حکیم و دانا موجود ہے۔"

(قرآن کا سورہ ۲: آیت ۲۲۸)

یہ ایک درجہ جس کا ذکر آیت کریمہ میں ہُوا عورت پر مرد کی حاکمیت یا برتری ظاہر

نہیں کرتا۔ اس کا تعلق مرد کی زائد ذمہ داریوں سے ہے اور (یہ درجہ) اُس کی ان لامحدود ذمہ داریوں کی کسی حد تک تلافی کرتا ہے۔ اس آیت کی تاویل ہمیشہ ایک دوسری آیت کی روشنی میں کی جاتی ہے۔ (حوالے کے لیے دیکھیے قرآن کا سورہ ۴ : آیت ۳۴)[۶]

یہی زائد ذمہ داریاں ہیں جو مرد کو بعض اقتصادی پہلوؤں میں عورت پر ایک درجہ فضیلت دیتی ہیں۔ یہ ایک درجہ فضیلت انسانیت یا کردار کی بنیاد پر نہیں ہے نہ یہ ایک کی دوسرے پر حاکمیت یا ایک کی دوسرے کے ہاتھوں مغلوبیت ظاہر کرتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عنایاتِ فراواں کی تقسیم ہے جس کا اہتمام خود خالقِ کائنات نے اپنی بنائی ہوئی ہر چیز کی فطری ضروریات کے مطابق کیا ہے اور وہی بہتر جانتا ہے کہ کون سی چیز عورت کے لیے اچھی ہے اور کون سی مرد کے لیے۔ اللہ تعالیٰ بجا طور پر ارشاد فرماتا ہے۔

> لوگو، اپنے رب سے ڈرو جس نے تُم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اُسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد عورت دنیا میں پھیلا دیے۔ (سورہ ۴ : آیت ۱)

---

۶ اس حصہ تحریر کا موازنہ باب چہارم کے حصہ "خاندانی زندگی" سے کیجیے۔

قرآن اور اُس کی حکمت

قرآن بنی نوع انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک عظیم ترین عطیہ ہے۔ مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کتاب کا مقصد سابقہ الہامات کی حفاظت کر کے اللہ تعالےٰ کی ابدی صداقت کو بحال کرنا، عالم انسانیت کی راہِ راست کی طرف رہنمائی کرنا، انسانی رُوح کو جِلا بخشنا، انسانی ضمیر کو بیدار کرنا اور انسانی ذہن کو روشن کرنا ہے۔

قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم پر حضرت جبرائیل علیہ السّلام کے ذریعے نازل ہوا۔ اس جیسی کوئی اور کتاب پیش کرنا انسانی تصور سے ماوریٰ ہے۔ حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے معاصرین عربی زبان پر بحدِ کمال دسترس رکھتے تھے۔ انہوں نے قرآن کے مقابلے میں علمی و ادبی شہکار تخلیق کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ سب علمائے زبان و ادب اپنی بہترین مشترکہ مساعی کے باوجود بلحاظِ مواد و اسلوب قرآنی متن سے معمولی حد تک ملتی جُلتی تحریر پیش کرنے میں بھی کامیاب نہ ہو سکے۔ حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی اور آپؐ نے اس بات کو پردۂ اخفا میں نہیں رکھا۔ یہ آپؐ کی بہت بڑی کامیابی تھی کہ آپؐ کا ظہور ناخواندہ لوگوں میں سے ہُوا اور آپؐ خود بھی ناخواندہ یا اُمّی تھے لیکن آپؐ نے تمام انسانوں تک جن میں تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ دونوں قسم کے لوگ شامل تھے اللہ تعالیٰ کا صحیح پیغام پہنچایا۔ یہ قرآن کے کلام اللہ ہونے کے بارے میں پہلی حقیقت ہے۔

اس منفرد کتاب کے بارے میں دوسری حقیقت اس کے مندرجات اور ترتیب

کی مسلمہ ثقاہت ہے۔ یہ ایک ایسی خوبی ہے جو کبھی کسی اور کتاب کو نصیب نہیں ہوئی اور نہ آئندہ ہی اس کا کوئی امکان ہے۔ قرآن کی ثقاہت اس کے متن کے خالص ہونے، اصلی ہونے اور مکمل ہونے کو یقینی بنا دیتی ہے۔ سنجیدہ علماء جن میں مُسلم اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں بغیر کسی شک وشبہ کے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جو قرآن ہم آج پڑھتے ہیں یہ وہی کتاب ہے جو آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، جس کی انہوں نے تعلیم دی، جس کے مطابق آپؐ نے زندگی گزاری اور جو آپؐ نے بنی نوع انسان کو میراث میں دی۔ یہاں ہم اس موضوع پر کچھ کہنا چاہیں گے جس سے قرآن مجید کی بے مثال ثقاہت واضح ہو کر ہمارے سامنے آجائے گی۔

۱۔ قرآن حصوں میں اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں نازل ہوا لیکن یہ کسی نہ کسی قسم کی ترتیبی شکل سے کبھی عاری نہیں رہا۔ قرآن کے نام سے ظاہر ہے کہ یہ شروع ہی سے ایک کتاب تھی (حوالے کے لیے دیکھیے قرآن کا سورہ ۲: آیت ۲، سورہ ۴۱: آیات ۴۱ تا ۴۲) قرآن کی ترتیب وتدوین اور اس کی سورتوں کا بتدریج نزول اللہ تعالیٰ کے منصوبوں اور اُس کی مشیت کے مطابق عمل میں آیا۔ رسول اللہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپؐ کے اصحابؓ مشیتِ الٰہی کے تابع تھے۔ (حوالے کے لیے دیکھیے قرآن کا سورہ ۲۵: آیت ۳۲، سورہ ۷۵: آیت ۱۷)

۲۔ اہلِ عرب اپنے انتہائی لطیف ادبی ذوق کی وجہ سے ممتاز تھے۔ اس ذوقِ لطیف کے سبب وہ اعلیٰ پایہ کے ادب پاروں کو سمجھنے اور اُن سے محظوظ ہونے کی اہلیت رکھتے تھے۔ قرآن اُن کے معیارِ ذوق کے مطابق علم وادب کا ایک شہکار تھا۔ وہ اس کے اثر آفریں لہجے سے بے حد متاثر ہوئے اور اس کے غیر معمولی حُسن میں انہیں بے پناہ کشش محسوس ہوئی۔ انہیں اس کے مطالعہ سے تسکینِ فراواں اور

بے پایاں مسرت حاصل ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے اس کتاب کا بار بار مطالعہ کرنا اور اسے ازبر کرنا شروع کر دیا۔ تمام مسلمان اور بہت سے غیر مسلم افراد اس عظیم کتاب کو ماضی میں بھی سراہتے تھے، اس کا حوالہ دیتے تھے اور اسے دل و جان سے عزیز رکھتے تھے اور اب بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔

۳۔ ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے روزانہ نمازیں اور شب بیداری میں قرآن کا کچھ حصہ پڑھنا فرض ہے۔ مسلمانوں کے لیے قرآن کی تلاوت ایک اعلیٰ درجے کی عبادت اور ہر روز کے معمول کی حیثیت رکھتی ہے۔

۴۔ اہلِ عرب عام طور پر ناخواندہ ہوتے تھے۔ اس لیے انہیں اپنی پسند کی نظمیں اور نثر پارے محفوظ کرنے کے لیے کلیتہً اپنی یادداشت پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ وہ اپنی تیز یادداشت کے سبب دوسروں سے ممتاز تھے اور ان کا ادبی ورثہ ان کی یادداشت میں ہی محفوظ ہوتا تھا۔ ادبی ذوق رکھنے والے تمام لوگ قرآن کو علم و ادب کا ایک لاثانی شہکار خیال کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے غیر معمولی اہتمام کے ساتھ اور ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے جلد از جلد اپنی یادداشت میں محفوظ کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کی۔

۵۔ حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی حیاتِ طیبہ میں وحی کو قلمبند کرنے کے لیے ماہر کاتب موجود تھے جنہیں اس کام کے لیے باقاعدہ تعینات کیا گیا تھا۔ جب بھی آپ پر وحی کی صورت میں کوئی آیت یا سُورت نازل ہوتی تو آپؐ فوراً اپنے کاتبین کو اس کی کتابت کا حکم فرماتے اور اس کام کی خود نگرانی کرتے۔ کاتبین جو کچھ لکھتے اس کی پڑتال کی جاتی اور خود رسولؐ اللہ اس کے درست ہونے کی تصدیق فرماتے۔ ہر لفظ کی صحت کے بارے میں اچھی طرح تسلی کی جاتی اور ہر سُورت یا پیراگراف کو اس کی صحیح ترتیب میں لایا جاتا۔

۶۔ جب نزولِ وحی کا سلسلہ پایۂ تکمیل کو پہنچا اُس وقت مسلمانوں کے پاس قرآن کے بہت سے مکمل نسخے موجود تھے۔ اِن نسخوں کی تلاوت ہوتی تھی، انہیں زبانی یاد کیا جاتا تھا، ان کا بغور مطالعہ کیا جاتا تھا اور روزمرہ کے امور میں ان کا استعمال ہوتا تھا۔ کسی قسم کا اختلاف پیدا ہونے کی صورت میں، خواہ اس اختلاف کا تعلق اس کے متن سے ہوتا یا مفہوم سے یا الفاظ کی ادائیگی سے، ہر اختلافی مسئلہ رسول اللہ کے سامنے لایا جاتا اور آپ بہ نفسِ نفیس مسئلے کا تصفیہ فرما دیتے۔

۷۔ جب رسول اللہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیائے فانی سے رحلت فرمائی تو قرآن پہلے ہی سے بہت سے مسلمانوں کے ذہنوں میں اور متعدد تحریری تختوں پر محفوظ تھا۔ لیکن خلیفۂ اول حضرت ابوبکرؓ اس سے مطمئن نہیں تھے۔ انہیں خدشہ تھا کہ جنگوں کے دوران حفاظ کی شہادت کے نتیجے میں کہیں قرآن سے متعلق کوئی شدید الجھاؤ پیدا نہ ہو جائے۔ پس اس خیال کے پیشِ نظر انہوں نے اعلیٰ سطح کے مقتدرین سے صلاح مشورے کے بعد رسولؐ اللہ کے خاص الخاص کاتبِ وحی حضرت زیدؓ بن ثابت کو یہ فریضہ سونپا کہ وہ قرآن کے ایک معیاری اور مکمل نسخے کی تدوین اس ترتیب سے کریں جس کی اجازت خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی۔ حضرت زیدؓ بن ثابت نے یہ کام رسولؐ اللہ کے اصحابؓ کی نگرانی میں اور اُن کی مدد سے کیا۔ وہ تمام مسلمان جنہیں رسولؐ اللہ کی زبانِ مبارک سے قرآن سننے کی سعادت حاصل ہوئی تھی اور جنہوں نے پورا قرآن اپنے ذہنوں اور سینوں میں حفظ کر رکھا تھا اس موقع پر آگے آئے اور انہوں نے پورے قرآن کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے کے بعد اس کی حتمی منظوری دی۔ یہ کام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد دو سال سے بھی کم مدت میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اُس وقت کاتبین، حفاظ اور رسولؐ اللہ کے دوسرے اصحابؓ کے اذہان میں وحی کا متن

ابھی تازہ تھا۔

۸۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے وصال کے تقریباً پندرہ سال بعد حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں قرآن کے مدوّن نسخے اُن علاقوں میں وسیع پیمانے پر تقسیم کیے گئے جو اسلام کے حلقہ اثر میں آئے تھے۔ ان علاقوں کے باشندوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو براہِ راست دیکھا تھا اور آپؐ کو بولتے ہوئے سُنا تھا۔ یہ لوگ علاقائی اور جغرافیائی عوامل کی بنا پر قرآن کی تلاوت ذرا مختلف لہجے میں کرتے تھے۔ تلاوت کے انداز اور الفاظ کے اتار چڑھاؤ میں فرق کی وجہ سے مسلمانوں میں تنازعات پیدا ہونے لگے۔ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے حضرت عثمانؓ نے فوری کارروائی کی۔ تمام مقتدرین سے باہم صلاح مشورے کے بعد حضرت عثمانؓ نے چار سابق کاتبینِ وحی پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی۔ قرآنِ مجید کے تمام زیرِ استعمال نسخے جمع کیے گئے اور اُن کی جگہ ایک معیاری نسخہ مہیا کیا گیا تاکہ اسے قریش کے لہجے اور اُن کی مقامی زبان میں رائج کیا جا سکے جو خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا اپنا لہجہ اور ان کی اپنی زبان تھی۔ اس زبان کو اپنایا گیا اور اسے معیاری قرار دیا گیا کیونکہ یہ تمام مقامی بولیوں میں بہترین زبان تھی اور اسی میں قرآن نازل ہوا تھا۔ اس طرح قرآن کو دوبارہ اُسی شخص کے لہجے اور زبان کا پابند کیا گیا جس پر یہ نازل ہوا تھا۔ اُس وقت کے بعد سے یہ اُسی معیاری زبان میں رائج ہے اور اس کے الفاظ یا ترتیب بلکہ رموزِ اوقاف تک میں معمولی سی تبدیلی بھی نہیں آئی۔

ان حقائق کی روشنی میں علماء یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ آج قرآن اُسی حالت میں ہمارے درمیان موجود ہے جس حالت میں یہ پہلی بار نازل ہوا تھا اور اُسی حالت میں ہمیشہ برقرار رہے گا۔ اس میں کبھی کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اس میں سے کوئی چیز حذف نہیں کی گئی اور کسی لفظ کو تبدیل نہیں کیا گیا۔ اس کی

تاریخی حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہے۔ اس کی ثقاہت مسلّم ہے اور اس کی مکمل حفاظت ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے۔

قرآن مجید اپنے مآخذ، اپنی صفات اور اپنی وسعت کے لحاظ سے بے مثال حکمت و دانائی کا مرقّع ہے۔ قرآن کی حکمت اس کے مصنّف کی حکمت و دانائی سے ماخوذ ہے اور اس کا مصنّف خود ذاتِ باری کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہ حکمت و دانائی قرآن کی زبردست قوّت کا نتیجہ بھی ہے کیونکہ یہ ایک لاثانی کتاب ہے جو تمام صاحبِ علم حضرات کے لیے ایک چیلنج کا درجہ رکھتی ہے۔ قرآن جس قسم کا حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے، انسانی مسائل کا جو عملی حل پیش کرتا ہے اور انسان کے لیے جو اعلیٰ مقاصد متعین کرتا ہے اُس سے پتہ چلتا ہے کہ قرآنی حکمت ایک خاص نوعیت اور خاص صفات کی حامل ہے۔

حرکی قوت

قرآنی حکمت کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ جامد یا مُسِر نہیں ہے۔ یہ تو ایک طرح کی متحرک حکمت ہے جو ذہن کو انگیخت اور قلب کو جِلا بخشتی ہے۔ اس حکمت میں ایک متحرک قوت پنہاں ہے جس کی تصدیق تاریخی واقعات اور خود قرآن سے ہوتی ہے۔ جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچانے کا بیڑا اُٹھایا تو آپ کے پاس واحد طاقت قرآن کی طاقت اور واحد حکمت قرآن کی حکمت تھی۔ قرآن کی اثر آفرین تحریک بڑی زور دار اور ناقابلِ مزاحمت ہے۔

ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کی اہم ترین شخصیات اور فیصلہ کن دلائل قرآن کی متحرک حکمت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کو روح اور زندگی کہتا ہے اور اسے ایک ایسی روشنی سے تعبیر کرتا ہے

جو اللہ کے بندوں کی صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ (حوالے کے لیے دیکھیے سورہ ۴۲: آیت ۵۲) ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اگر ہم نے یہ قرآن کسی پہاڑ پر بھی اتار دیا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دبا جا رہا ہے اور پھٹا پڑتا ہے۔ یہ مثالیں ہم لوگوں کے سامنے اس سبب بیان کرتے ہیں کہ وہ (اپنی حالت پر) غور کریں۔

(سورہ ۵۹: آیت ۲۱)

اِن الفاظ سے مترشّح ہے کہ قرآن زندگی کو وجود میں لاتا ہے۔ روح کو بیدار کرتا ہے، نورِ ہدایت پھیلاتا ہے اور بظاہر غیر متحرک اشیاء کو حرکت میں لاتا ہے۔ یہ ایک روحانی قوّتِ عمل ہے جس کا ذکر قرآن کرتا ہے۔

قابلِ عمل تعلیمات

قرآن کی ایک اور اہم خصوصیت اس کا قابلِ عمل ہونا ہے۔ یہ اپنے ماننے والوں کو بیکار اور خوش فہمی پر مبنی سوچوں میں مبتلا نہیں کرتا نہ اس کی تعلیمات انسانوں سے ناممکنات کا تقاضا کرتی ہیں۔ قرآن انہیں خوش کن موہوم تصوّرات کی سیر نہیں کراتا نہ انہیں ناقابلِ حصول مستقبل کے سنہرے خواب دکھاتا ہے۔ قرآن انسان کو اُسی مقصد کے لیے قبول کرتا ہے جس کے لیے اُسے بنایا گیا ہے اور اُسے وہی کچھ بننے کی تاکید کرتا ہے جو وہ بن سکتا ہے۔ یہ اُسے بے بس یا ناکارہ قرار نہیں دیتا، اُسے پیدائش سے موت تک قابلِ ملامت نہیں ٹھہراتا۔ اُسے مہد سے لحد تک غریقِ عصیاں نہیں گردانتا بلکہ اُسے شریف النفس، قابلِ عزّت اور باوقار ہستی کے طور پر پیش کرتا ہے۔

قرآنی تعلیمات کے قابلِ عمل ہونے کا ثبوت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور تاریخ کے مختلف ادوار میں مسلمانوں کی مثالوں سے ملتا ہے۔ قرآن کا ایک امتیازی نقطہ

نظریہ ہے کہ اس کی ہدایات انسان کی عام فلاح وبہبود کے لیے ہیں اور ان کی بنیاد اُن امکانات پر رکھی گئی ہے جو انسان کی دسترس میں ہیں۔

اعتدال پسندی

قرآن کی ایک تیسری بڑی خصوصیت اعتدال پسندی یا ہم آہنگی ہے۔ یہ ہم آہنگی اللہ اور انسان کے درمیان، روحانیت اور مادیت کے درمیان، فرد اور معاشرے کے درمیان وعلیٰ ہذالقیاس کائنات کی دوسری تمام اشیاء کے درمیان پائی جاتی ہے۔ قرآن زندگی کے تمام حقائق اور انسان کی تمام ضروریات پر پوری توجہ دیتا ہے اور ایسا طرزِ عمل اختیار کرتا ہے کہ انسان اپنی زندگی کے اعلیٰ مقاصد کا ادراک کرسکے۔ اس اعتدال پسندانہ طرزِ عمل کی وجہ سے قرآن مسلمانوں کو امتِ وسطیٰ کا نام دیتا ہے۔ (حوالے کے لیے دیکھیے قرآن کا سورہ ۲: آیت ۱۴۳) اور اس اعتدال پسندی کے باعث انہیں تمام انسانوں میں بہترین اُمّت قرار دیا گیا ہے کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جو نیکی کا حکم دیتے ہیں، بُرائی کو روکتے ہیں اور اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔

(حوالے کے لیے دیکھیے قرآن کا سورہ ۳: آیت ۱۱۰)

قرآنی حکمت کے روبعمل ہونے کی تین بڑی جہتیں ہیں —— داخلی جہت، خارجی جہت اور آسمانی جہت۔ یہ حکمت داخلی طور پر انسانی قلب کے اندرونی گوشوں میں نفوذ کرجاتی ہے اور ذہن کی اتھاہ گہرائیوں تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ انسان کی اندرونی صلاحیتوں کی صحت مندانہ نشوونما کرتی ہے۔ قرآنی حکمت کا یہ اندرونی نفوذ کسی بھی دوسرے قانونی یا اخلاقی نظام کے اثرات سے مختلف اور کہیں زیادہ گہرا ہوتا ہے کیونکہ قرآن میں جو کچھ کہا گیا ہے اللہ کی طرف سے اور اُس کے نام سے کہا گیا ہے اور تمام معاملات میں اُسی کی طرف رجوع کیا گیا ہے۔

قرآن کا بیرونی یا خارجی عمل زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے اور فرد کے انتہائی ذاتی معاملات سے لے کر پیچیدہ نوع کے بین الاقوامی تعلقات تک کے تمام انسانی امور کے اصولوں کا احاطہ کرتا ہے۔ قرآن اُن مقامات تک بھی پہنچتا ہے جہاں دنیا کے کسی نظامِ قانون یا ضابطہ اخلاق یا مذہبی عقیدے کی دسترس نہیں ہے۔ اس سلسلے میں قرآن سے متعلق قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ انسانی معاملات سے اس طرح نمٹتا ہے کہ ان میں تقدّس کا رنگ اور اخلاق کی چاشنی بھر دیتا ہے۔ ہر کاروباری لین دین میں اللہ کی موجودگی کا احساس ہونے لگتا ہے اور کاروباری فریق اس ذاتِ باری کو تمام معاملات میں اوّلین چشمۂ ہدایت اور منزلِ آخریں تصور کرنے لگتے ہیں۔ یوں قرآن انسان کے لیے روحانی ہدایت، نظامِ قانون، ضابطۂ اخلاقیات اور طرزِ حیات ہے۔

اپنے آسمانی عمل میں قرآن کا نقطۂ ارتکاز اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس کائنات میں ہر چیز جو کبھی پہلے تھی یا اب ہے یا آئندہ ہوگی اُس کا تعلق اسی کی ذات سے جوڑنا اور اُسے اُسی کے حوالے سے دیکھنا ضروری ہے کیونکہ وہ ذاتِ باری کائنات میں ہر جگہ موجود ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کی اس وسیع سلطنت میں صرف ایک امین یا نائب کی حیثیت رکھتا ہے اور اُس کی تخلیق کا واحد مقصد اللہ کی عبادت ہے۔ اس سے ہرگز یہ مطلب نہیں نکلتا کہ انسان عبادت کو عذر بنا کر زندگی کی تگ و دو سے علیحدگی اختیار کرلے یا بے عملی کی راہ اپنا لے۔ اس کے برعکس عبادت کو مقصدِ حیات بنانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کی صفات عالیہ کا مظہر ہے۔ جب قرآن اپنی آسمانی جہت میں اللہ تعالیٰ کو مرکزی نقطہ قرار دیتا ہے تو یہ انسان کے لیے غور و فکر کے نئے آفاق بے نقاب کرتا ہے، اُسے اعلیٰ اخلاق کے بےمثال معیار اپنانے کی ہدایت دیتا ہے اور اُسے سلامتی اور خیر کے ابدی سرچشمے سے روشناس کراتا ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو انسان کی آخری منزل سمجھنا انسانی ذہن اور مذہبی عقائد کے عام رجحانات کے خلاف ایک انقلاب کی حیثیت رکھتا ہے — ایک ایسا انقلاب

جس کا مقصد ذہن کو شکوک و شبہات کی گرد سے پاک کرنا، روح کو گناہوں کے بوجھ سے آزاد کرنا اور ضمیر کو محکومیت کی ذلت سے نجات دلانا ہے۔

قرآنی حکمت اپنی تمام تر جہات میں فیصلہ کن حیثیت کی حامل ہے۔ یہ نہ تو بدنِ انسانی کو لائقِ ملامت ٹھہراتی یا اسے اذیت پہنچاتی ہے نہ روح کو نظر انداز کرتی ہے۔ یہ نہ تو اللہ کو انسانی صفات سے منسوب کرتی ہے نہ انسان کو لائقِ پرستش بناتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے مجموعی منصوبۂ تخلیق میں ہر چیز کو اُس کے اصل مقام پر رکھتی ہے۔ اعمال اور جزا کے درمیان اور وسائل اور مقاصد کے درمیان باہمی تعلق میں توازن و تناسب پیدا کرتی ہے۔ قرآنی حکمت بے اثر نہیں ہے۔ یہ باز پُرس کرتی ہے اور فہم و ادراک رکھنے والے لوگ اس کی باز پُرس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

حکمتِ قرآنی فکر میں راستی، عمل میں تقویٰ، مقصد میں یک جہتی اور نیت میں خیر کی متقاضی ہے۔

یہ اللہ کی کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ یہ ایک ہدایت ہے۔ پرہیزگاروں کے لیے .... (قرآن کا سورہ ۲: آیت ۲)

یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاؤ۔

ضمیمہ دوم

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبیِ آخر الزّماں

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں۔ بہت سے لوگوں نے اس عقیدے کو غلط طور پر سمجھا ہے۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کی وضاحت کر دی جائے۔ اس عقیدے کا کسی طرح سے بھی یہ مطلب نہیں نکلتا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کا دروازہ بند کر دیا ہے اور وہ اپنے کام سے سبکدوش ہو چکا ہے۔ سلسلۂ نبوت کے ختم ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عظیم مذہبی ہستیوں کے ظہور پذیر ہونے یا عظیم روحانی پیشواؤں کے اُبھرنے پر کوئی پابندی عائد کر دی گئی ہے یا تقویٰ کا ارتقائی عمل روک دیا گیا ہے لہٰذا اب کوئی متقی شخص ایک خاص حد سے بڑھ کر تقویٰ اختیار نہیں کر سکتا۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ عرب میں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی کی حیثیت میں منتخب کر کے اپنی آخری رحمت صرف اہلِ عرب کے لیے مخصوص کر دی ہے اور اللہ تعالیٰ کی یہ خاص کرم فرمائی باقی اقوام کا احاطہ نہیں کرتی۔ ہم یہاں یہ وضاحت کرنا چاہیں گے کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص خاندان، زمانے یا نسل کے ساتھ جانب دار نہیں ہے۔ اُس کا بابِ رحمت ہمیشہ سے اور ہر اُس شخص کے لیے وا ہے جو اُس کے کرم کا خواستگار ہے۔ اللہ تعالیٰ انسانوں سے تین طریقوں سے ہمکلام ہوتا ہے۔

۱۔ پہلا طریقہ القا ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی ہدایت متقی لوگوں کے ذہنوں اور دلوں میں اشارات اور خیالات کی شکل میں وارد ہوتی ہے۔

۲۔ دوسرا طریقہ اللہ تعالیٰ کا پردے کے پیچھے سے ہم کلام ہونا ہے۔ اس طریقے کے

مطابق جب ہدایت وصول کرنے کا اہل شخص نیند یا وجد کی حالت میں ہوتا ہے تو اُسے مناظر یا خواب کی شکل میں رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

۳۔ تیسرے طریقے میں اللہ تعالیٰ اپنا پیغام اپنے فرشتے حضرت جبرائیلؑ کی وساطت سے زمین پر اپنے منتخب پیغمبر تک پہنچاتا ہے۔ (حوالے کے لیے دیکھیے قرآن کا سورہ ۴۲ : آیت ۵۱) اللہ تعالیٰ کے ہمکلام ہونے کی یہ آخری شکل سب سے اعلیٰ ہے اور قرآن اسی طریقے سے حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم پر نازل ہوا۔ یہ طریقہ صرف انبیاء کے لیے مخصوص ہے جن میں حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم نبی آخر الزّماں اور خاتم النّبیین تھے۔

لیکن سلسلۂ نبوت کے ختم ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ الہام یا خدا کے ہمکلام ہونے کے باقی دو سلسلے منقطع ہو گئے ہیں بلکہ اب بھی خدا جب اور جس سے چاہے پہلے دو طریقوں کے ذریعے مخاطب ہو سکتا ہے۔ حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کو خاتم النّبیین بنا کر اللہ تعالیٰ نے انسان سے اپنا رابطہ یا دلچسپی ختم نہیں کی اور انسان کو اللہ کی مدد کا خواستگار ہونے سے منع نہیں فرمایا نہ قربِ الٰہی حاصل کرنے کے جذبے میں کوئی رکاوٹ پیدا کی ہے۔ اس کے برعکس حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کو منتہائے نبوت تک پہنچا کر اور قرآن پر تکمیلِ وحی کر کے اللہ تعالیٰ نے اپنے اور انسان کے درمیان رابطے کا ایک مستقل ذریعہ اور ایک ایسا منارۂ نور قائم کر دیا ہے جس سے رشد و ہدایت کی کرنیں تا ابد پھوٹتی رہیں گی۔ اب ہم یہاں بعض اُن خصوصی نکات کا ذکر کریں گے جن سے اس بات کی وضاحت ہو جائے گی کہ حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم اللہ کے آخری نبی کیونکر ہیں۔

۱۔ قرآن غیر مبہم الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو عام انسانوں کی ہدایت کے لیے اللہ کا نبی بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اللہ ہی تمام آسمانوں اور زمین کا مالک ہے (حوالے کے لیے دیکھیے قرآن کا سورہ ۷ : آیت ۱۵۸) قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کو تمام مخلوقات جن میں انسان اور غیر انسان یکساں طور پر

شامل ہیں، کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا (حوالے کے لیے دیکھیے قرآن کا سورہ ۲۱ : آیت ۱۰۷) اور آپ اللہ کے نبی اور تمام انبیا میں نبی آخرالزماں ہیں (قرآن کا سورہ ۳۳ : آیت ۴۰)۔ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اس میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ اللہ کی طرف سے بھیجی گئی سچائی ہے جس کی اطاعت ہر مسلمان پر فرض ہے اور جس پر ہر شخص کو غور کرنا چاہیے۔ حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کا پیغام محض ایک قومی احیاء کا پیغام نہیں تھا نہ یہ نسلی اجارہ داری یا ظلم و تشدّد سے عارضی نجات کا ذریعہ تھا۔ یہ پیغام تاریخی رجحانات میں کوئی اچانک تبدیلی یا مراجعت کا عمل بھی نہیں تھا۔ بلکہ فی الحقیقت آپؐ کا پیغام پوری دنیا کا احیاء، سب کے لیے رحمت، آسمانی ورثہ اور روحانی نجات کا ایک ابدی پیغام تھا اور بےشک اب بھی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے سابقہ پیغامات کا ایک ارتقائی تسلسل ہے اور اس میں تمام سابقہ الہامات خوبصورت توازن و تناسب کے ساتھ سمو دیے گئے ہیں۔ یہ کسی مخصوص زمانے، رنگ، نسل اور علاقائی خدوخال سے ماورا ہے۔ یہ ہر زمانے کے انسان سے مخاطب ہے اور اس میں ہر وہ رہنمائی موجود ہے جس کی انسان کو ضرورت پیش آسکتی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم اللہ کے آخری نبی ہیں کیونکہ قرآن اس کی شہادت دیتا ہے اور آپ کا پیغام صحیح معنوں میں آفاقی اور مکمل ایمان کی اعلیٰ ترین خصوصیات کا حامل ہے۔

۲۔ حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشادِ گرامی ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں۔ ایک مسلمان یا کوئی اور شخص آپؐ کے اس ارشاد کی صداقت پر انگشت نمائی نہیں کر سکتا۔ آپ اپنی زندگی میں ایک نہایت راست باز، دیانت دار اور باحیا انسان کی حیثیت سے مشہور تھے۔ آپ کی دیانت اور صداقت نہ صرف مسلمانوں کی نظروں میں بلکہ آپؐ کے کٹر دشمنوں کے ذہنوں میں ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ آپؐ کے کردار، آپؐ کے روحانی کمال اور آپ کی دنیاوی اصلاحات کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں

ملتی۔ ابھی تک یہ دیکھنا باقی ہے کہ آیا تاریخ حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلم کے ہم پایہ کوئی شخصیت پیدا کر سکے گی۔ آپؐ نے نبی آخر الزماں ہونے کا دعویٰ اس لیے کیا تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی ہوئی سچائی تھی اس لیے نہیں کہ آپؐ کو اپنی ناموری کی خواہش تھی یا اس میں آپؐ کا کوئی ذاتی مفاد پنہاں تھا۔ فتح و نصرت نے آپؐ کو بگاڑا نہیں۔ شاندار کامرانیاں آپؐ کی صفاتِ حمیدہ کو کمزور نہیں کر سکیں اور قوت وطاقت آپؐ کے کردار کو داغدار نہیں بنا سکی۔ آپؐ نہایت دیانت دار، با اصول اور ذاتی مفاد یا شہرت کی تحریص و ترغیب سے ماورا تھے۔ آپؐ کے ارشاداتِ عالیہ حکمت و دانائی اور سچائی کی روشنی سے معمور ہیں۔

حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم تمام انبیاء علیہم السّلام میں واحد نبی ہیں جو اپنی زندگی ہی میں اپنے مشن کی تکمیل اور اپنے کام کو انجام تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے۔ آپؐ کی رحلت سے پہلے قرآن نے اعلان فرما دیا کہ اللہ کا دین پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے، مؤمنین پر اللہ کی نعمتوں کا اتمام اور وحی (قرآن) کی حفاظت کا انتظام کر دیا گیا ہے اور اب یہ ہمیشہ محفوظ رہے گی (دیکھیے قرآن کا سورہ ۵ : آیت ۳، سورہ ۱۰ : آیت ۹)۔ جب آپ نے اس دنیائے خاکی سے پردہ فرمایا اُس وقت دین اسلام مکمل ہو چکا تھا۔ قرآن آپ کی زندگی ہی میں ضبطِ تحریر میں آ چکا تھا اور اس کا مکمل اور اصل متن محفوظ کر لیا گیا تھا۔ ان سب حقائق سے ہم اخذ کر سکتے ہیں کہ اللہ کا دین نظریاتی اور اطلاقی ہر دو لحاظ سے حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی وساطت سے مکمل ہو چکا ہے اور روئے زمین پر اللہ کی مملکت کا قیام عمل میں آ چکا ہے۔ حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مشن، آپؐ کی مثال اور آپ کی شاندار کامیابیوں سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اللہ کی مملکت کا قیام کوئی ناقابلِ حصول منزل یا محض دنیوی زندگی سے ماورا کی بات نہیں ہے بلکہ یہ ہماری اس مادّی دنیا میں بھی ممکن ہے۔ ہم اللہ کی

جس مملکت کا ذکر کر رہے ہیں وہ حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے زمانے میں قائم ہوئی اور پنپی، اور کسی بھی زمانے میں جب بھی مخلص اور صاحب ایمان لوگ آگے آئیں گے ایسی مملکت قائم ہو سکتی ہے اور پنپ سکتی ہے۔ پس اگر کسی شخص پر اتمامِ نبوت ہونا تھا تو یہ شخص حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کے سوا اور کون ہو سکتا تھا اور اگر کسی کتاب پر تکمیلِ وحی ہونی تھی تو یہ قرآن کے سوا اور کون سی کتاب ہو سکتی تھی۔ روئے زمین پر حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مشن کی عملی تکمیل اور آپؐ کی زندگی ہی میں مکمل قرآن کی مصدقہ تحریر کے بعد کسی کے ذہن میں آپؐ کے آخری نبی ہونے کے عقیدے پر شک کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

۴۔ یہ عقیدہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو اپنا آخری نبی بنا کر دنیا میں مبعوث فرمایا حسبِ ذیل حقائق پر مبنی ہے۔

(۱) خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپؐ کے آخری نبی ہونے کی تصدیق قرآن میں کی ہے اور قرآن کا اپنی اصل اور ابتدائی شکل میں محفوظ ہونا ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔

(۲) حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ایک فیصلہ کن، منفرد اور باکمال شخصیت تھے۔

(۳) دینِ اسلام کو ایک آفاقی حیثیت حاصل ہے۔

(۴) قرآنی تعلیمات ہر قسم کے حالات میں، ہر زمانے میں اور ہر شخص کے لیے قابلِ عمل ہیں۔

اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو ہر قسم کی حدوں سے ماورا ہے اور نسل، رنگ، زمانے اور سماجی حیثیت کی تمام رکاوٹیں عبور کر کے لوگوں کی زندگیوں پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسا مذہب ہے جو تمام انسانوں کو مساوات اور اخوّت، آزادی اور وقار، سلامتی اور عزت، ہدایت اور نجات کی ضمانت دیتا ہے۔ یہ اللہ کے دین کی اصل روح اور ایک لحاظ سے اُس کی طرف

سے ایک مدد ہے جو وہ اپنے بندوں کو ابتدائے آفرینش سے دیتا چلا آرہا ہے۔
حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم اور قرآن مذہبی ارتقار کا نقطۂ عروج ہیں تاہم اس کا یہ
مطلب نہیں کہ انسانی تاریخ اپنے اختتام کو پہنچ گئی ہے یا انسان کو اب آسمانی
ہدایت کی ضرورت نہیں رہی۔ اس کے برعکس یہ نقطۂ عروج تو ایک نئے اندازِ فکر
اور ایک نئے دور کا صرف نقطۂ آغاز ہے جس میں انسان کو ہر قسم کی آسمانی ہدایت
اور تمام عملی مثالیں جن کی اُسے ضرورت پیش آسکتی ہے مہیا کر دی گئی ہیں۔ یہ آسمانی
ہدایت قرآن میں موجود ہے جو اللہ تعالیٰ کی وحی پر مشتمل ایک انتہائی ثقہ کتاب ہے جس
میں سرِ مو تبدیلی نہیں آئی اور یہ عملی مثالیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی شخصیت
میں مجتمع ہیں۔ اگر کوئی نیا نبی آنا ہوتا یا نئی الہامی کتاب نازل ہونا ہوتی تو اس سے
نبوّت کی صفت اور قرآن کی سچائی میں کیا اضافہ ہو سکتا تھا۔ اگر اس سے اللہ کے
کلام کی حفاظت یا الہامی صداقت کی نگرانی مقصود ہے تو یہ کام قرآن کے ذریعے
انجام دیا جا چکا ہے اور اگر یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ اللہ کا قانون انسانی تاریخ
میں قابلِ عمل ہے اور روئے زمین پر اسے نافذ کیا جا سکتا ہے تو یہ سب کچھ حضرت
محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے سچ ثابت کر دکھایا ہے اور اگر اس کا مقصد اللہ کی
طرف اور زندگی کے سیدھے راستے کی طرف انسان کی رہنمائی کرنا ہے تو قرآن اور رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے یہ فریضہ نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے دیا ہے۔
اب انسان کو مزید وحی اور نئے نبیوں کی ضرورت نہیں۔ اُسے سب سے زیادہ
ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ اپنے ذہن کو بیدار اور کشادہ کرے اور اپنے
قلب کو جلا بخشے۔ اب اُسے اس بات کی ضرورت ہے کہ جو وحی پہلے ہی اُس
کے پاس پہنچ چکی ہے اس سے استفادہ کرے اور جو وسائل اُس کے پاس موجود
ہیں انہیں بروئے کار لائے اور اسلام نے بنی نوع انسان کے لیے جو لامتناہی خزانہ

سابقہ الہامات کی صداقتوں کو مجتمع کر کے، انہیں محفوظ کر کے اور ان کی تکمیل کر کے فراہم کیا ہے اُس سے اپنا دامن بھر ے۔

۵۔ قرآن مجید میں اللہ کا فرمان ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری نبی ہیں چنانچہ آپ آخری نبی ہی ثابت ہوئے۔ آپ سے پہلے کسی نبی نے اتنا کام سرانجام نہیں دیا جتنا آپؐ نے دیا، اتنا کمال حاصل نہیں کیا جتنا آپؐ نے کیا۔ اپنی اُمت کے لیے اتنی میراث نہیں چھوڑی جتنی آپ نے اپنی امت کے لیے چھوڑی تاہم یہ حکمِ الٰہی کہ آپؐ آخری نبی ہیں ان عظیم تاریخی واقعات کے پیشِ نظر بھی تھا جو بعد میں رونما ہوئے۔ یہ حکم انسان کے لیے اس نوید کا نقیب تھا کہ وہ اب ذہنی بلوغت اور روحانی رفعتوں کے نئے مرحلے میں داخل ہونے والا ہے اور آئندہ اُسے نئے انبیاء اور نئے الہامات کے بغیر ہی کام چلانا ہوگا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے پیشروؤں کی نبوت اور الہامات کی میراثِ کثیر (قرآن مجید) سے خود ہی رہنمائی حاصل کرنا ہوگی۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی متوقع تھی کہ دنیا کی مختلف تہذیبیں، نسلیں اور علاقے ایک دوسرے کے قریب تر ہوتے چلے جائیں گے اور بنی نوع انسان کے لیے ایک ہی آفاقی مذہب کافی ہوگا ـــــ ایسا مذہب جس میں اللہ تعالیٰ کو اُس کا صحیح مقام حاصل ہو اور جس کی مدد سے انسان خود آگاہی حاصل کر سکے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی کی حیثیت میں مبعوث کرنے کا اعلان دراصل اس عظیم کردار کی شہادت دینے کے مترادف بھی تھا جو آنیوالے ایام میں ترقی یافتہ علم اور سنجیدہ نوعیت کی ذہنی کاوشوں نے انسان کو خدا کے قریب لانے میں انجام دینا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اگر انسان اپنے ترقی یافتہ علم اور صائب ذہنی صلاحیتوں کو قرآن کی روحانی اور اخلاقی تعلیمات سے ہم آہنگ کر دے تو وہ اللہ کی موجودگی کو محسوس کرنے اور خود کو قانونِ الٰہی کے تابع کرنے میں کبھی ناکام

نہیں ہو سکتا۔

نبوّت کا تاریخی دور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ ہی اپنے اختتام کو پہنچ گیا تاکہ انسان پر ثابت کیا جا سکے کہ وہ خود اپنی کوشش سے پختگی حاصل کر سکتا ہے تاکہ سائنسی علوم کو اپنی کارگزاری دکھانے اور خدا کی وسیع و عریض کائنات کا مطالعہ کرنے کے لیے سازگار حالات میسر آسکیں اور ذہن کو سوچنے اور ہر شے کی تہ تک پہنچنے کا موقع مل سکے۔

اسلام اپنی فطرت میں کافی حد تک لچکدار اور قابلِ عمل ہے اور یہ کسی بھی قسم کی پیدا ہونے والی صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کی اہلیت رکھتا ہے۔ قرآن اپنی فطرت میں آفاقی ہے، اس کی الہامی حیثیت کو دوام حاصل ہے اور اس میں بنی نوع انسان کے لیے ہدایت و رہنمائی کا یقینی سامان موجود ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام اپنی فطرت میں تمام بنی نوع انسان کے لیے ہے اور اس کے مخاطب دنیا کے تمام لوگ اور تمام نسلیں ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کسی ایک نسل کے رہنما یا کسی ایک قوم کے نجات دہندہ نہیں تھے۔ آپؐ اُس وقت بھی ایک تاریخ ساز انسان اور ہر اُس شخص کے لیے بہترین نمونہ تھے جسے خدا کی تلاش تھی اور اب بھی آپؐ کی وہی حیثیت برقرار ہے۔ آپؐ کی شخصیت میں ہر شخص کے سیکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور موجود ہے اور آپؐ کی زندگی نیکی اور تقویٰ کی شاندار اور قابلِ تقلید مثالوں کا مرقع ہے۔ ہر زمانے کی نسل آپؐ سے رجوع کر کے اپنی ناکام مرادوں کو شادکامیوں میں بدل سکتی ہے۔

ضمیمہ سوم

اسلامی تقویم

اسلامی سنہ کا آغاز عظیم واقعۂ ہجرت سے یا اس دن سے ہوا جب رسول اللہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپؐ کے اصحابؓ نے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی۔ اس واقعہ کو رسولؐ اللہ کی حیاتِ طیبہ کے بعد خلیفۂ دوم حضرت عمر ابن الخطاب کے زمانۂ خلافت میں اسلامی سنہ کا نقطۂ آغاز قرار دیا گیا۔ اس وقت ہجرت کو ۱۴۰۹ سال ہو چکے ہیں۔ (۱۴۰۹ سنہ ہجری)

اسلامی کیلنڈر قمری کیلنڈر ہے اور اس کے مہینوں کا تعین چاند کی مختلف حالتوں کے لحاظ سے کیا گیا ہے۔ ہر سال میں بارہ مہینے ہیں اور ہر مہینہ چاند کی حالت پر موقوف تیس یا انتیس دن کا ہوتا ہے۔ ان مہینوں کے نام یہ ہیں: محرم، صفر، ربیع الاوّل، ربیع الثانی، جمادی الاولیٰ، جمادی الثّانیہ، رجب، شعبان، رمضان، شوال، ذلیقعد اور ذوالحجہ۔

ہر ہفتے میں ایک مخصوص دن ہے جسے یاد رکھنا اور منانا ضروری ہے۔ یہ جمعۃ المبارک ہے اور اس کی اہمیت بوقتِ ظہر اجتماعی صلوٰۃ سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ صلوٰۃ (نمازِ جمعہ) ہر مسلمان کے لیے جو اس میں شریک ہو سکتا ہو فرض قرار دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ چند ایک اور اہم مواقع بھی ہیں جنہیں یاد رکھنا چاہیے اور خصوصی طور پر منانا چاہیے۔

۱۔ یومِ ہجرت جو یکم محرم کی شام کو آتا ہے۔

۲۔ یومِ میلاد النبیؐ جو بارہ ربیع الاوّل کی شام کو منایا جاتا ہے۔